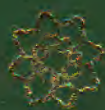


سلسلہ تجدید دین (۲)

تجدید تعلیم و تبلیغ



حضرت مولانا محمد الہادی ندوی

خلیفۃ المسیح

محکم الدلائل و مضبوط الحقائق، محمد اشرف علی صاحبزادہ

رحمۃ اللہ تعالیٰ

المکتبۃ الاشرفیہ
بہار اشرف
نور پور، لاہور

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱	علماء و مشائخ کی ہلک خود فراموشی	۱	دیباچہ
۳۲	غیر مستطیع علماء کے مسئلہ معاش کا قرآنی حل، علماء پر اعتراضات کی تحقیق	۹	مقدمہ
۳۴	علماء کی اخلاقی کمزوریاں علم دین کا اثر نہیں	۱۰	تعلیم کے صحیح معنی
۳۸	زیادہ الزام مغرر طبقہ پر	۱۱	اعلیٰ درجہ کا حیوان و شیطان
۳۹	مولوی مراد عالم با عمل ہے	۱۲	تعلیم یافتہ جانور
۴۰	تعصب و غصہ کا اعتراض	۱۳	جہنم بم
۴۴	باترہی اختلافات کا شبہ	۱۴	تعلیم جدید کا مبلغ پرواز
۴۵	فقہے میں مصلحت زیادہ کا عدم لحاظ	۱۵	اسلام کا تصور انسان
۴۶	گوشہ گیری کا اعتراض	۱۶	چند اشادات
۴۷	تحریر و تقریر میں قصور کا شبہ	۱۸	بس دو باتیں
۴۹	علماء کی وقت و عظمت کی حفاظت	۱۹	مطلوب محدود اور طلب نامحدود
۵۱	علم دین کے حقوق طلباء و علماء پر	۲۰	زہر کا نام تریاق
۵۳	علم دین کے دینی و دنیوی استعمال میں فرق	۲۲	تجدید تعلیم
۵۴	علماء کا امرار سے اختلاط	۲۳	روحانی امراض کے دو بنیادی اسباب
۵۵	علماء کا امرار سے اختلاط	۲۴	علم دین کے دو درجے
۵۶	علماء کا امرار سے اختلاط	۲۵	بقدر واجب علم دین کے حصول کی انسان تدبیر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۸	مختصر نصاب	۵۴	حیلہ شرعی کو حیلہ بنانا
۹۷	مسئلہ معاش	۵۵	علماء کی جاہ طلبی
۱۰۱	بڑی ایمانی خامی	۵۸	امراء سے اخلاط و اجتناب کے شر
۱۰۲	بڑی خود فریبی	۵۹	جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر
۱۰۳	آپ بیتی	۶۰	منابر و مجادلہ کی حقیقت
۱۰۵	گو یا خدا سے کوئی واسطہ نہیں	۶۱	ظنی و قطعی مسائل کے حکم کا بڑا
۱۰۶	مومن کی شان	۶۲	اہم فرق
۱۰۷	پورا خلل دماغ	۶۳	مسائل قطعہ میں اختلاف کی
۱۰۸	الدنیا سجن المؤمن	۶۴	مختلف حالتوں کا حکم
۱۰۹	جیسے کوئی مکہ آخرت ہو	۶۵	مسٹر و ملکی و سیاسی مناظروں کے
۱۱۰	آخرت کی کوئی مصیبت لا علاج نہیں	۶۶	مولویوں کے دینی و مذہبی مناظروں
۱۱۱	حضور کی پسندیدہ زندگی	۶۷	کو بھی مات کر دیا
۱۱۲	فقر صادق	۶۸	مدارس کی اصلاح
۱۱۳	مومن کی معاشی منطق	۶۹	تجدیدی اصلاح
۱۱۴	مومن کی معاشی بے فکری	۷۰	طلبائے دین کی ذلت و حقارت
۱۱۵	تعلیم دین کے ساتھ فکر معاش	۷۱	طلباء کی وضع و لباس
۱۱۶	ایک تنبیہ	۷۲	عطائے سند میں بے احتیاطی و تقالی
۱۱۷	دعوت و افتاء اور تصنیف کے متعلق	۷۳	قواعد کی پابندی میں سستی
۱۱۸	اصلاحات	۷۴	تجوید و اخلاق کی تعلیم سے غفلت
۱۱۹	متفرق اصلاحات	۷۵	اصلاح اعمال و اخلاق

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۸	ساتواں مقدمہ	۱۴۲	اہل دنیا اور علماء کے تعلقات
۱۴۹	آٹھواں مقدمہ	۱۴۳	معلم و متعلم اور شرکائے علم کے باہمی حقوق
۱۵۰	نواں مقدمہ	۱۴۴	حقوق معلم
۱۵۱	دسواں مقدمہ	۱۴۵	خاص طالب علمانہ کوتاہیاں
۱۵۲	جامعہ ملیہ	۱۴۸	متعلم کے حقوق
۱۵۳	ندوہ	۱۴۳	شرکائے علم کے حقوق
۱۵۳	دین کی پرواہ	۱۴۴	ضروری تنبیہات
۱۵۴	اردو کی شرعی حیثیت	۱۴۵	اصلاح تعلیم نسواں
۱۵۹	فارسی کی فضیلت	۱۴۸	مختلف خیالات
۱۶۳	ماننے کے دو درجے	۱۴۹	طبقة اول
۱۶۴	علم کی دو قسمیں	۱۵۰	دوسرا طبقہ
۱۶۴	کون علم میراث انبیاء ہے	۱۵۲	تیسرا طبقہ
۱۶۶	تجدید تبلیغ	۱۵۴	تحقیق تعلیم انگریزی
۱۶۷	حضرت کے مواعظ در اصل	۱۵۵	پہلا مقدمہ
۱۶۸	دعوت و تبلیغ دین ہی کا علمی	۱۵۶	دوسرا مقدمہ
۱۶۹	و علمی ذخیرہ ہیں	۱۵۷	تیسرا مقدمہ
۱۷۰	تبلیغی حکمت کی ایک عجیب مثال	۱۵۸	چوتھا مقدمہ
۱۷۱	بستی نظام الدین کی تبلیغی بنیاد	۱۵۹	پانچواں مقدمہ
۱۷۲	میں حضرت کی شرکت	۱۶۰	چھٹا مقدمہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۶	ایک آیت استنباطات	۱۷۲	کچھ متوجہانہ معروضات
۲۱۹	تبلیغ میں افراط و تفریط کی اصلاح	۱۷۹	دستور العمل
۲۲۱	دینی طلبہ کو خصوصی تنبیہ	۱۸۰	تبلیغ احکام کی ترتیب یہ ہو
۲۲۲	اہل اصلاح کی دوسروں کی {	۱۸۳	تبلیغ کے اس دستور العمل کی {
	اصلاح سے بے فکری		طرزی خصوصیت
۲۲۳	اصول و فروع سب میں تبلیغ {	۱۸۶	تعلیم المسلمین
	قرض ہے	۱۸۷	وعظا و دروا غطوں کا انتظام اصلاح
۲۲۵	علماء و عوام کے فریضہ تبلیغ میں فرق	۱۹۰	مجلس دعوت الحق
۲۲۷	بعض مواقع پر اہل اللہ کے نظام پر {	۱۹۲	نظام العمل
	ترک امر بالمعروف کی وجہ	۱۹۶	دعوت و تبلیغ کی دو قسمیں
۲۲۸	ایک سبق آموز مثال	۲۰۱	دعوت عام و خاص
۲۳۰	بعض دقیق باتیں	۲۰۲	دعوت حقیقی و حکمی
۲۳۲	تبلیغ اعمال بھی ضروری ہے	۲۰۳	دعوت عام
۲۳۳	جن کو سب سے زیادہ ہم پر تبلیغ کرنا {	۲۰۴	داعی کی دو قسمیں
	واجب ہے		اشاعت و حفاظت دین کا {
۲۳۵	ایک عجیب رائے	۲۰۶	کارگر طریقہ
۲۳۸	انقلاب عام و تمام	۲۱۱	تبلیغ سے بے پروائی اور جیلہ جوتی {
	قرآن مجید صرف کتاب ہدایت ہے		کاسب دنیاوی اغراض
۲۱۳	نہیں نظام ہدایت بھی ہے	۲۱۳	حیلوں کی حقیقت
۲۱۵		۲۱۵	۱۔ امر بالمعروف کے بعض حدود {
			وشرائط

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۲	نئی تعلیم والوں کی اصلاح	۲۴۰	فرنگی وبا
۲۶۳	نئی تعلیم تعلیم ہی نہیں	۲۴۱	اصلاح کا خاص تجدیدی پہلو
۲۶۴	زندہ کتابوں کا مطالعہ	۲۴۲	توابع کی اصلاحی ذمہ داری
۲۶۵	بجالات موجودہ ان کی اصلاح	۲۴۳	خلاصہ
۲۶۶	کی مختلف صورتیں	۲۴۵	متحدی اصلاح و تبلیغ
۲۶۹	نظام اصلاح کی روح	۲۴۶	دینی زندگی کے دو کلیدی اصول
۲۷۳	ضمیمہ ایک بڑا فرض کفایہ	۲۴۷	ایک اور عام عارضہ
۲۷۴	دوہری ذمہ داری	۲۴۸	مقصود کام نہیں نام
۲۷۵	اسلام پر شبہات کا ازالہ	۲۴۹	کیف و کم کا فرق
۲۷۶	کفرانہ کعبہ	۲۵۱	اتفاق کا گرہ
۲۷۷	یونانی اور فرنگی شبہات کا فرق	۲۵۲	حق کی تجدید دین کا ماحصل
۲۷۸	ندوہ کا فضل تقدم	۲۵۳	سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات
۲۷۹	لا دینی روگ دینی ادارت میں	۲۵۴	ایک اور تقاضہ
۲۸۰	دوسری باتوں کا انتظام	۲۵۵	اجزائے نظام کا خاکہ
۲۸۱	ما دیا نہ سطحیت	۲۵۶	ایک درگاہ کا قیام
۲۸۲	قدیم معقولات	۲۵۷	نصاب تعلیم
۲۸۳	انگریزی کا لزوم	۲۵۸	کہنی رنگ
۲۸۴	خالص عربی ادب	۲۵۹	مساجدی نظام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

الحمد للہ سلسلہ تجدید دین کی تیسری کتاب بھی کتابی صورت میں پیش ہو رہی ہے اصل میں بھی کتاب ہی تھی، لیکن کتابی صورت میں اشاعت دیر طلب تھی اس لئے بعض اہل علم نے تبلیغی و تعلیمی امور میں اس کی افادیت کو زیادہ محسوس کر کے پہلے مضامین کی صورت میں شائع کر دینے کی رائے دی اچھا ہی ہوا کہ معارف و الفرقان میں دو تین سال قبل مضامینی صورت میں نکل جانے سے بعض رایوں سے استفادہ بلکہ اصلاح کا موقع مل گیا اور اب کتاب لفظی رد و بدل کے علاوہ بہت سی معنوی تبدیلیوں اور معتدبہ اضافوں کے ساتھ شائع ہو رہی ہے پہلی دونوں کتابوں (جامع المجددین، تجدید تصوف) کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کی ظاہری و باطنی کامل و جامع انفرادی اصلاح سے تھا۔ جامع المجددین کا ظاہری سے اور تجدید تصوف کا باطنی سے،

تیسری کا اصل موضوع اجتماعی اصلاح کے تعلیمی و تبلیغی مسائل ہیں سب نمایاں خصوصیات اس کی بھی وہی قابل توجہ ہیں جو حضرت جامع المجددین (مولانا مھتافوی) علیہ الرحمۃ کے سارے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی ہیں۔

(۱) تعلیم و تبلیغ سے متعلق سارے اصول و فروع کی جامعیت و ہمہ گیری اور
(۲) ہر مسئلہ میں پوری حدود شناسی یا افراط و تفریط سے احتیاط، یہی دو خاص امتیازات دین کامل (اسلام) کا خاص کمال ہیں۔

یہ دینِ کامل بہت کچھ اپنی شانِ کمال و اعتدال ہی کی بناء پر جس طرح
ابتدار میں غیروں کے لئے غریبِ اجنبی و بیگانہ تھا آج خود اپنے اسلام
کے اسی دو گونہ امتیاز سے بیگانہ و نا آشنا ہو رہے ہیں۔

اِنَّ الدِّينَ سَلَامٌ بَدَا عَرَبِيًّا
وَسَيَعُوْدُ عَرَبِيًّا كَمَا بَدَا
فَطُوْبِي لِلْعُرَبَاءِ وَهُمْ
الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ
مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِي
مِنْ سُنَّتِي
اسلام کی ابتدار بھی غربت یا اجنبیت
کی صورت میں ہوئی اور آگے چل کر
پھر یہ جلد ہی غریب ہو جائے گا کہ
لوگ اس کو پوری طرح پہچانیں گے نہیں
پس بڑی خود شجری ان غربا یا اجنبیوں
کے لئے ہو، اور یہی وہ لوگ ہیں جو دین
کے ایسے فسادات کی اصلاح کریں گے جو بعد کے لوگوں نے میرے طریقہ میں پیدا
کر دیئے ہوں گے۔

اچھے اچھے اہل علم و اخلاص افراد و ادارات تک کو دیکھا جاتا ہے کہ اسلام
کی ہمہ گیری و جد و دشمنی سے شاذ ہی آشنا و مانوس ہیں۔ انتہا اس بیگانہ
و دشمنی کی ہو گئی کہ معاشیات و سیاسیات کے سرتاسر موجودہ لطیف و حیوانی شعور
و غوغا سے متاثر ہو کر آج ہمارے بڑے بڑے علماء و مفکرین اسلام کے جمال و کمال
کو زیادہ تر معاشی و سیاسی آئینہ میں دیکھ دکھلا کر پہچاننا اور پہچونا چاہتے ہیں
سیاست و معیشت کی لا دینی نہیں دینی اہمیت کے واجبی اعتراف کے ساتھ
ان دونوں کا تعلق انسان کی انسانی یا مقصدگی زندگی سے براہ راست بہر حال
نہیں۔ بلکہ حیوانی و مادی زندگی کے حوائج و وسائل سے ہے۔ ”خوردن برائے زیستن“
ہے نہ کہ ”زیستن برائے خوردن“ سیاست و حکومت کا مطلب بھی اتنا ہی ہے
کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے مادی و معاشی مشاغل کو امن و امان کے ساتھ

انجام دے کر انسان اصل انسانی زندگی کے مقصد و مدعا کی جدوجہد، طلب و تکمیل میں زیادہ سے زیادہ فراغ و اطمینان کے ساتھ مشغول و منہمک رہ سکے۔ لیکن جب انسان اپنی احسن تقویم کے اعلیٰ مقصد و معنویت کی سر بلندی سے گر کر اسفل السافلیں کی پستی میں جا پڑا ہو تو پھر انسان کی انسانی غرض و غایت کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے جس بازار سے کھرے سکوں کا چلن اٹھ گیا ہو ہر مال کی قیمت کھوٹے سکوں سے لگائی جاتی ہو وہاں کھرے کھوٹے کی تمیز گفتوں کو رہ جاتے گی، کھرے اور کامل المعیار دین اسلام کی آج خود اپنوں میں کسا دبا زاری و کس مہر سی یا غربت و اجنبیت کا بڑا سبب یہی ہے اس دین بیزاری اور معاشی و سیاسی شروفساد کے آشوب میں اگر سیاسیات کی راہ سے دین کی طرف کوئی مڑ جائے اور دین کے ابتدائی و بنیادی مطالبات کا کچھ شعور پیدا ہو جائے تو یہ بھی بسا غنیمت معلوم ہوتا ہے جہ جاتیکہ اسلامی شان و حدود شناسی و ہمہ گیری کی خالص و کامل تعلیم کی خالص و کامل جامع تجدید جو جامع المجد دین اور تجدید تصوف و سلوک نام کی کتابوں میں پیش کی جا چکی ہیں ان کی کسی خاص طلب و تمیز کی امید کی جاتی۔

تاہم خود حضرت جامع المجد دین حکیم الامتہ علیہ الرحمۃ جو یہ بڑی حکیمانہ بات فرمایا کرتے تھے کہ اسلام کی شان کمال و جمال میں قدرۃ خود ہی بڑی کشش ہے تو اس میں شک نہیں کہ ان دو کتابوں کے خلیو اسلام کی یہ خاص شان کسی اعتبار سے کم سہی و گوتوقع سے وہ بھی زیادہ ہی رہی (لیکن کفنی اعتبار سے جس طبقہ کے بھی سنجیدہ اور فہمیدہ ہاتھوں تک پہنچی انہوں نے تجدیدات کی جامعیت و ہمہ گیری اور توازن و حدود شناسی کے کمال و جمال کا اعتراف کیا اس اعتراف میں قدیم و جدید لیکن دونوں کے ایسے صاحب فہم و فکر حضرات تک شریک ہیں جن کو حضرت علیہ

الرحمۃ سے کسی نوع کے قرب و اعتقاد کے بجائے بعد اور غلط فہمی ہی زیادہ تھی البتہ طبیعت میں انصاف تھا عبادت تھا ان سب سے مختلف عنوانات سے جن مشترک تاثرات کا زبانی یا تحریری اظہار فرمایا ان کا خلاصہ یہی جامعیت و ہمہ گیری اور توسط و توازن یا حدود شناسی ہے اور ان دونوں کا لازمہ صحیح و کامل فہم دین، یہ تو نظری تاثرات تھے، سب سے قیمتی عملی تاثر خود اپنی اصلاح کا احساس اور اس کی طرف توجہ۔ حضرت مجدد وقت کی کتابیں جس نے بھی دوچار صفحات خصوصاً مواعد و ملفوظات کے جی لگا کر پڑھ لئے راقم سطور کا بلا استثنا تجربہ رہا ہے کہ وہ اس بڑے بیش قیمت عملی تاثر سے محروم نہیں رہتا۔

غرض ہر طرح کے ناموافق حالات و فسادات کو دیکھتے اگر زیادہ ہمت افزائی نہیں ہوتی تو سجدۂ ایسی ہمت شکنی بھی نہیں ہوتی کہ سلسلہ کی مزید خدمت و اشاعت کا رخ ہی نہ رہتا۔

بعض قابل ذکر واقعات و تجربات

۱۔ اتنا غالباً پہلے ہی کہیں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ خدمت بلا کسی خاص سوچے سمجھے ہوئے ارادہ کے اور اس طرح گویا بے ارادہ انجام پذیر ہو رہی ہے حضرت مولانا رسید مناظر احسن، گیلانی مدظلہ العالی نے کئی بار اور بہت خوب تحریروں فرمایا کہ یہ کام تم نے کیا نہیں کرایا گیا ہے۔ خیال کی ابتداریوں ہوتی کہ محب قدیم مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی زادہ اللہ مجدداً نے حضرت کی وفات پر صدق کے لئے کوئی مضمون احقر سے بھی طلب فرمایا، جی میں آیا کہ حضرت کی مجددیت پر کسی نے خاص توجہ نہیں کی اسی کے متعلق چند صفحات پیش کردوں جواب میں یہی عرض کر دیا۔ ایک بڑی طبعی نااہلیت یہ ہے کہ ذمہ داری کے اگر کسی ایک کام میں بھی لگا ہوں تو پھر توجہ طلب کوئی دوسرا کام کیسویں سے مشکل ہی ہو پاتا ہے

اور موقتی یا اجاری رنگ کے مختلف الموضوع اشتات یا متفرقات پر تو کہنا چاہئے کہ سرے سے قدرت ہی نہیں، طبعاً کے علاوہ عقلاً و نقلاً اور خود حضرت علیہ الرحمۃ کے رنگ سے بھی ایسا ہی سبق ملا۔ بہر حال مولانا موصوف کی خدمت میں جواب لکھ کر بات آنی گئی ہو گئی پھر جب عثمانیہ یونیورسٹی کی ذمہ دارانہ خدمت سے سبکدوشی ہوئی تو شاید موصوف ہی نے پھر یاد دلایا۔ یا خود یاد آیا تو ۲۰/۵ صفحے کے ایک مضمون کا ارادہ کر کے شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تجدیدی نظر سے حضرت ج کی کتابیں جو دیکھنا شروع کیں تو معلوم ہوا کہ بے سوچے سمجھے سمندر میں کود پڑا ہوں اسی دوران میں خواب دیکھا کہ ہمارے ندوی حضرت سید (سلیمان) صاحب مدظلہ اور خاکسار حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کیا دیکھا کہ ایک والان میں بہت اونچے بڑے پلنگ، چپرکھٹ پر کوئی بڑا قد آور لیٹا ہے جس پر بڑی صاف شفاف سفید چادر پڑی ہے جیسے جنازہ پر پڑی ہوتی رہے سید صاحب نے گھبرا کر فرمایا کہ حضرت کی وفات ہو گئی خاکسار نے سمجھا اس طرح کے الفاظ میں شدت سے اس کی تردید کی کہ ”نہیں حضرت کی وفات ہرگز نہیں ہوئی“ اس کے بعد ہی اچانک اس چادر کے اندر سے نمایاں حرکت محسوس ہوئی، چپرکھٹ کے محاذ ہی میں ایک دوسرا خالی پلنگ بچھا تھا۔ اس پر بھی بہت سفید چادر لگی تھی ہم دونوں اس پر اس بظاہر جنازہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ آنکھ کھلی تو نہ ہم دو کے سوا کسی کا اور کا ہونا یاد نہ کوئی اور بات ہی یاد۔

تعبیر البتہ بے ساختہ ذہن میں یہ آئی کہ سید صاحب، اشرف الحیات کے نام سے حضرت کی سوانح حیات کا ارادہ بلکہ شاید آغاز فرما چکے تھے جس کا دستور العموماً

۱۔ افسوس کہ اختتام نہ ہوا تجوید تصوف و سلوک میں مقدمہ کے عنوان جو جمعہ شامل ہے وہ دراصل اشرف الحیات ہی کا مہدی حکمڑا ہے۔

ناسوتی حیات کے خاتمہ کے بعد ہی لکھنے کا ہے اور راقم نا اہل حضرت کی دینی تجدید و ایسا کی خدمات پر لکھ رہا تھا جو غیر فانی ہیں۔ والغیب عند اللہ۔

۲۔ ایک اور غیر معمولی تجربہ اس سلسلہ کی خدمت میں عجیب ہوتا رہا اور برابر ہو رہا ہے۔ طالب علمی ختم کر کے جب سے زندگی میں قدم رکھا، حوصلہ و ہمت سے بڑھ چڑھ کر کامیابیاں ہی مقدم رہیں۔ بظاہر کسی عجیب بات ہی ہے کہ جیسا جیسا حضرت کی جو توجہ سے نزدیک ہوتا گیا زندگی کی یہ ظاہری کامیابیاں دور ہی ہوتی چلی گئیں۔ اب تو درست رنگ ہی یہ ہے کہ اکثر جھوٹے سے چھوٹا اور آسان سے آسان کام بھی پہاڑ اور دشوار ہو جاتا ہے۔ نفع کی جگہ ہر معاملہ میں نقصان کا سامنا زیادہ ہوتا ہے، مجبوری و ناچار ہی سے کسی نئے کام کو ہاتھ لگانا یا کسی نئے معاملہ میں پڑنا ہوں

دوسری طرف سلسلہ تجدید کی ان کتابوں کی تحریر و طباعت ادا شاعت میں ایسی تیسیر و تسہیل ہوتی رہی کہ اس سراپا نا کام کا کام ہی نہیں معلوم ہوتی! ۲۰۲۳ سال سے دہرہ ہدم ہے، جائزوں بھر کم و بیش نفس شماری میں کٹتی، لکھنے پڑھنے کا کوئی مسلسل مستقل کام قطعاً نہ ہو پاتا، مرض کی شدت بار بار مریض و معالج، اعزہ و اجاب سب کو مایوسی تک پہنچا دیتی، لیکن ادھر قرینا چار سال جب تک اس سلسلہ کا تحریری کام انجام کو نہیں پہنچ لیا یا دہنیں کہ مرض کا اشتداد یا امتداد ایک دن بھی کام میں مغل ہونے کی حد تک پہنچا ہو۔ اس کے بعد گذشتہ سال ہی پھر مسلسل چار پانچ مہینے فریش و نیم فریش اور موت و حیات کی کشمکش میں رہا۔

۳۔ تحریر کے بعد طباعت کا ہفتخوار سامنے آیا۔ معاملات کے تجربوں نے یوں ہی ہر معاملہ سے خوفزدہ کر رکھا تھا، پھر طباعت و مطبع کے کوچہ سے دوسرے سے نا بلند تھا ہمارے مولانا سید ابوالحسن علی میاں سلمہ، تک جیسے بے نفس سے سنا کہ انہوں نے حج و زیارت کے دوران میں اجابت دعا کے تمام مقامات پر خاص طور سے طباعت و مطبع

کے بعض سابقوں سے پتاہ ماگئی، ایسے بے نفوس کے مقابلہ میں اس مجسمہ نفس و نفسانیت کو تو جو کچھ پیش آجاتا کم تھا۔

لیکن خدا بڑی بڑاے محب محترم مولانا محمد منظور نعمانی سلمہ (مدیر الفرقان) کو کہ انہوں نے اس خدمت کو دین کی ایک ضروری خدمت تصور فرما کر بڑی ٹھہیت کے ساتھ طباعت کے بہت سے مراحل کی بہت کچھ ذمہ داری قبول فرما کر نامی پریس کا مشورہ دیا اور کام اس کے حوالہ کر دیا، نامی پریس کی نیک نامی کے لئے دعا گو ہوں کہ مالک پریس اور کارکنان پریس سب نے شکایت سے زیادہ شکریہ ہی کا موقعہ دیا۔ والا برعند اللہ

۴، اب اشاعت کا مرحلہ آیا تو ہندوستان و پاکستان کے مسائل کی نئی مشکلات کا سامنا، کتابوں کی مانگ تھوڑی بہت جو کچھ وہ بہت زیادہ پاکستان میں، ہندوستان میں برائے نام، خود مولف ناکارہ طباعت ہی کی طرح اشاعت کے معاملات سے قطعاً بے بہرہ، ایسی صورت میں اس کو ”مرے از غیب بروں آید و کاسے بجنڈ“ کی غیبی کاروائی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں جن حضرات سے سابقہ تعلقات کی بنا پر کچھ توقعات ہو سکتی تھیں وہ سب پیچھے ہٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ایسے خالص و مخلص بندہ محب کریم و لطیف پیر عبد اللطیف سلمہ کو پاکستان کے سب سے بڑے مرکز اشاعت لاہور میں کھڑا کر دیا جنہوں نے غریب مولف کی غالباً صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ اب تک انہیں کے ہاتھوں جامع و تجدید دونوں کی سب سے بڑی اشاعت ہوتی ہے، پھر ٹھہیت کا یہ عالم کہ بدیہ کتاب کے صرف ایک ایک نسخے کی طلب و قبول کے آگے اشارۃً و صراحتہً، بواسطہ و بلاواسطہ جس جس ممکن عنوان سے کوئی درخواست کی سب کا ایک ہی جواب تھا کہ اِنْ اَجَزْتِیْ اِلَّا عَلٰی اللّٰہ۔ مہینوں کے مقابلہ کے بعد آخر اس بندہ کثیف ہی کو بندہ لطیف کے سامنے سپردال دینا پڑی۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ”پیر لطیف“ کا یہ لطف دراصل اُسی
پیر خرابات کے ”لطف و اتم“ کا ایک بُرہ ہے جس کی نسبت جامع المجددین کے دیباچہ
میں عرض کیا جا چکا ہے کہ

نبذہ پیر خراباتم کہ لطفش و اتم است
زاکم لطف شیخ و زادہ گاہ ہست و گاہ نیست

اور بالآخر یہ سب محض شیون و مظاہر ہیں شان ربوبیت و رحمت کے مبداء اول
وآخر کے۔ **فالحمد لله رب العالمین الرحمن الرحیم**

سے حضرت مولانا المحترم شاہ محمد حسن صاحب مدظلہم العالی امرتسری ثم لاہوری۔ از اجل
خلفائے حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

اَمْ تَحْسَبُ اَنْ اَكْثَرُهُمْ
يَسْمَعُونَ اَوْ يَعْقِلُونَ
اِنَّهُمْ اِلَّا عَاِلَا نَفَامٍ
بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيلًا

کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ اکثر ہوا پرست
دنیا کے عقل پرست، کچھ سنتے سمجھتے
ایسا واقعا عقل سے کام لیتے ہیں ان
کا حال تو بیس چوریاویں (جانوروں) کا
ہے بلکہ ان سے بھی گیارہ گزراؤ کیونکہ جانور تو بے عقلی کی وجہ سے معذور ہیں

معنی و مقصد ہستی کا سمجھنا معلوم

عقل ہے صرف پرستاری اور ہام ابھی

فرنگی و جل کے اس دور کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اکثر سیاہ کو سفید اور
زنگی کو کافور کا نام دے کر پروپیگنڈے کا ڈھول اس زور سے پٹا گیا ہے کہ اس
کے مقابل دوسری آواز کان پڑی سنائی نہیں دیتی، یہی برعکس نام نہند زنگی
کافور کا معاملہ تعلیم کے ساتھ ہوا ہے کہ یہ لفظ سن کر بے ساختہ ذہن اسی نام نہند
نظام تعلیم کی طرف جاتا ہے جس کا جال کروڑوں، اربوں کے مصارف سے اسکو لو
کالچوں اور یونیورسٹیوں کی سر بفلک عمارتوں کے اند ساری دنیا میں پھیلا دیا گیا
ہے، حتیٰ کہ تعلیم یافتہ سے مراد اب اسی تعلیم کا حامل اسفار ہوتا ہے اس لئے حضرت

مجدد وقت (مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ) کی تعلیمی تجدیدات و اصلاحات کا محل و مقام سمجھنے کے لئے ذرا خود تعلیم کا صحیح مطلب سمجھ لینا مقدم ہے۔

تعلیم کے صحیح معنی

مقلّم کو اس کے مقصد و جہود کی تکمیل و تکمیل کا علم عطا کرنا ہے۔ لیکن تعلیم جدید نے انسان کو اپنے اور کائنات کے وجود و جو علم و تصور عطا کیا ہے وہ یہ کہ سارا کائنات عالم میں ایک خود رو جھگل ہے جس کا کوئی باغبان نہیں، جس نے برگ و بار، اشجار و اثمار کا کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھ کر قصد و ارادہ سے لگایا ہو، اس جھگل میں طرح طرح کے خود رو جانور چرند و پرند بھی بھرے ہیں۔ جن میں سے ایک انسان بھی ہے البتہ وہ سب سے اعلیٰ درجہ کا حیوان HIGHER ANIMAL یا سب سے بڑھیا جانور ہے مگر ہے جانور ہی۔ اور اس جھگل کے دیگر خود رو نباتات و حیوانات کی طرح اس کو بھی کسی دیدہ دانستہ مقصد کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کے حق میں تعلیم کے یہ معنی بالکل بے معنی ہیں کہ وہ نام اُس کے کسی خاص مقصد اور تکمیل مقصد کی علم آموزی کا۔

انسان اور کائنات کے متعلق اس علم و تصور کی منطق کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جھگل کے دوسرے جانوروں کی طرح یہ بھی زندگی کی ساری تنگ و دو اور کشمکش، کھانے پینے، سہنے، سہنے، اور جننے جانے (توالد و تناسل) کی نذر کرے، البتہ چونکہ یہ اعلیٰ درجہ کا جانور ہے اس لئے اس کی بود و ماند کے سامان بھی قدرۃ اعلیٰ درجہ کے ہوں گے۔ جانور اگر بھٹ میں سہتے ہیں تو یہ بنگلہ میں ہے، وہ اگر چڑچک کر کھاتے ہیں تو یہ میز پر کرسی پر کھاتے وہ اگر توالد و تناسل کے وظائف سیدھے سادھے فطری طریقوں سے انجام دیتے ہیں تو یہ ان کو کوک ششتر کا آرٹ بنا ہے،

غرض جب انسان من حیث الانسان کا نہ کوئی جُداگانہ مقصد و مقام ہے نہ ماضی نہ مستقبل، یعنی نہ ماضی کی طرف اس کی آفرینش میں کسی کی مرضی و مشیت یا قصد و ارادہ کو دخل جس کی بناء پر اس کے وجود کا کوئی خاص مقصد و مراد یا مطلب و معنی ہوں نہ مستقبل میں اس کی موجودہ زندگی کا کوئی حساب و کتاب یا جزا و سزا تو اس کے سوا ہر ہی کیا سکتا ہے کہ وہ آغاز و انجام سے یکسر بے پرواہ ہو کر تمام تر اسی سامنے کی مادی و فانی زندگی کے ماکولات و مشروبات، شہوات و رغبات، جاہ و جلال، آرائش و نمائش، کبریائی و سر بلندی کے انفرادی و اجتماعی مقابلہ و مسابقت میں سرتاپا غرق رہے اور اسی کو تعلیم و تہذیب، ترقی و تمدن کا کمال جانے

اعلیٰ درجہ کا حیوان و شیطان

ساتھ ہی چونکہ اعلیٰ درجہ کے جانور (انسان) میں اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت بھی ہے، اس لئے بالآخر اعلیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن جاتا ہے اور اس بے لگام عقل و ذہانت کی بدولت ایک طرف ذہنی، دماغی عیاشیوں کا شکار ہوتا ہے اور دوسری طرف طرح طرح کی ایجادات و اختراعات سے حیوانی و جسمانی راحت و لذت، تعلی و ترفیع کے سامان مہیا کرتا ہے۔ پھر قدرۃ اسی میدان میں افراد و اقوام سب کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے نکل جانے میں بھی اسی اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت سے مطلب برآری کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی مکاریوں اور چالاکیوں سے کام لیتا ہے اور ان کو سیاست و معاشیات وغیرہ کی ظاہر فریب و خوشنما اصلاحات میں تعبیر کر کے زندگی کا نام ہی کا فور نہیں رکھ دیتا بلکہ ایسا مسحور کر دیتا ہے کہ سیاہ واقعہ سفید دکھائی دینے لگتا ہے وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْيُونَ صُنْعًا

تعلیم یافتہ جانور

لاؤ! ایسی بے سرو پا تعلیم، جس کے تصور میں نہ زندگی کا کوئی سرسبز نہ پیر، نہ ماضی نہ مستقبل، نہ مبداء و معاد، وہ قدرۃً محض حیوانی یا مادی زندگی کے غیش و تفوق کے لئے فرد فرد، قوم قوم اور ملک ملک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما کر دیتی اور انسانی بستیوں میں جھگڑ کے قانون کے سوا کوئی قانون کارفرما نہیں رہ جاتا۔

البتہ جھگڑ کے جانور سنگ اور پتھر مارتے، یاد دانت سے نوچتے پھاڑتے ہیں۔ وہ بھی ایک نے بہت سے بہت دو چار کو کھا چبا ڈالا، لیکن یہ اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ جانور اپنی عقل و تعلیم کے زور سے ایٹم بم (اور اس سے بھی لاکھوں درجہ بڑھ کر ہائیڈروجن بم) کے ایک ہی دار میں شہر کے شہر، بوڑھوں بچوں، عورتوں، بیماروں کی تمیز کے بغیر نیست و نابود کر ڈالتا ہے اس شہر بے مہار تعلیم کی بدولت ساری زمین شرفساد سے بھر گئی ہے، جنگوں اور خانہ جنگیوں نے کسی گوشہ میں امن و امان کا نشان نہیں چھوڑا۔ جنگ عظیم اور پھر جنگ عالمگیر کے برپا ہوتے انفرادی و اجتماعی مصائب ابھی ختم نہیں ہوئے بلکہ روز افزوں ہیں کہ تیسری جنگ عالم سوز کے فریق دانت نکال کر نمودار ہو گئے ہیں اور ہاتھ طبل جنگ پر ہے

جہنم بم

امریکہ کے ایک وظیفہ یاب امیر البحر کا مضمون (پانیر سر اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا تھا کہ مختلف قوموں نے دور دراز فاصلوں تک تباہی و بربادی پھیلا دالے ایسے آلات حرب بناتے ہیں جو روئے زمین سے انسانی و حیوانی اور نباتاتی زندگی کا آخری نام و نشان تک مٹا ڈالیں گے، اور یہ ساری برکت انہی بڑے

بڑے نام والے علوم جدیدہ حیاتیات (بیالوجی) جرثومیات (بیکٹریالوجی) موسمیات
کلائماتولوجی وغیرہ کی ہے جن پر عصر جدید کی ترقی و تعلیم کو سب سے زیادہ فخر ہے۔

ہائیڈروجن بم کے متعلق پانیرے ۲۶ فروری ۱۹۵۴ء میں ایک مضمون جنہم بم
کے نام سے نکلا ہے کہ ایٹم بم اگر دس مربع میل پر تباہی نازل کرتا تھا تو ہائیڈروجن
بم ۳، ۴ سو مربع میل کو جنہم بنا دیگا۔ اور ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے مشہور
سائنسدان آئنسٹائن کا بیان ہے کہ

اس کا زہر ساری فضا میں پھیل کر کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑے گا۔

(صدق امر مارچ ۱۹۵۴ء)

خود ہمارے ملک ہندوستان میں اسی تعلیم جدید کی حاصل کردہ آزادی
کی برکات نے چند ہفتے کے اندر ہی کشت و خون کی آزادی کا جو ناقابل بیان
بازار گرم کیا اور جس کی آزادی کا سلسلہ ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
کم و بیش چلا ہی جا رہا ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے سینکڑوں ہزاروں
نہیں لاکھوں انسان، جان و ایمان جاہ و مال، عزت و آبرو، وطن و دیار سے
محروم کئے جا چکے، سفر و حضر میں کہیں امان نہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے
اور کیا کیا دیکھنا پڑے گا۔ اسی کو عارفِ رومی فرماتے ہیں کہ سہ

علم را بر تن زنی مائے بود

علم را بر دل زنی یائے بود

تعلیم جدید کا مبلغ پرواز

اگر کشت و خون، شر و فساد کے اس وبال و نکال تک بفرص محال نوبت
نہ بھی آئے تب بھی تعلیم جدید کا رقص و پنڈلم اپنے بے آغاز و بے انجام تصور

تعلیم کی رو سے قدرۃ صرف نفسانی و حیوانی زندگی کی لذت و مسرت جاہ و مال کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے۔ علم و تعلیم کے اس مبلغ پر دواز کا ایک دلچسپ تجربہ خود حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے نقل فرمایا ہے کسی مقام پر حضرت کی

مد ایک انگریز جنٹ سے اس کی خواہش پر ملاقات ہوتی، دوران گفتگو میں اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے تو آپ کو کتنا روپیہ ملا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا کہ واہ و ابس یہ ہے آپ کا مبلغ پر دواز اور مطمح نظر۔ جب میں نے کہا کہ کچھ نہیں ملا، تو بڑے تعجب سے پوچھا کہ اتنی بڑی کتاب لکھی اور کچھ بھی نہ ملا تو پھر کیا فائدہ اتنی محنت ہی کیوں کی..... خیر میں نے اس کے مذاق کے مطابق اس کو سمجھایا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوتے ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانوں کے اعتقاد میں ایک دوسری زندگی بھی ہے وہاں ایسے کاموں کا اجر ملنے کی ہم کو توقع ہے۔“

یہ تو صاحب کے مبلغ علم کی سمجھ میں کیا آتا۔ البتہ آگے جب حضرت نے فرمایا کہ:-

دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے کہ میں نے یہ تفسیر اپنے بھائی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے لکھی ہے جب اپنے بھائیوں کے ہاتھ میں دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ میری قوم کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کی تھی اس کی نظر میں میری بڑی وقعت ہوئی غرض جو روپیہ پسپا اور جاہ کو مقصود سمجھے گا وہ ضرور ایسے شخص کو کہیگا کہ بڑا بیوقوف ہے کہ بعض دین کے لئے اپنا جاہ و مال سب برباد

کہ دیا۔ (وعظ طریقی القلندر صفحہ ۳۵ و ۳۶)

لاکھوں کروڑوں کے سامانوں اور فلک بوس ایوانوں کے اندر بڑے بڑے
دعووں کے ساتھ آج کل جو تعلیم دی جاتی ہے عموماً بتاتی ہے کہ اس کا مبلغ پرواز
اس فانی و مادی زندگی کے جاہ و مال لذت و مسرت کے سوا کیا ہے، بہت بلند
اڑے تو انفرادی سے آگے اجتماعی یا قومی و ملکی یا نرے زبانی دعووں میں اور بھی
اونچے اڑے تو ساری انسانیت کے لئے انہیں چند روزہ حیوانی منافع و نفسانی لذت
کو مطمح نظر بنالیا۔ جب فرد قوم یا انسان زیادہ سے زیادہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے
اور دیگر حیوانات کی طرح کھاپی کر مر جانے کے سوا اس کا اور کوئی انجام نہیں
تو پھر اس کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی لذات و فوائد فراہم
کرنے سے آگے نظر آخر جا ہی کیسے سکتی ہے خواہ اس کا نتیجہ بالآخر اعلیٰ درجہ کے
حیوان سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن کر خود اس دنیاوی زندگی کی خودکشی
اور اس کے امن و امان بلکہ ساری آبادی کی بربادی کی صورت میں ظاہر ہو۔

اسلامی تصور انسان

سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے تصور میں انسان نہ نر اعلیٰ درجہ کا حیوان
ہے نہ اسلام کا تعلیمی تصور اس کی عارضی و ضمنی حیوانیت کو ترقی دے کر اس کو اعلیٰ
درجہ کا شیطان بنانا چاہتا ہے، انسان، انسان ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد اس
کو انسان کامل بنانا ہے اسلام کی نگاہ میں انسان کی اصلی انسانیت تَفَخُّتٌ
فِیْہِ مِنْ رُّوحٍ (کہ انسان کے اندر میں میں نے اپنی روح چھونکی ہے) والی
الہی روحانیت ہے اس روحانیت کے مطالبات اتنے اعلیٰ و نامحدود ہیں کہ ان
کی سمائی دنیا کی ادنیٰ و محدود زندگی میں ناممکن ہیں وہ اس زندگی کو آغاز و انجام

نا آشنا، یا ماضی و مستقبل سے غیر مربوط یعنی وعبت قرار نہیں دیتا بلکہ اس فانی و محدود کا دامن ایک غیر فانی و غیر محدود ذات و انجام سے بندھا ہوا ہے (وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَأَبْقٰی)۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقٰی، اور دینی تعلیم کا مقصد دنیاوی زندگی کو اسی خیر و ابقی کے نمایان نشان بنانا ہے، نہ کہ انجام و منزل سے آنکھیں بند کر کے خود راستہ ہی کو منزل بنا لینا، اور اس طرح خوردن برائے زلیتن، اور پھر زلیتن برائے خوردن کے چکر میں جان دے دینا، جس کو راقم ہذا اس گھڑی زندگی کے مناسبت گھڑی مثال میں طعام خانہ اور پانخانہ کے درمیان چکر کاٹنے کی زندگی کہا کرتا ہے اور اسی چکر میں جانوروں کی طرح مرجانا۔ اور کبھی یہ سوال تک نہ پیدا ہونا کہ کھانا پینا سب کچھ ہمارے لئے، تو ہم آخر کس لئے؟ دین اور تعلیم دین حاصل اسی کا جواب ہے کہ ہمارا حقیقی مقام و مطلب

اس کائنات میں کیا ہے بالفاظ دیگر تمام علوم و فنون کا موضوع انسان کی اس دنیوی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ کی مادی و حیوانی ضروریات و حاجات کو پورا کرنا ہے اور علم دین کا موضوع (بلکہ دین کی نگاہ میں علم نام ہی اس کا ہے جس کا موضوع) خود اس زندگی کا مقصد و منتهی متعین کرنا ہے اور دینی تعلیم کا مقصد اسی مقصد و منتهی تک پہنچانا ہے۔ اِنَّ لَّكُمْ نِهَآیَۃً فَاَنْتُمْ هُوَ اِلٰی نِهَآیَتِکُمْ ؕ وَ اِلٰی سَآءِلِکَ الْمُنْتَهٰی،

چند اشارات

اصل میں تو یہ گفتگو اور زیادہ تفصیل و تطویل کی طالب ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ مستقلاً اپنے موقع پر ہوگی، یہاں مختصر اہل بصیرت کے لئے چند اشارات عرض ہیں۔

۱۔ انسان اور کائنات کی فطرت و ساخت میں ایک اعتبار سے بڑا تضاد ہے۔ انسان کی الہی یا روحانی فطرت خیر مطلق، بقائے دوام، اور نامحدودیت کی طالب ہے، حتیٰ کہ لباس و طعام، مسکن و قیام کی خالص نفسانی و حیوانی لذات و حاجات تک جن میں دیگر حیوانات اپنی جبلت کی بندھی ہوئی راہ پر کھاتی کہ مر جاتی ہیں ان میں بھی انسان کسی ایک نقطہ پر چین نہیں لیتا نہ کسی نقص و شر کو باقی رہنے دینا چاہتا۔ بلکہ کامل سے کامل تر اور خوب سے خوب تر کی دھن میں لگتا رہتا ہے کہ یہ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھئے مٹھرتی ہے جا کہ نظر کہاں لیکن کائنات کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہاں کی ہر شے محدود فانی اور ہر چیز کے ساتھ شر تو آئے ہے۔ جو خود اس بات کی فطری دلیل ہے کہ انسان کی یہ زندگی کسی اور زندگی کی طالب ہے جہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہئے کہ انسان کی مشیت نامحدود ہو جائے جو یہ چاہے وہ ہو، جو مانگے وہ پائے۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُوْنَ
أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا
مَا تَدْعُوْنَ ۚ

اور تمہارے لئے وہاں ہے جو چاہے جی
تمہارا۔ اور تمہارے لئے وہاں ہے جو کچھ
مانگو۔

اور یہ زندگی اسی نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے نہ کہ خود منزل مقصود، اور راستہ کی کامیابی یہی ہے کہ نظر کسی وقت بھی منزل سے روگرداں نہ ہو، نہ کوئی قدم بے راہ پڑے۔

۲۔ اب اگر انسانوں کا کوئی عقلمند قافلہ منزل کو فراموش کر کے راستہ یا مضاف خانہ ہی کی راحت و لذت کے مقابلہ و مسابقت میں لڑ لڑ کر جہان دیتلے تو

اس کی منزل رسی معلوم راستہ بہر حال راستہ ہے، اس میں منزل کی کامل آسودگی کی فکر حماقت کے سوا کیا ہے اس طرح انسانوں کے مختلف افراد اور قافلے (اقوام) اپنی فطرت کے نامحدود مطالبات کا سدا زور اگر اس دنیا کے جاہ و مال محدود مطالبات و لذات پر لگا دیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بڑی اور کتنوں کی جنگ اور خودکشی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے، خدا کو بھولنے کی سزا ہی یہ ہے کہ خود کو بھول جائیں۔

نَسُوا اللَّهَ فَاَتَسَاءُ هُمْ
اَنْفُسَهُمْ
اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے بھلا دینے
ان کو ان کے جی۔

بس یہ دو باتیں

اگر سمجھ میں آجائیں، تو اسلامی تعلیم کی اس بنیاد کو سمجھ لینے میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اس کا اصلی مقصود مستقبل کی اس خیر و باقی زندگی کی فلاح و کامیابی ہے جو انسان فی فطرت کے اعلیٰ حقیقی مطالبات کی کامل آسودگی کا مظہر ہوگی۔ اور موجودہ زندگی کی حیثیت مقصود کی نہیں بلکہ وسائل کی ہے اور اس سلسلہ کو مقصود بنانا ویسی ہی خود فریبی و نادانی ہے جیسے بخیل آدمی خود مال کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے عزت و راحت سب کچھ بلکہ جان تک گنوا دیتا ہے اور نتیجہ الٹ کہہ یہ ہوتا ہے کہ روپیہ پیسہ جس عزت و راحت کا وسیلہ تھا اسی سے محروم رہتا ہے۔

وَمَنْ يَتُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ
اور جو ہوسپا یا گیا اپنے جی کے لالچ سے،
سو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔
یہی حشر خدا اور آخرت کو فراموش کر کے جاہ و مال پر جان دینے والی تعلیم کا نتیجہ

کے سامنے ہے کہ خود دنیا بھی اس کی بدولت آخر کار جہنم بن کر رہی، افراد و اقوام سب اسی جاہ و مال کی آتش رقابت میں بھسم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور قلب کا آرام و اطمینان یا دل کا سکھ چین نہ حکومت و وزارت کی کمرسیوں پر نصیب، نہ صنعت و تجارت کے کارخانوں اور کوٹھیوں میں، سب کے سینے میں ہلّ مین مَزییدِ مکی بھٹی دھک رہی ہے زندگی تنگ و وبال جان ہو کر رہ گئی وَ مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ اور جس نے میری یاد سے تو اس کو قَاتِلْ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا طے ہے گذران تنگی کی۔

راندہی ہے کہ جب مطلوب قلیل و محدود ہو اور طلب کثرونا محدود، تو اہل طلب میں رقابت و مخالفت ناگزیر ہے، دنیا کا حال یہی ہے کہ یہ اور اس کی ہر شے جاہ و مال، حکومت و تجارت، لذت و راحت، سب ہی انسان کے نامحدود مطالبات کے مقابلہ میں نہایت محدود، اس لئے اگر سارا دوران ہی کی مطلوبیت پر صرف کر دیا جاتے اور تعلیم یہ ہو کہ اس فانی و محدود زندگی کے ان فانی و محدود مطالبات کے سوا نہ آگے کوئی خیر و البقی مطلوب ہے نہ خیر و البقی کی زندگی، بس جو کچھ ہے یہی محدود ناقص دنیا، اور یہی ناقص و فانی زندگی جس کو جو کچھ لینا ہے یہیں لے لے۔ تو یہ جنگ و خانہ جنگی کا علانیہ اعلان و مبارزہ نام نہ نہیں تو اور کیا ہے اور اس راستہ پر چل کر بالآخر اگر ساری زمین قومی و بین الاقوامی کارزار کا میدان بن گئی تو تا سَف جتنا ہو، لیکن تعجب کی کیا بات ہے پھر اندھیرے کا کچھ ٹھکانا ہے کہ اٹھے دین کی تعلیم ہی کو شر و فساد کی جڑ شہو کر دیا گیا، جو اس محدود و فانی دنیا کے محدود و فانی مطالبات و لذات سے انسان کی نظر کو اونچا کر کے اس کی اصلی فکر و عمل کی عنان کو باقی و نامحدود کی طرف موڑ دینا چاہتی ہے کیونکہ خدا و آخرت ہی ایک ایسا غیر فانی و غیر محدود مطلوب ہے

جو ایک طرف انسان کی غیر محدود طلب کی تمام و کمال تشفی و آسودگی کا ضامن ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اس دنیا کے فانی و محدود و حیوانی و مادی مطلوبیات و لذات سے نظر کو اوجھا کر کے جاہ و مال تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کی باہمی عداوت و رقابت اور روز بروز کے فساد و خوریزی سے نجات بخش سکتا ہے اس لئے کہ خدا و آخرت و دنیاوی دولت و حکومت کی طرح کوئی ایسی حقیقت نہیں کہ اگر اس کے ایک حصہ پر کسی ایک کا قبضہ ہو جائے تو دوسرے کے لئے اس سے بھی زیادہ بلکہ زیادہ سے زیادہ کی گنجائش نہ رہے تو پھر لڑائی جھگڑے کی گنجائش کہاں! نہ دین نے دنیاوی حکومت و تجارت و لذت و راہ و مال میں تفوق و برتری کے لئے جنگ و جدال کی اجازت دی ہے بلکہ اس کی جنگ تو صرف انہی لوگوں سے ہے جو انسان کو اس کے اصل مطلوب و مقصود، و خدا و آخرت کی راہ سے روک یا کج راہ کر کے تمام مادی و نفسانی لذات و مطلوبات میں فنا کر کے انسان کے بجائے حیوان بنا دینا چاہتے ہیں

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝

جو روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈتے تھے اس میں کجی اور وہ آخرت سے منکر تھے۔

نہر کا نام تریاق

باقی جو لوگ دین کا نام لے کر دنیا ہی کے مقاصد کے لئے لڑتے مرتے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہ دین کی نگاہ میں خالص دنیا پرستوں سے بھی بڑھ کر مجرم ہیں کہ خدا کی باتوں کو کوڑیوں کے دام فروخت کرتے ہیں۔ يَكْشُرُونَ

بِأَيِّتِ اللَّهِ تَمَتَّنَا فَلَيْلًا) اور اگر کوئی نہ پر کا نام تریاق رکھ کر بیٹا پلانا شروع کرے تو نتیجہ نہ ہر ہی کا برآمد ہوگا تریاق کا کیا قصور؟ دین سچ پوچھتے تو زیادہ تر صرف اپنے دوست نما دشمنوں ہی کے ہاتھوں بدنام ہوا اور ہورہا ہے۔

غرض دیکھا جائے تو ہمارے موجودہ انفرادی و اجتماعی مصائب و مفساد میں سب سے زیادہ حصہ اس موجودہ نظام تعلیم ہی کا ہے جس نے خدا و آخرت کی مطلوبیت و مقصودیت کو عملاً زندگی سے خارج کر کے صرف جاہ و مال حکومت و تجارت اور نفسانی و حیوانی لذت و راحت کو انسان کا مطمح نظر اور مبلغ پر واز بنا دیا ہے مختومیت قلب کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ افراد کی بیدینی و الحاد پسندی سے گزر کر اب حکومتیں اپنا سب سے بڑا دانشمندانہ کارنامہ یہ قرار دیتی ہے کہ اپنے بے دین یا لادینی (سیکولر) ہونے کا فخر یہ اعلان و تبلیغ کرتی رہیں۔

جو اپنے دین کو پہلے ہی کھو چکے ہیں وہ گمراہی میں جتنی دور بھی شکل جائیں چنداں تعجب نہ تھا۔ غم و غصہ تو اپنے حال پر ہے جو زندہ و پابندہ دین کی شاہراہ پر اصرار مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اس کی طرف بلانے کے بجائے خود ان کی آواز میں آواز لانے اور راہبری کا منصب چھوڑ کر گمراہوں کے پیچھے چل پڑے ہیں

فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ط

تجدیدِ تعلیم

اس گم کردہ راہ دنیا کے از سر نو راہ پر آنے کی فقط ایک ہی صورت ہے کہ قدرت کی طرف سے راہنمائی کی مشعل جس امت کے ہاتھ میں دی گئی ہے پہلے وہ خود خدا شناسی و آخرت طلبی کی منہ راہ پر آگے آگے ہو اور اس کی فقط ایک ہی صورت ہے کہ خدا و آخرت طلبی کی تعلیم و تربیت اور ساتھ ہی تبلیغ کا ایسا جامع و محیط نظام اختیار کیا جائے جو امت مبعوثہ کے عوام و خواص زن و مرد پڑھے اور ان پڑھے سب کو حاوی اور محیط ہو،

حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے دین کی تعلیم و تبلیغ دونوں کی ایسی ہی جامع و حاوی تجدید فرمادی ہے کہ اس کے قبول و عمل کے بعد نہ کوئی طبقہ انشاء اللہ محروم رہ سکتا ہے نہ کوئی فرد، لیکن شرات باغبانی کی کسی بہتر سے بہتر خالی کتاب کے پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتے وہ تو اصول و قواعد کے موافق باغ لگانے ہی سے حاصل ہوں گے۔ آگے ان ہی اصول و قواعد کی تفصیل و تجدید ملاحظہ ہو

جامع المجددین میں تعلیم الدین، اصلاح انقلاب اور بہشتی زیور وغیرہ کے مضامین کی تفصیل سے اتنا بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کا بیش بہا جامع و کامل دین کی جامع و کامل اصلاح و تجدید تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت کے ہاتھوں بوجہ اتم اس کو پورا فرما کر امت

پر اتمامِ حجت فرمادیا۔

خود حضرت علیہ الرحمۃ بطورِ تحدیثِ نعمت فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ دین و طریق صدیقیوں کے لئے صاف دے غبار ہو گیا۔ اب بڑا سوال یہ ہے کہ اس تجدید یافتہ کامل و جامع دین کی تعلیم و تبلیغ کا امت کے سارے طبقے، عوام و خواص، ذکور و اناث میں اجراء کیوں ہو، مسلمانوں کے دینی و روحانی امراض کے بنیادی اسباب حضرت علیہ الرحمۃ کی تشخیص کی رو سے وہ ہیں پڑا اور پہلا سبب قلتِ علم، یعنی علوم و احکام دین سے بے خبری ہے ظاہر ہے کہ آدمی اپنے برے پہلے کو اگر جاننے کی طرح جان لے تو جان بوجھ کر اپنے نفع و ضرر سے کون بے پرواہ ہو سکتا ہے، سقراط نے تو اسی تعلیم کی بنا پر تعلیمِ اخلاق کا اصل الاصول یہی قرار دیا تھا کہ ”علم ہی نیکی ہے“ غرض دین کی تعلیم و تبلیغ کے نظام میں بھی ایسی جامع و ہمگیر اصلاح و تجدید کی حاجت تھی کہ اس کے مطابق اگر انتظام کر لیا جائے تو کسی طبقہ اور کسی فرد کے لئے بھی بجز اپنی کوتاہی و کم نصیبی کے محرومی کا کوئی جائز عذر نہ رہ جائے۔

تعلیم و تبلیغ کی ان اصلاحی و تجدیدی صورتوں اور تدبیروں کا کچھ ذکر اصلاح انقلاب پر گفتگو میں گذر چکا ہے اس کے علاوہ ایک مستقل رسالہ حقوق العلم کے نام سے اور کئی غلط آداب تبلیغ اور الدعوة الی اللہ وغیرہ کے نام سے ہے آگے ان پر مختصر گفتگو ہے

علم دین کے دو درجے فرض عین و فرض کفایہ

جس طرح دنیوی تعلیم کے دو معیار یا درجات قرار دیئے جاتے ہیں، ایک

لازم (کمپلیری) جس سے کسی فرد کو مستغنی و مستثنیٰ نہیں سمجھا جاتا، اور دوسرا اس کے اوپر کا درجہ جس میں خاص خاص ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف علوم و فنون داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح دینی تعلیم کی بھی ایک مقدار لازم و واجب ہے جس سے کسی دینی زندگی بسر کرنے والے کا استغناء و استثناء جائز نہیں یعنی مختلف شعبوں کے وہ ضروری شرعی احکام جن سے کم و بیش سب کو سابقہ پڑتا ہے اس کی نسبت ارشاد ہے کہ :-

”علم دین کی دو مقداریں ہیں ایک یہ کہ ضروری عقائد کی تصحیح کی جائے فرض عبادتوں کے ضروری ارکان و شرائط و احکام معلوم ہوں، معاملات و معاشرت میں جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے ان کے ضروری احکام معلوم ہوں، مثلاً نماز کن چیزوں سے فاسد ہو جاتی ہے قصر کتنے سفر میں ہے زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے نکاح کن عورتوں سے حرام ہے رضا عت سے کون کون شے حرام ہو جاتی ہیں اجرت کھڑانے میں کون سی صورتیں جائز ہیں کونسی ناجائز، لباس کونسا حلال ہے کونسا حرام، نوکریاں کونسی جائز ہیں کونسی ناجائز (اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز میں مبتلا ہو مگر ناجائز کو ناجائز ہی سمجھے گا تو دو جرموں کا مرتکب نہ ہوگا ایک تو ناجائز کا ارتکاب دوسرے اس کو جائز سمجھنا) اگر کوئی صاحب حکومت ہے تو اس کو فیصلہ مقدمات کے شرعی قوانین کا علم بھی ہونا چاہئے گوان کے نافذ کرنے پر قادر نہ ہو۔ مگر جاننا اس لئے واجب ہے کہ شرعی فیصلوں کے ناقی اور غیر شرعی کے حق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے“

اس زمانہ میں مسلمان حاکموں کو غیر اسلامی قوانین کے تحت فیصلے کرنا پڑتے ہیں ان کے لئے یہ امر کتنا ضروری ہے کہ کم از کم اپنے اعتقاد ہی کو درست رکھ سکیں تاکہ نَفْعَلُ وَلَسْتَغْفِرُ کے درجے سے تو نہ گر جائیں؛

”ماکولات و مشروبات میں کیا جائز ہے یا ناجائز اسباب تفریح میں کس کا استعمال درست ہے کس کا نادرست، باطنی اخلاق میں محمود و مذموم کا امتیاز، ریا و کبر، ظلم و غضب، حرص و طمع وغیرہ کی حقیقت ادران کے علاج کا جاننا ضروری ہے تاکہ اپنے اندر ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو سکے اور ہونے کی صورت میں ان کے ازالہ کی تدبیر کر سکے اور کوتاہی پر استغفار کرے“

”غرض علم دین کی یہ مقدار عام طور پر ضروری ہے کیونکہ بدون اس کے حق تعالیٰ کی ناراضی اور معصیت میں مبتلا ہونا پڑے گا۔“ وہ مسلمان جو آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اپنے دینی احکام کی مقدار واجب تک سے ان کی لامسکمی کا یہ حال ہے کہ حضرت فرماتے ہیں کہ حقیقی سجانجے کی لڑکی سے نکاح حلال جاننے والا میں نے خود دیکھا، باقی نوکری لباس اور اسباب تفریح میں تو ایسے صاحبوں کے نزدیک کوئی چیز ممنوع ہے ہی نہیں، اور اخلاق میں سبزه تفاخر، مسلمانوں کی تحقیر اور حرص دنیا کے جس کا نیا لقب ترقی ہے اور کچھ سیکھا ہی نہیں،

”دوسری مقدار یہ ہے کہ اپنی ضروریات سے تجاوز کر کے مجموعہ قوم کی ضرورتوں پر لحاظ کر کے نیز دوسری قوموں کے شبہات سے اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے اس پر نظر کر کے ایک ایسا وافی ذخیرہ معلومات و بیانیہ مع اس کے تعلقات و لواحق ادالات

و خود ام علوم کے جمع کیا جائے جو مذکورہ ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔
 پہلی مقدار فرض عین تھی اور یہ دوسری فرض کفایہ ہے، فرض عین
 کا یہ حکم ہے کہ ہر فرد انفرادی طور پر اس کا مکلف ہے جو اس
 میں کوئی ناہی کرے گا گتہنگار ہوگا اور فرض کفایہ کا حکم یہ ہے کہ
 اگر ہر مقام پر ایک ایسی جماعت موجود ہے کہ ان ضرورتوں کو پورا
 کر سکے تو سب مسلمان گناہ سے بچے رہیں گے ورنہ یہ سب مسلمان
 گناہ میں شریک ہوں گے۔“

بقدر واجب علم دین کے حصول کی آسان تدبیر

اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ علم دین کی جس مقدار کا حاصل کرنا ہر
 مسلمان پر فرض عین ہے وہ اتنے کم وقت کی طالب ہے کہ حریص سے حریص طالب
 دنیا کی دنیا طلبی یا آج کل کی نام نہاد ترقی میں کسی درجہ میں بھی مانع و مغل
 نہیں ہو سکتی، راقم احقر تجزیہ کی بنا پر عرض کرتا ہے کہ ساری عمر میں صرف
 دو تین مہینے وہ بھی پورا وقت نہیں صرف دو تین گھنٹے روزانہ جی لگا کر دیدیتے جاتیں
 تو اس فرض عین کی ادائیگی کے لئے بالکل کافی ہیں یعنی دنیاوی علوم کے طالب اور
 ترقی کے خواہاں اگر انہی دس بارہ سال کی طالب علمانہ زندگی میں صرف ایک سال
 کی بڑی تعطیل کے صرف دو تین گھنٹے روزانہ حضرت کی تجاویز کے مطابق حضرت
 ہی کی کتابوں کے ذریعہ علم دین کی طلب میں صرف کر دیں۔ تو آج کل کے نام نہاد
 سندے بھاگنے والے مولویوں کے مقابلہ میں نہ صرف دین کے مسائل و معلومات
 کی حد تک بلکہ انشاء اللہ فہم دین اور تعلق مع اللہ میں بھی کمتر نہیں بزرہی رہیں گے
 ابھی اس تحریر کے دوران میں ایک تازہ تجربہ ہوا ہے کہ ایک طالب صادق

تین مہینے کی نیت سے احقر کے پاس آکر مقیم ہو گئے ہیں صبح دو گھنٹے کے لئے مدرسہ فرقانیہ میں کلام مجید کی تصحیح کے لئے جاتے ہیں تیسرے پہر ایک بچے کو پڑھاتے ہیں باقی وقت احقر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق حضرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور عصر و مغرب کے مابین راقم کے پاس بیٹھ کر اس مطالعہ میں اگر کچھ شبہات رہ جاتے ہیں ان کو صاف کر لیتے ہیں اور اسی سلسلے میں کچھ گفتگو ہو جاتی ہے۔ ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے کہ ایک طرف بھگت پادہٴ علم نصف سے زائد صحت منارج کے ساتھ حفظ کر چکے ہیں جس سے قرأت نماز بقدر واجب صحیح ہو گئی، جو ہمارے سندھی مولویوں میں بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنوں کی ہوتی ہے، دوسری طرف تعلیم الدین، بہشتی زیور اور ہمیشی گوہر کے ضروری حصے ذاتی مطالعہ اور احقر سے رفع شبہات کے ساتھ قریب ختم ہیں، کچھ ملفوظات بھی روزانہ پڑھ لینے کی ہدایت ہے، اس کے بعد چالیس مواعظ، یہ پورا نصاب انشاء اللہ تین مہینہ کے اندر ہی پورا ہو جائے گا۔

اسی دوران میں ضروری مسائل و معلومات کے ساتھ حضرت کی کتابوں خصوصاً ملفوظات کی برکت سے دماغ دین کی فہم، اوّل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا بھی کچھ نہ کچھ لذت آشنا ہو چلا ہے۔

اب دینی تعلیم کے اسکولوں، کالجوں میں پڑھنے پڑھانے والے جو طلبہ و اساتذہ اپنی صرف ایک سال کی ٹھیک تعطیل اور عام مسلمان ساری زندگی میں دو تین مہینے بھی ایک ساتھ یا حسب فرصت متفرق اوقات میں آخرت کی ابدی زندگی و فلاح کے لئے نہیں دے سکتے وہ اپنے ہی گریبان میں سر ڈال کر سوچ لیں کہ ایسی صورت میں کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہنے اور خدا و رسول کو سچا جاننے اور ان پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ تو ایک ضروری جملہ

معتزضہ تھا۔

اصل مطلب یہ ہے کہ جو علم دین فرض عین یا ہر شخص کے لئے فرداً فرداً واجب و لازم ہے اس کے معنی یہ بالکل نہیں کہ ہر شخص کا پورا اور اصطلاحی عالم ہونا لازم ہے کہ دنیوی یا معاشی مشاغل میں غفل کا ذرا بھی اندیشہ و غور ہو البتہ سارے مسلمانوں کے ذمے۔

”یہ انتظام ضروری ہے کہ ایک مقتدر جماعت ایسی بھی ہو جو ہر طرح علوم و دینیہ میں کامل و محقق ہو اور عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل میں اور ساری عمر ان کی خدمت و اشاعت میں صرف کریں جس کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہو، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی جماعت کا ذکر ہے۔“

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ
يَذْكُرُونَ إِلَى الْخَيْرِ
وَيَا مُدْرِفَاتِ الْمَعْرُوفِ
وَيَهْفُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ
تم میں ایک ایسی جماعت کا ہونا لازم ہے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتی، بھلائی کا حکم کرتی اور برائی سے روکتی ہے؛

اور حدیثوں میں اصحاب صفہ کی یہی مثال ہے۔

باقی عام مسلمان اسی جماعت سے تقریراً و تحریراً اپنی دینی ضرورتوں کو رفع کیا کریں، جو بڑھنے کے قابل ہیں جیسے بچے یا جو قدرے معاشی سے فارغ ہیں ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس جماعت سے سبقاً سبقاً کچھ رسائل عقائد و مسائل کے پڑھ لیں۔ پھر نئے پیش آنے والے واقعات کے متعلق وقتاً فوقتاً اس جماعت سے پوچھتے رہیں، اس طرح تھوڑے زمانہ میں بڑا ذخیرہ معلومات کا جمع

ہو جاتا ہے اور جو کسی سبب سے اس طرح نہیں پڑھ سکتے وہ کم از کم ہفتہ میں ایک روز میں گھنٹہ دو گھنٹے نکال کر ایک معین وقت کسی سمجھدار ذی علم سے درخواست کریں کہ ایسے رسائل پڑھ کر سنا اور سمجھا دیا کرے اور ضرورت کے وقت پوچھتے رہنا یہ تمام عوام بلکہ علماء کے لئے بھی (جو بات ان کو نہ معلوم ہو) واجب ہے پھر ان طریقوں سے زبانی یا کتاب کے ذریعہ جب خود احکام پر مطلع ہوئیں تو اپنے اپنے گھر کی مستورات کو پڑھاتے یا سنا تے رہیں۔

دینی علم کی مقدار واجب کے لئے پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری نہیں سماعت و صحبت سے یعنی کتابیں سن سنا کر یا اہل علم کی صحبت و دینی تربیت سے یا سنا فی اس مقدار واجب کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

امراء کی فرض ناشناسی

اصلی سوال اس مذکورۃ بالا جماعت کے انتظام معاش کا ہے جن کے لئے علوم دینیہ میں کامل و مکمل و محقق ہونا ضروری تجویز فرمایا گیا ہے، اور اس لئے عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل میں اور پھر تمام عمر ان کی اشاعت میں اور خدا دین میں صرف کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ساری عمر خدمت دین کی راہ میں نذر کر دینے کے بعد ان کو کسب معاش کا موقعہ کیسے مل سکتا ہے؟ اس مشکل کا قدرتی و صحیح اور ساتھ ہی سب سے مفید و آسان حل تو وہی ہے جس کی طرف ترغیباً و ترہیباً ہر طرح حضرت علیہ الرحمۃ نے کثرت سے جا بجا اپنی کتابوں اور مواظظ وغیرہ سب میں متوجہ فرمایا ہے کہ امراء کا البتہ جو بقدر کفایت معاش کی فکر سے آزاد ہے اس کے ذمہ زیادہ حق تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اس

خدمت کے لئے وقف کرتے، پھر اولاد میں بھی جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم
ہوں گے کہ جو سب سے کوڈن ہو (حقوق العلم ص ۸)

اور جو ہزاروں روپے ہندوستان سے لے کر ولایت تک ان کی دنیوی تعلیم
پر صرف کرتے ہیں، اسی کی آمدنی کسی جامد ادیا کاروبار میں لاکھ ان کی ریاست
و امیرانہ نہ سہی تو متوسط درجہ کی ساری ضرورتوں کو کافی ہو سکتی تھی۔ پھر چونکہ
یہ اولاد آسودہ حال گھرانوں کی ہوتی اس لئے قدرۃً بالعموم ان میں وہ دنائت
و تنگ نظری وغیرہ بھی نہ ہوتی جو غریبوں میں متواتر ہوتی ہے اور جس کا اسخ اثر
علوم و دینیہ کی تعلیم سے بھی بہ مشکل دور ہوتا ہے مگر ظلم یہ ہے کہ امراء خود تو اپنی
اس کوتاہی پر نادام تو نہیں ہوتے کہ جو خدمت دراصل ان کے کرنے کی تھی وہ
بیچاے غریب غرباء کرتے ہیں بلکہ اگر ان غریب گھرانوں کے علماء میں کچھ موردی
اثر سے اخلاق میں خرابیاں رہ جاتی ہیں تو ان کی بناء پر اٹے علماء کی ساری عبادت
پر لعن و طعن کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان خرابیوں کو نہایت جسارت کے ساتھ
نفس دینی و عربی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ بقول حضرت علیہ الرحمہ کے
یہ ہے کہ :-

ان غرباء کو انگریزی تعلیم دی جاتی تو اس سے بھی بدتر حال ہوتا اور
امراء و شرفاء کے بچوں کو اگر دینی تعلیم کے لئے وقف کیا جاتا تو ان
کے اخلاق و عادات اس سے ہزاروں درجہ بہتر ہوتے جو انگریزی
پڑھ کر ہوتے ہیں ۛ

بات یہ ہے کہ ایک تو امراء پر امارت کے باوجود بالعموم دنیا طلبی کا غلبہ
غرباء سے بھی زائد ہے دوسرے علوم دین کی جو وقعت قلب میں ہونی چاہیے
وہ نہیں، اس لئے وہ امراء تک

جو دینی مکتبہ مدارس قائم کرتے ہیں اسلامی و قومی خیر خواہی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مگر اس کام کے لئے اپنی اولاد کو بھی تجویز نہیں کرتے اولاد کے لئے ڈپٹی کلکٹری منصفی، سب ججی و بیروٹری ہی تجویز ہوتی ہے اور مولویت کے لئے جس کو بزعم خود ذلیل کام سمجھتے ہیں ذلیل لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے غور کا مقام ہے کہ جس کام کے لئے غریب منتخب کئے جائیں اس کی وقعت ان کے قلب میں کیا ہوگی اگر یہ کام ضروری و با وقعت ہے اور اس کا اہتمام کرنا قومی و اسلامی خیر خواہی ہے تو اس شرف کے لئے خود اپنی اولاد کو کیوں مہین تجویز فرمایا جاتا۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جو کام معزز طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ عام فطردوں میں بھی معزز و ضروری سمجھا جاتا ہے لہذا امراء کے ذمہ یہ نسبت غریب کے زیادہ تھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس خدمت کے لئے وقف کر دیں پھر اولاد میں بھی جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم ہوں کہ جو سب سے کو دین ہو۔ (منٹ)

علماء و مشائخ کی مہلک خود فراموشی

امراء تو خیر امراء ہی ہیں اب تو بڑے بڑے خاندانی علماء و مشائخ شمس جو نسبہا نسل سے علوم دین کے حامل و خادم چلے آئے ہیں وہ بھی انگریزی دانوں کے مقابلے میں خود اپنے اور اپنے دینی علوم کو عملاً ذلیل و حقیر خیال کرتے اور اولاد کو دھڑا دھڑا سکولوں اور کالجوں میں پہنچاتے چلے جاتے ہیں اور جب امراء و علماء کا یہ حال ہے تو عوام تو بالعموم ان کے پیچھے چلتے ہی ہیں

ان عوام میں بھی خال خال ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا جو دین اور علوم دین کو ضروری اور بادقت جان کر اپنی اولاد کو اس طرف جانے دیتا ہو، ورنہ خود تکلیف اٹھا کر قرض کر کے بھیک مانگ کے یا اولاد ہی سے ٹوشن کر لے کر زیادہ تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ اگر بی، لے، ایم، لے نہیں تو میٹریکولیٹ ہی ہو جائے اس لئے عوام یا متوسط طبقہ کی جو اولاد عربی مدرسوں میں نظر آتی ہے وہ زیادہ تر کسی مجبوری و بیچارگی ہی سے آجاتی ہے۔

غیر مستطیع علماء کے مسئلہ معاش کا قرآنی حل

پھر بھی عربی و دینی درسگاہوں کی جو کچھ آبادی ہے وہ بہت کچھ غریب عوام و متوسط طبقہ ہی کے دم سے ہے اس لئے بڑا سوال ان کی فکر معاش کا ہو سکتا ہے کہ مولوی بن کر اور ساری زندگی علوم دین کی تحصیل و تبلیغ میں لگا کر آخر کھائیں کہاں سے؟

اس کا مفصل جواب حضرت جامع المجددینؒ نے قرآن کی ایک آیت سے دیا ہے جو لفظ بلفظ نقل کرنے کے لائق ہے، آیت یہ ہے

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا	اصل حق ان عاجز مندوں کا ہے جو
فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ	اللہ کی راہ (دین کی کسی خدمت) میں
ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	لگے ہیں جس کی وجہ سے (اپنی معاشی
الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ	یا دنیوی ضرورتوں کے لئے، دوڑو دوڑو
التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ	نہیں کر سکتے ناواقف ان کے سوال
لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا	سے بچنے کے سبب ان کو تو مگر خیال
وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ	کرتے ہیں (پھر بھی) تم ان کو ان کی

فَاتَ اللَّهُ بِهِ عَلَيْهِمْ ۝ ط صورت سے پہچان سکتے ہو کہ یہ حاجتمند ہیں ورنہ یوں (وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے) تو ایسے لوگوں کی خدمت کرنے کو جو مال خرچ کر دے کہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ تم کو اس کا بھرپور اجر و ثواب دیں گے) جس سے ایک قاعدہ مفہوم ہوتا ہے جس سے فقہاء نے بہت سے فروع متفرع کئے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کی منفعت کے لئے مجبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی پر واجب ہے جیسے زوجہ کا نفقہ زوج پر (یہ تو انفرادی وجوب کی صورت ہے دوسری صورت جماعتی وجوب کی ہے) جیسے قاضی و والی کا نفقہ بیت المال پر، جس کا حاصل تمام مسلمانوں پر وجوب ہے (کیونکہ بیت المال کا سرمایہ تمام مسلمانوں کا ہوتا ہے) لہذا جب یہ جماعت خدمت دین کے لئے (جو مدلول ہے فی سبیل اللہ کا) مجبوس و وقف ہے (جو مدلول ہے اُخْصِرُوا کا) تو ان کے حوائج کی بقدر کفایت تکمیل (جو مدلول ہے فقر آؤ کا) مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے (جو مدلول ہے لام استحقاق کا) تو اب اس جماعت کے مصارف کی کفالت جمہور مسلمانوں کا کام ہے خواہ تعین کے ساتھ جیسے مدرسین و واعظین کی تنخواہ خواہ بلا تعین جیسے متوکلین کی خدمت، پس یہ شبہ منقطع ہو گیا کہ مولویوں کی جماعت کھائے کہاں سے۔

اس آیت سے اور بھی چند فوائد نکلتے ہیں جن کو گو اس بحث میں دخل نہیں مگر تعلق ہے اس لئے ذکر کئے جاتے ہیں ! ایک یہ کہ ایسی جماعت کو تحصیل معاش میں بالکل مشغول نہ ہونا چاہئے جیسا کہ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے وہ الزام بھی جاتا رہا جو عوام الناس علماء پر طلب معاش میں اپنا سچ ہونے کا لگاتے

ہیں، بلکہ اس معنی میں ان کا اپنا بیج ہونا ضروری ہے۔ اور اس کاراز یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام پوری طرح ہوا نہیں کرتے خصوص جب ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول رہنے کی ضرورت ہو خواہ ہاتھ کو خواہ زبان کو، خواہ دل کو، خدمت دین ایسا ہی کام ہے اور علوم دینیہ کی تدریس یہ ذرائع معاش میں داخل نہیں۔ بلکہ اس کی تنخواہ بوجہ خدمت دین میں محبوس ہونے کے ہے اور تنخواہ کی تعیین اس مصلحت سے ہوتی ہے کہ نزاع نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو کسی دنیا دار کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرنا چاہئے بلکہ اغنیاء کی طرح مستغنی رہیں جیسے یَحْسِبُهُمُ الْغَنَاءُ اَعْنِيَاءٌ مِنَ التَّحَقُّفِ اس پر دال ہے۔

واقعی ان آیات میں دین اور خادمان دین دونوں کی خدمت کا ایسا سہل و سناستہ اور تمام مفاسد سے پاک و صاف انتظام اور ساری مشکلات کا حل اور سارے شبہات کا جواب موجود ہے کہ اگر دنیا کے معمولی معاملات کے برابر بھی ہمت و اہتمام سے کام لیا جائے تو اپنے پرانے کوئی بھی دین کی تعلیم و تبلیغ سے محروم نہیں رہ سکتے، حالانکہ دین کا حق اور عاقبت اندیشی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی دنیا کے بڑے بڑے کام کے مقابلے میں بدرجہا زائد ہمت و اہتمام سے کام لیا جاتا۔ لیکن جب غفلت اور ناعاقبت اندیشی کا یہ حال ہو کہ دین کے بڑے سے بڑے معاملے کی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کے برابر بھی فکر نہ ہو۔ تو مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی یہی غفلت خسرانِ آخرت نہیں خسرانِ دنیا کا بھی سبب ہے اس لئے کہ ان کی فلا دنیا کا دامن فلاح دین کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ان کو اپنی دنیا کا قیاس غیروں کی دنیا پر ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

علماء پر اعتراضات کی تحقیق

اُس کے کچھ ان سطحی اعتراضات پر گفتگو ہے جو بالعموم مولویوں اور عربی پڑھنے والوں پر دنیا داروں کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولوی ہو کر پست خیالی، کم ہمتی، ذلت پسندی، تنگ نظری، دنائیت، نیز قوتِ انتظامیہ کی کمی، وغیرہ صفاتِ ردِیلہ پیدا ہو جاتی ہیں اور اس لئے اپنی اولاد کے لئے مولویت کو پسند نہیں کرتے۔ ان الزامات میں جتنی واقعیت ہے اس کا اور اس کے واقعی اسباب کا ذکر تو آگے آتا ہے، پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ زیادہ تر ان کی بنیاد برعکس نہند نامِ رنگی کا فوراً ہے کہ لوگ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی دنیا داروں

دنیا میں مالی ترقی نہ کرنے کو پست خیالی اور اس ترقی کی فکر و تدبیر نہ کرنے کو جو قناعت ہے کم ہمتی اور اخلاق میں جاہ و کبر حاصل نہ کرنے کو اور وضع میں سادگی اختیار کرنے کو ذلت پسندی اور اپنے پرانے حقوق کے امتیاز کو تنگ چشمی اور اسراف نہ کرنے کو دنائیت اور دنیوی فضولیات میں اہتمام نہ ہونے کے سبب اپنے بعض مصالح میں فرو گذاشت کو قوتِ انتظامیہ کی کمی کا نام رکھ لیا ہے۔

سوا کثر اہل علم میں ان امور کا ہونا مسلم، مگر یہ ردِ اُہل ہیں یا بخلاف دنیا داروں کے زعم کے فضائل، تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کے لئے قرآن مجید و حدیث کافی ہے۔

قرآن میں ہے کہ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ
الْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَ
الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَ حُسْنِ الْمَآبِ ط
(۳) اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَبِيْلُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ
يَحْسَبُوْنَ اَنْهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ط

(۳) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَحِبُّ كُلَّ مُخْتَارٍ فَخُوْرِهِ
(۴) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ط
(۵) وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمُ بَيْنَكُمْ اِيْلًا بَاطِلًا

(۶) اِنَّ الْمُبَدِّيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ - وغیرہ آیات
اور ان کے علاوہ حدیث کی کثیر روایات میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ صفات
مذکورہ جو اہل علم میں پائے جاتے ہیں آیا رد اہل ہیں یا فضائل، اور معترضین
نے ان کا نام رد اہل رکھ کر ان کے مقابل میں جو فضائل ٹھہراتے ہیں نصوص
میں ان پر وعیدیں وارد ہیں اور شریعت میں ان کے نام یہ ہیں۔ حرص، طول اہل
کبر، عیب، اتلاف حقوق، اسراف و تبذیر، حب دنیا، غفلت من الآخرہ
شریعت سے قطع نظر اخلاقی اعتبار سے بھی حرص وغیرہ کا شمار اخلاق ذمہ
ہی میں ہے اب ان صفات کو بھی سن لیجئے جو علوم دین نہ ہونے سے پیدا ہوتی
ہیں اور اس حالت میں اور زیادہ پیدا ہوتی ہیں جب کہ علوم دین نہ ہونے کے ساتھ
دوسرے علوم باطلہ یا صحبت اہل باطل نے بھی اثر کیا ہو، ان کے عنوانات یہ
ہیں۔

قارونیت، فرعونیت، ظلم و حق، جزبہ، جن کا حاصل بالفاظ دیگر
وہی حرص و طول اہل وغیرہ ہے تو اگر علمائے دین کو سبت خیال ذلیل وغیرہ کہا
جائے تو اس سے زیادہ ضروری ہے کہ مقابل کی جماعت کو فرعون و قارون کہا
جائے۔

اور اگر ان الفاظ کے صحیح معنی لئے جائیں یعنی لپٹ خیالی، یہ کہ فقط اپنی تن پروری و شکم پروری سے مطلب ہو اور دوسروں کو نفع پہنچانے کا خیال نہ ہو، اور کم ہمتی یہ کہ مشقت سے گھبراتے آرام کی فکر میں ہے گو اس سے ضروری حقوق تلف ہونے لگیں، اور ذلت یہ کہ مال کو آبرو پر مقدم رکھے، اور اس کی تحصیل میں غیرت و حیا، کہ طاق پر رکھ دے، اور تنگ چشمی یہ کہ ذرا ذرا چیز میں بخل کرے، شریعت و مروت کو چھوڑے، تعلقات و اجبہ کی پروا نہ کرے اور خانت وہی جو حاصل ہے ذلت و تنگ چشمی کا اور قوت انتظام میر کی کمی یہ کہ اذیت کا پابند نہ ہو، جن ضوابط و آداب معاشرت کے ساتھ دوسرے کے مصالح وابستہ ہوں ان کے خلاف کرے جس سے ان کی مصلحتیں فوت ہوں۔

علماء کی اخلاقی کمزوریاں علم دین کا اثر نہیں ہیں

تو بلاشبہ یہ اخلاق رذیلہ ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ بعض محصلین علم میں یہ رذائل پائے جاتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ علم دین کا خدا نخواستہ اثر ہے یا کسی اور چیز کا۔ اس کا فیصلہ اس طرح نہایت آسان ہے کہ یہ اخلاق رذیلہ سب اہل علم میں پائے جاتے ہیں یا بعض میں پائے جاتے ہیں بعض میں نہیں۔ شوق اولیٰ مشاہدہ سے غلط ہے، اور دوسری شوق سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ یہ علم دین کا اثر نہیں ورنہ سب میں ہوتا۔

تو ضرور یہ کسی دوسری چیز کا اثر ہے جو میری تحقیق میں خاندان و صحبت کی کمی ہے یعنی بعض خاندانی حیثیت سے لپٹ و دنی ہو تے ہیں اب اگر صحبت بھی نصیب نہ ہوگی تو نری تعلیم بھی کافی نہیں، لامحالہ ان میں خاندانی رذائل موجود اور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ لیکن ان کے مقابل میں ان اہل علم کو کیوں

نہیں دیکھتے، جو عالی خاندانی یا فطرۃ سلیم ہیں یا صحبت نے ان کو درست کر دیا ہے۔ اور افسوس ہے کہ اس وقت عالی خاندان لوگوں نے جو کچھ سرتاپا انگریزی کو اڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور عربی کثرت سے ایسے ہی لوگ پڑھتے ہیں جو خاندانی طور پر دینی، دیہات میں رہنے کے سبب سے صحبت و تہذیب سے محروم ہوتے ہیں اور اس میں تبدیل کے اسباب جمع نہیں ہوتے تو لامحالہ بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آئیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین نے پھر بھی ان کو کسی قدر منذب بنا دیا ہے ورنہ اور زیادہ بے تہذیب ہوتے۔ اگر ایسی طبیعت کے لوگ انگریزی پڑھتے تو ان سے بھی زیادہ رد آئل ان میں پاتے جاتے۔

زیادہ الزام معزز طبقہ پر ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس الزام کا زیادہ مورد معزز طبقہ ہے جس کے علم دین سے اعراض کی بدولت ادنیٰ خاندان کے لوگ اہل علم میں زیادہ پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر بقاعدہ لاکٹو حکم انکل سب پر یہی گمان کیا جاتا ہے حالانکہ اگر خاندانی لوگ اپنی اولاد کو علوم دین میں کامل بناتے تو ان میں کثرت سے علما پاتے جاتے اور بوجہ علو خاندان ان میں فضائل طبعیہ زیادہ ہوتے اور رد آئل مفقود ہوتے، تو جب اکثر علما ایسے نظر آتے تو لاکٹو حکم انکل کے قاعدے سے عام طور پر علماء کو فضائل اخلاق کا جائز سمجھا جاتا اور علم دین سے بدگمانی نہ ہوتی، چنانچہ جو علما خاندانی ہیں خصوصاً جن کو اہل طریق کی صحبت میسر ہو گئی ان میں کسی کو لپست خیال، کم ہمت، تنگ چشم دکھاتے۔ گو ساز و سامان ان کے پاس امیرانہ نہ ہو۔ پھر بھی ان کی شان یہ ہے کہ ع

شہباز بے کمر و خسروان بے کلمہ اند
بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مدوں علم دین کے فضائل اخلاق و سیر چسپی و بلند
نظری، عالی دماغی، تہذیب اعتدال افعال، و انتظام اقوال میسر ہونا ممکن
نہیں۔ چنانچہ بے علم امرا میں ان اخلاق کا نام نہیں ہوتا لیکن مال کی بدولت
خوشامدیوں کا اجتماع رہتا ہے اس لئے ان کے عیوب پر پردہ پڑا رہتا ہے

مولوی سے مراد عالم با عمل ہے

سب سے بڑی اور آخری بات یہ ہے کہ مولوی سے مراد عالم با عمل ہے !
جس کا نام چاہے آپ درویش رکھ لیجئے جو ایسا نہیں وہ ہمارے نزدیک مولویوں
میں داخل نہیں، ہم صرف عربی جانتے والے کو مولوی نہیں کہتے، مصرو بیروت
میں بہت سے عیسائی و یہودی عربی دان ہیں۔ (حتیٰ کہ علوم اسلامیہ کے بڑے بڑے
بڑے واقف ہیں مصرو بیروت کے علاوہ خود یورپ میں) تو کیا ہم ان کو مقتدا
دین کہنے لگیں گے؟

یا مثلاً اہل علم کی وضع دیبا س اکثر سادہ کبھی اپنے گھر کا دھلا ہوا، کبھی پیوند
لگا ہوا کبھی بند یا بٹن اکھلا ہوا، دیکھا جاتا ہے اس سے ان پر تذلل کا شبہ
کیا جاتا ہے حالانکہ یہ تو واضع ہے، درنہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا مدار استغناء
اور تذلل کا احتیاج ہے دیبا س وضع کو اس میں دخل نہیں، اگر کپڑے پرانے ہیں
اور ہفت اقلیم کا بھی دست ٹکڑے نہیں تو وہ معزز ہے، اور اگر دیبا س وضع
نوالوں کا سا ہے، ہزاروں روپیہ تنخواہ ہے ہزاروں روپیہ کی جائداد کی آمدنی
ہے سامان امیرانہ ہے مگر نظر اس پر ہے کہ اس مقدمہ میں کچھ اور مل جائے فلاں
معاہلے میں کچھ اور ہاتھ آجائے تو ایسا شخص بالکل ذلیل ہے۔

ہمارے جدید تعلیم کے معززین اگر عزت و ذلت کے اس صحیح معیار کو پیش نظر رکھ کر خود اپنی عزت کا کچھ مشاہدہ فرمائیں تو انشاء اللہ پھر دین کی تعلیم والوں پر ذلت کی نگاہ ڈالنے یا اپنی اس بلند ہستی کے مقابلہ میں ان کو پست بہت کہنے کی ہمت نہ ہوگی۔

پھر اگر عالم دین واقعی عالم دین ہے تو اس کو اپنے دینی و علمی مشاغل نماز روزہ تہجد تلاوت، درس و تدریس، تعلیم و تبلیغ وغیرہ میں اپنا مکمل سہ خود اپنے بناؤ سنگار کی طرف توجہ کیسے ہو سکتی ہے کہ ہر وقت بالوں کی دھج اور تیلوں کی شکن پر نظر رکھ سکے

”یہ شخص تو قومی انجمن کا ڈائریکٹر ہے، ڈائریکٹر کو غسل اور صابون ملنے کی اور کونوں کو جھاڑنے کی فرصت کہاں، اگر فٹ اور سیکنڈ کلاس کے منعم اس پر اعتراض کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم ولایت اسی کی بدولت پہنچے ہیں اور وہاں سے ڈگریاں حاصل کر کے فٹ و سیکنڈ میں سفر کر رہے ہیں، تو نادانی کے سوا کیا ہے“

اور علوم دین پر کیا موقوف، علوم دنیا کے جو سچے اور پکے طالب ہوتے ہیں وہ بھی اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں عورتوں کی طرح بناؤ سنگار کی فرصت نہیں رکھتے

تعصب اور غصہ کا اعتراض

کچھ اس طرح کے اعتراضات بھی غریب مولویوں پر کئے جاتے ہیں کہ یہ کسی سوال کا جواب نہ بن پڑنے پر یا غلبہ تعصب سے غصہ کرنے لگتے ہیں اپنی بات لے جاتے ہیں دوسروں کی سمجھنے کا قصد نہیں کرتے باہم حسد و نفسانیت کا زور اور ایک دوسرے کی مبراہی اور بدگوتی میں لگے رہتے ہیں۔

”اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ انگریزی کے فاضلوں میں یہ اخلاق بدرجہا زیادہ پائے جاتے ہیں ذرا خلاف مزاج بات ہو جائے غصہ سے بیخود ہو جاتے ہیں بات بات میں کبر و سخن پروری کا اظہار ہوتا ہے۔ تہذیب کی کمی کا یہ حال کہ جس کی طرف چاہا پشت کر لی جس کی طرف چاہا پاؤں جوتوں سمیت پھیلا دئے، بزرگوں کا ذرا ادب نہیں ماں باپ تک مساوات، بلکہ تحقیر کا معاملہ، اس سے زیادہ کیا بیچا تھی ہوگی۔ کسی بڑے عہدہ کی طلب میں خواہ تنخواہ نہ ملے محض جاہ کے لئے ان کی حسد و نفسانیت، بلکہ تو تو میں میں دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔“

کالج اور یونیورسٹی تک کی نام نہاد علمی فضا اور ان کی کمیٹیوں وغیرہ کی بحث اور گفتگو اور ان کے آپس کے تعلقات میں حسد و نفسانیت کے جو مناظر چوتھائی صدی سے زیادہ راقم الحروف کے خود ذاتی تجربہ و مشاہدہ میں آتے رہے ان سے نام کا یہ مولوی بھی اکثر شرماتا تھا۔

”بس اتنا فرق ہے کہ اگر اہل علم میں ان اخلاق کا کوئی اثر ہو تو اس کا منشاء اکثر دین ہوتا ہے اور ان اہل ترقی میں ان کا منشاء دینا ہوتی ہے مثلاً مولوی کو دین کی بات پر غصہ آدینکا اور ان حضرات کو دینا کی بات پر، کیونکہ دین کی خود وقعت ہی ان کے دل میں نہیں اس لئے اُن کو جوش نہیں آتا۔ لہذا اپنے کو حلیم اور مولویوں کو تندخو قرار دیا ہے، یہی حال اور اعتراضوں کا بھی ہے یہ تو الزامی جواب تھا اور حقیقی جواب یہ ہے کہ بالکل غلط ہے کہ علماء کو نفس سوال پر غصہ آتا ہے، غصہ اگر آتا ہے تو اس پر کہ سوال ایک تو بطور استفادہ

کے ہوتا ہے اور وہ سوال بھی ضرورت کا ہو، اس پر تو میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی شخص کسی عالم کا ایک جگہ بھی غصہ نہیں ثابت کر سکتا اور ایک سوال بطور تعذرت یا تسخیر و مشغلہ یا محض اعتراض والزام کے لئے ہوتا ہے چونکہ اس میں شریعت کی توہین ہوتی ہے تو جس کے دل میں شریعت کی عظمت نہ ہوگی وہ اس توہین کو کب گوارا کرے گا اسی طرح بعض اوقات یہ وال میں مخاطب کی اہانت ہوتی ہے اس پر بھی ناگوارا ہی ایک طبعی اور سبب جو مذموم نہیں، اسی طرح فضول یا اپنی فہم سے، اور اس سوال کیا اور سمجھانے سے سمجھ میں نہ آیا تو بھی غصہ اچانا ایک طبع سلیم کا مقتضی ہے جو بجائے خود ایک کمال ہے، چنانچہ سید الکماؤد العلماء حضرات پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود بعضے لایعنی سوالوں پر غصہ فرمانا کثیر حدیثوں میں وارد ہے کیا اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرے یا عدالت سے کچھ سوال کرے مثلاً ادنیٰ سی بات ہے کہ درخواست پر جھٹ لگانے کی نسبت پوچھنے لگے کہ ایسا قانون کیوں مرتب کیا یا اس فیس سے نصف فیس کیوں نہ مقرر ہوئی تو کیا توہین عدالت کو جرم اور اس فضول سوال کو ناگوار اور اگر باز نہ آئے تو موجب غصہ نہ کہا جائے گا، کیا اس غصہ کو اخلاقِ مذلیلہ میں داخل کیا جائے گا؟

”کیا مطلق غضب و تشدد کا شمار اخلاقِ مذلیلہ میں ہے، اگر کسی کی عقیقہ ماں کے متعلق کوئی براہ شرارت سوال کرے کہ سنا ہے آپ کی والدہ ایک زمانہ میں چکامہ میں بیٹھا کرتی تھی تو کیا کوئی شخص ٹھنڈے دل سے اس کی تغلیط پر دلائل قائم کرے گا۔ یا اگر ایسا کیا تو شرفاء

اس کو بے غیرت قرار نہ دیں گے، یا اگر وہ غضب و شدت سے کام لے تو عقلاء کے نزدیک غیور و باجمیت نہ ہو گا۔

یا اگر آپ کا سائیس درخواست کرے کہ مجھ کو اقلیدس کی پانچویں شکل اس طرح سمجھا دیجئے کہ نہ اس میں اشکالِ سالبہ کا حوالہ ہو دا اصولِ موضوعہ و متعارفہ کا تو کیا آپ سمجھانے بیٹھ جاتیں گے یا فرمائیں گے کہ بھائی یہ تیری سمجھ سے باہر ہے پھر بھی اگر وہ اصرار کرے تو کیا آپ اس کو گدھا اور اُٹو نہ کہنے لگیں گے۔ اور کیا ایسا کہنے سے کوئی یہ کہیگا کہ آپ کو جواب نہیں آتا؟

ربا تہذیب کا معاملہ اس کی نسبت کیسی دقیق و عمیق حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تہذیب کا معیار صرف مذہب صحیح ہو سکتا ہے، باقی آج کل۔

”تہذیب کا معیار جو یورپ کا رسم و رواج سمجھ لیا گیا ہے تو خود اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل ہے، کیا اہلِ یورپ کی کوئی رسم تہذیب ہے گری ہوتی نہیں، معیار دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں، عقلِ سلیم یا مذہب صحیح، مگر سلیم ہونے کے لئے پھر بھی کسی معیار کی ضرورت ہوگی کیونکہ عقلیں متفاوت ہیں، بس معیار ہونے کی صلاحیت صرف مذہب صحیح میں ہو سکتی ہے، جب تہذیب کا معیار مذہب صحیح اور دین الہی قرار دیا گیا تو خلاف تہذیب کا مصداق خلاف دین ہوا۔ تو اب دیکھ لیجئے کہ دین کے خلاف علماء میں زیادہ افعال پائے جاتے ہیں یا غیر علماء میں اس سے معلوم ہو جائے گا کہ بے تہذیب کون کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔“

باہمی اختلافات کا شبہ

ایک شبہ یہ ہے کہ مولویوں میں اکثر مسئلوں میں اختلاف ہوتا ہے جس سے لوگوں کو عمل کرنے میں سخت حیرت ہوتی ہے کہ کس پر عمل کریں۔ جواب یہ ہے کہ کیا اطباء میں باہم اختلاف تشخیص و تجویز میں نہیں ہوتا؟ اور کیا کوئی شخص اپنے مریض کو بلا علاج ہی چھوڑ دیتا ہے؟ کہ اختلاف کی حالت میں کس کا علاج کریں تو لاؤ سب ہی کو چھوڑ دیں بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون طبیب زیادہ تجربہ کار اور ماہر فن ہے اور کس کے ہاتھ سے مریض زیادہ شفا یاب ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جس امر کو ضروری سمجھتا ہے اس میں ایسے اختلافات سنگ راہ نہیں ہوتے، پھر کیا ہر اختلاف ہر شخص کے لئے مذموم ہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو چاہئے کہ عدالت میں جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو عدالت بجائے اس کے کہ تنقیح و تحقیق کا بار اپنے ذمے لے، محض اس بناء پر کہ یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں۔ اور اختلاف مطلقاً مذموم ہے فریقین کو ہمیشہ سزا دیا کریں کہ ایسے جرم اختلاف کے کیوں مرتکب ہوئے، یا اگر سزا نہ کئے تو کم از کم مقدمہ کو خارج ہی کر دیا جائے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہل اختلافات میں سے ہر ایک کو الزام دینا اور دونوں کو محض اتفاق کا مشورہ دینا عظیم غلطی ہے بلکہ پہلے تحقیق کر کے معلوم کریں کہ کون حق پر اور کون باطل پر ہے جو حق پر ہو اس کی طرف ہو کہ صاحب باطل کو مجبور کریں اور رائے دیں کہ تم کو اختلاف کرنا جائز نہیں۔

فتوے میں مصلحتِ زمانہ کے لحاظ نہ کرنے کا اعتراض

ایک اعتراض یہ ہے کہ علماء اپنے فتاویٰ میں مصلحتِ زمانہ کا لحاظ نہیں کرتے وہی پرانے مسائل بتلاتے چلے جاتے ہیں، زمانہ بدل گیا اب علماء کو چاہئے کہ سود وغیرہ معاملات کو درست قرار دیں۔ اس اعتراض کا باطل بلکہ مبہل ہونا ظاہر ہے اس لئے کہ شریعت کے احکام اگر کسی شر بنائے ہوئے ہوتے تو اس احتمال کی گنجائش تھی کہ اس کی نظر آئندہ مصالح پر نہ تھی، لیکن جب احکام شرعیہ خدا تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں جس قیامت تک کے مصالح کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مخفی نہیں تو یہ احتمال ہی کب ہے کہ ان میں آئندہ مصالح کی رعایت نہیں بلکہ جس مصلحت کی اس میں رعایت نہیں وہ مصلحت ہی نہیں

یہ ہے اجتہادی احکام تو اجتہاد بھی مجتہد یا علماء اپنے دل سے نہیں کرتے وہ بھی کتاب و سنت پر ہی مبنی اور اس سے مستنبط ہوتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قیاس مثبت نہیں مظہر ہوتا ہے یعنی وہ خود کسی بات کو اپنی طرف سے ثابت نہیں کرتا بلکہ جو کچھ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اسی کو ظاہر کر دیتا ہے اور پھر قیاس بھی کیسے مجتہدین کا جن کا علم و فہم، تقویٰ و تدین ایسا غیر معمولی تھا کہ کم از کم ہمارے مقابلہ میں ان سے خطا و لغزش کا بہت کم احتمال ہے پھر اس خطائے اجتہادی پر مواخذہ نہیں بلکہ اجر ہے اس لئے کہ اگر اجتہاد کے شرائط کسی میں موجود ہیں اور اس نے ہر طرح تحقیق کا حق ادا کیا تو ماہر ہوگا اور اگر اندراہ بشریت اس حق کے ادا کرنے پر بھی خطا کی تو معذور ہے۔

گوشہ گیری کا اعتراض

ایک اعتراض مولویوں پر یہ ہے کہ یہ اپنے گھروں مسجدوں اور مدرسوں میں بیٹھے بستے ہیں قوم کی تباہی پر رحم نہیں آتا کہ گھروں سے نکل کر گمراہوں کی دستگیری کریں لوگ بگڑنے چلے جاتے ہیں کوئی اسلام چھوڑ رہا ہے کوئی احکام سے بغیر ہے۔

تو اولاً تو مختلف ذرائع سے اسلام و احکام کی اتنی اشاعت ہو چکی ہے کہ اب تبلیغ کے وجوب کا درجہ باقی نہیں رہا۔ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے اگر اس کو اپنے اسلام اور دین کی کچھ بھی قدر اور پرواہ ہو تو طرح طرح کی واہیات اور خرافات کتابیں، اجازات و رسائل وغیرہ تک پڑھنے سننے میں وقت صرف کرتا اور لڑائی بھڑائی میں دینا بھر کی واہی تباہی خبریں معلوم کرنے میں لگا رہتا ہے تو کیا دین کی کنایاں اور رسالے نہیں پڑھا اور سن سکتا، یا جاننے والوں سے مسئلے مسائل نہیں دریافت کر سکتا۔ اسی طرح غیر قوموں نے کیا اسلام کا نام نہیں سنا اور اگر مذہب کوئی اہم معاملہ ہے تو کیا وہ آسانی سے دو ایک رسالے پڑھ یا سن کر اتنا نہیں معلوم کر سکتے کہ اسلام ہے کیا اور وہ اصولاً چاہتا اور کہتا کیا ہے۔

اس کے علاوہ مسجدوں اور مدرسوں میں جو مولوی پڑے ہیں وہ بھی تو آخر کچھ نہ کچھ اپنی بساط بھر دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ تاہم تبلیغ اس میں شک نہیں کہ دین کی بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی اور اعلیٰ خدمت ہے لیکن

کیا اسلام کی یہ خدمت صرف علماء ہی کے ذمہ ہے دنیا دار اور مالدار مسلمانوں کے ذمہ نہیں کیا وہ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ علماء کو

معاش سے فراغ نہیں لہذا آپس میں سرمایہ جمع کر کے، علماء کی ایک جماعت کو اس کام کے لئے مقرر کر دیں جس طرح مشنری لوگ بڑے بڑے مشاہیر سے پائے ہوئے ہیں جابجا لکچر دیتے اور رسائل تقسیم کرتے پھرتے ہیں

اور ہمارے معترضین کہ علماء پر جو یہ اعتراض سوچا ہے وہ اچھی مشنریوں کی مساعی کو دیکھ کر، اور یہ اس وقت عام عادت ہو گئی ہے کہ اصل حقیقت میں غور نہیں کرتے بس غیروں کے رسم و رواج کو اپنا رہنما اور معیار استحسان قرار دے لیا ہے حقیقت بینی سے قطع نظر یہ بھی نہ دیکھا کہ اپنے علماء پر ان کے علماء کے برابر سچی نہ کرنے کا الزام دینے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیں کہ آپ ہمارے دنیا داروں کے دنیا داروں کے برابر اعانت مالی بھی کرتے ہیں یا نہیں؟

حالانکہ ہمارے ہمارے بدنام ”مولوی“ اب بھی اتنے قانع اور قلیل المصارف ہیں کہ مشنریوں سے بہت کم پر گزر کر رکھ سکتے ہیں لیکن اپنے بال بچوں کے واجبات اور حقوق نفس کا ادا کرنا بھی تو شریعت ہی کا حکم ہے اور مستحب تبلیغ کے مقابلے میں واجب بلکہ واجب تبلیغ پر بھی مقدم ہے اس سے معلوم ہوا کہ قصور زیادہ کس کا ہے دنیا داروں اور مالداروں کا یا مولویوں کا۔ غرض تبلیغ و اشاعت کا وجوب بھی علماء کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ سب مسلمانوں پر اپنی وسعت و اہلیت کے بقدر واجب ہے۔

تحریر و تقریر میں قصور کا شبہ

ایک شبہ عربی کے طالب علموں اور علماء پر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تقریر و تحریر میں قاصر رہتے ہیں تو یہ کلی حکم تو نہایت بے انصافی ہے کیا علماء و طلباء میں بہت سے ایسے بے حد خوش تحریر و خوش تقریر نہیں پائے جاتے جن کا

مقابلہ دوسری تعلیم کا بڑے سے بڑا فاضل بھی نہیں کر سکتا۔
 البتہ اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضرور معلوم ہوتی ہے کہ خوش تحریری
 و تقریری کی مشق کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جائے۔
 اور طلباء کا اختیاری امر نہ ہے بلکہ سب کو اس پر مجبور کیا جائے۔
 خیال تھا کہ اس جدید ضرورت کا احساس پہلے پہل ندوہ کو ہوا لیکن
 جامع المجددین کی نظر کسی جدید و قدیم ضرورت سے بھی کیسے مجبور ہو سکتی تھی
 یہ اور بات ہے کہ قدیم درس گاہوں نے اس تجدید کے قبول کرنے میں تاخیر کی اور
 ندوہ کی قبیل قابل تحسین ہے لیکن وہاں یہ امتحان اعتدال کی حد سے نکل
 کہ غیر مستحسن حد کو پہنچ گیا ہے یعنی ندوی اپنا اصلی کمال انشاء پر دازی اور
 انشاء نگاری ہی کو جاننے لگے ہیں حتیٰ کہ اس کے پیچھے درسیات میں استعداد
 کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور دوران طالب علمی میں عربی و دینی کتابوں سے زیادہ
 اردو کی انشاء پر دازی کتابوں کی طلب و مطالعہ میں لگ جاتے ہیں۔ ابھی
 آج (۱۱ جون ۱۹۳۷ء) یہ سطر یہ لکھ رہی چکا تھا کہ دو زمانہ تنویر میں طلبائے ندوہ
 کی جمعیتہ الاصلاح کا یہ کارنامہ چھپا اور پڑھا کہ علمی و ادبی مجالس میں دلچسپی اور
 انشاء پر دازی اور تنقید کی طرف اشتیاق زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں آگے اور
 اصلی ندویت لیجئے کہ جن حضرات نے زیادہ دلچسپی لی اور ہمیشہ اپنی تقریروں سے
 جلسہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی انہیں کپ و مدل دے کر بہت افزائی کی گئی

لے اس زمانہ میں اس کی مثال ہمارے فاضل اجل مولانا سید مناظر احسن گیلانی سلمہ کی سلمہ
 ہے کہ ساری مشائخ و یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے فضلاء جدید بھی تحریر و تقریر دونوں میں ان
 کا لوہا مانتے تھے۔

غریب طلباء سے زیادہ علمائے ندوہ اور منتظمین ندوہ کو سوچنا چاہئے کہ ان کی اس نقالی کے سوا ہمت افزائی کا کیا اور کوئی طریقہ نہیں اور اس نقالی کے مفاسد کہاں تک جاتے ہیں اور غیروں کی تقلید و اتباع کی اس سے کتنی ہمت افزائی ہوتی ہے ہمارے مشہور خوش تحریروں و خوش تقریر غیر ندوی فاضل اجل مولانا گیلانی نے تو اسی بناء پر ندوہ کا نام ہی ”مدرستہ الصفاۃ و الخطایہ“ رکھ دیا ہے اس کے علاوہ جن کو فطری مناسبت نہیں وہ مجبور کرنے اور مشق کرنے سے بھی طوطے ہی بنے رہیں گے اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ پہلے اندازہ کر لیا جائے اور جن کو مناسبت نہ ہو ان کو اپنا وقت خراب نہ کرنے دیا جائے جیسا کہ حضرت نے اہت فرمائی ہے۔“

”کہ بھر بھی ایسے لوگ ثابت ہوں گے جن کو فطری طور پر تقریر و تقریر سے کم مناسبت ہوگی سو ایسے لوگ اپنے عمل کیلئے علم حاصل کریں دوسروں کے افادہ کے لئے اور بہت سے لوگ مل سکیں گے یہ کیا فرض ہے کہ ہر کام ہر شخص کرے (ص ۳۷۷)“

علماء کی وقت اور عظمت کی حفاظت نہایت اہم ہے

عربی و دینی تعلیم کے طلباء و علماء کو طرح طرح کے معقول و نامعقول صحیح و غلط اعتراضات کا ہدف بنانا خصوصاً نئے فیشن کے لوگوں میں جو ایک فیشن بن گیا ہے اس کی طرف حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے جو اس قدر تبلیغ توجہ فرمائی اور اقامہ ہزانے اس کے بیشتر حصہ کی تنقیص ضروری جانی اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تبلیغ کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں حضرت کی نگاہ تجدید میں دین کی حفاظت کے لئے علماء و فقہاء کی وقت و عظمت کی

حفاظت اہم و اقدم ہے

اس لئے کہ سائے مسلمان سائے اسلامی علوم اور احکام و مسائل کے عالم و محقق نہ کبھی ہوتے ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے لازماً اگر کوئی خاص جماعت و تکتک منکم اللہ کے تحت ہمیشہ اور سرعہ میں موجود رہے تو جمہور مسلمین کو ایمان اور عمل صالح کے مختلف ابواب اور شعبوں کے احکام آخر کون بتلائے اور کس سے معلوم کریں، یہی نہیں بلکہ اگر خدا نخواستہ علماء کی جماعت کسی عہد یا کسی نسل میں بالکلیہ ناپید ہو جائے تو دین کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے خالی کتابوں اور کتب خانوں سے دین محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک ان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ تو اترے کے ساتھ نسلاً بعد نسل مستمر رہے،

خوب یاد رہنا چاہئے کہ زبانی یا دہری تعلیم و تعلیم کا تسلسل و تواتر ٹوٹ جانے سے خالی کتاب ہے ہر چیز کا صحیح سمجھ لینا بھی ممکن نہیں۔ ایک عالم نفسیات خوب سمجھ سکتا ہے کہ کتابوں کی فہم کی استعداد بھی زبانی تفہیم کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے شروع و حاشی بھی زبانی فہم و تفہیم سے مستغنی نہیں بنا سکتے کسی معمولی فن کو بھی جس نے اسٹاڈ سے نہیں پڑھا ہے محض کتابوں سے بیسیوں مقامات پر ٹھوکر کھائے گا۔

غرض جب علماء کا وجود ایک طرف دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دوسری طرف اس کے بقاء و تحفظ کے لئے ناگزیر ہے تو اگر امت کے اندر یہ جماعت خدا ناکردہ موجود نہ رہے یا موجود ہو اور اس کی اتنی تحقیر و توہین با بیجا الزامات سے دلوں میں راسخ کر دی جائے کہ لوگ ان سے بنیاد ہو کر استفادہ نہ کریں تو پھر علماء و تعلیماء اور بالآخر علماء و مآذین دین کے فناء ہو جانے کے سوا اور کیا نتیجہ ہو گا؟ گو جن دین کی حفاظت خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہو وہ فنا نہیں کیا جاسکتا لیکن کیا اس سے

ہم اپنے واجبات سے سبکدوش اور مواخذہ سے بری ہو جاسکتے ہیں۔ حضرت کی کتابوں اور مواظظ و ملفوظات وغیرہ سب میں کثرت سے اس پر تنبیہات موجود ہیں کہ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی عالم سے تعلق رکھنا اور احکام دریافت کرتے رہنا ضروری ہے بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر جیسے ہر شخص یا ہر خاندان کسی نہ کسی طبیعت سے عادت تعلق رکھتا ہے اور چھوٹی بڑی بیماریوں میں زیادہ تر اسی کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے تو کیا روحانی صحت جسمانی صحت کے برابر بھی لائق التفات نہیں اگر قریب کوئی عالم نہیں ہے تو حضرت کی تاکید ہے کہ دور ہی کے کسی عالم سے تعلق رکھے اور خط و کتابت سے احکام معلوم کر لے۔

اسی طرح دینی مدارس قائم کرنے اور جو قائم ہیں ان کی حفاظت و ترقی کی تاکید جا بجا فرمائی ہے کیونکہ ہماری گاڑی کے ڈرائیور یہیں سے پیدا ہوتے ہیں اگر خدا نخواستہ عربی درسگاہوں سے ان کی فراہمی منقطع ہو جائے تو امراء کے فرسٹ و سیکنڈ متوسطین کے انٹر اور غریب و عوام کے حقرو، سائے کے سائے ڈبے اپنی جگہ جس حرکت کھڑے رہ جاتیں، ہر طبقہ کی دینی حیات و حرکت ان مدرسوں سے نکلے ہوئے برے جملے علماء یا مولویوں ہی کے دم سے قائم ہے اور جس قدر امت کے مختلف طبقات اپنی اپنی اہلیت و حیثیت کے موافق ہماری دینی گاڑی کے ان ڈرائیوروں یا چلانے والوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت، خدمت و اعانت کا بندوبست کریں گے اسی قدر ہماری دینی حرکت و حیات جاندار و پائدار ہوگی اور اسی نسبت سے انشاء اللہ دنیا بھی درست ہوگی۔

علم دین کے محقق طلباء و علماء پر

یہاں تک ان حقوق علم پر گفتگو تھی جو زیادہ تر عامہ مسلمین کے ذمہ ہیں

آگے باب دوم میں ایسے حقوق علم میں کوتاہیوں ادران کی اصلاح کو بیان فرمایا گیا ہے جو خود علم دین کے طلباء و علماء پر ہیں۔

بعض طلباء یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو ہمارا تحصیل علم کا زمانہ ہے اس میں عمل کی چنداں ضرورت نہیں یہ سراسر شیطانی دھوکہ ہے نصیحتوں نے و عجب احکام میں طلباء و علماء میں کہیں فرق نہیں کیا۔ البتہ اعمال زائدہ جیسے طویل اور ادیا مجاہدات و ریاضات کہ ان میں مشغول ہونے سے طالب علم کے لئے مطالعہ اور تکرار سبق افضل ہے۔

بعض نام نہاد علماء علوم دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں خواہ طلب جاہ ہو یا طلب مال لیکن ان پر سب کو قیاس نہ کرنا چاہئے کیا کوئی انارٹھی عطائی آدمی خلافت اصول طب کسی کا علاج کرے یا کسی کو دھوکا دے کہ ٹھگ لے تو اس سے ملک کے تمام ماہرین اطباء کے کمال کی نفی جائز ہوگی؟ بہر حال بعض ایسا کرتے ہیں کہ وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہیں اور اسی غرض سے وعظ کرتے پھرتے ہیں کہ کچھ وصول ہو اور اس قسم کی وعیدوں کو بھلا دیتے ہیں کہ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

من تعلم علماً مما یبتغی	جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا ہوئی
به وجه الله لا یتعلمه	کے علم کو دنیا کی کسی غرض سے سیکھا
الا یصیب به عرضاً	اس کو قیامت میں جنت کی بو
من الدنيا لم یجد	بھی نصیب نہ ہوگی
عرف الجنة یوم
القیامة۔

علم دین کے دینی و دنیوی استعمال میں فرق

البتہ جس طرح اوپر آیت لِنُفِقُوا الَّذِینَ اُحْصُوا کے تحت وعظ کی نوکری کا جائز ہونا معلوم ہو چکا اسی طرح اگر اشاعت احکام حسبہ شدہ اور لوگ کچھ خدمت کر دیں جس کی قلب میں طبع نہ ہو (گوا احتمال و سوسہ ہو) تو وہ جائز ہے اور اور اس کا امتحان یہ ہے کہ وعظ کے لئے یہ شخص کون مقامات کو منتخب کرتا ہے ان کو جہاں روپیہ ملنے کی زیادہ امید ہے یا ان کو جہاں تبلیغ احکام کی زیادہ ضرورت ہے یہی امتحان علوم دینیہ کی تدریس کا ہے کہ اگر تنخواہ پر نظر نہ ہوگی تو جس صورت میں ایک مگر پر گذر ہو رہا ہوگا اور وہاں علوم دینیہ کی ضرورت بھی زیادہ ہو تو ایسی جگہ کو چھوڑ کر ترقی پر نہ جائیگا اور نہ خود کو شش کر کے ایسی جگہ جانا چاہیے گا اور فقہاء نے جو تعلیم علوم دینیہ اور وعظ پر اجرت کی اجازت دی ہے اس سے مراد یہی صورت ہے ورنہ حنفیہ رحمہم اللہ طاعات مقصودہ پر اجرت کو بوجہ ہی کے کسی طرح جائز نہیں رکھتے۔

علماء کا امراء سے اختلاف

بعض علماء، امراء و اہل اموال سے اختلاف اسی غرض سے رکھتے ہیں کہ ان سے وقتاً فوقتاً کچھ حاصل ہوتا ہے اس میں گلے نہ نوبت یہاں تک آتی ہے کہ ان کی غرض سے مسئلہ بنا دیتے یا بنا لیتے ہیں جس سے سردست تو وہ خوش ہو جاتے ہیں لیکن بہت جلد ہی ایسے علماء ان کی نظر سے گر جاتے ہیں اور پھر وہ ان پر تمام علماء کو قیاس کر کے جماعت کی جماعت سے نفور ہو جاتے ہیں۔

باقی اگر اس اختلاف سے امراء کی اصلاح ہو کہ ان کو احکام دینیہ بتلاتے

جائیں خصوص جب کہ وہ خود خواہش کریں اور ان کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو تو ایسا اختلاط نہ مضر ہے نہ موجب ذلت، مگر جب قرآن سے یا شرائط سے یہ معلوم ہو کہ آزادی کے ساتھ حق ظاہر کیا جاسکے گا اور ایسی حالت میں اگر وہ کچھ خدمت کریں تو لینے میں کچھ مضائقہ نہیں، مگر استغفر کا مشورہ یہی ہے کہ ہرگز قبول نہ کرے بلکہ جانے سے قبل شرط کر لے کہ لینے دینے کا کچھ قصہ نہ ہوگا جس کا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں امراء کا صلہ نہیں پڑتا کہ علماء کو اپنا تابع بنانے کا وسوسہ بھی دل میں لائیں بلکہ ہر طرح انہی کو تابع ہونا پڑتا ہے اور یہی امر مہتمم بالشان ہے اور اگر خود امراء آئیں تو یہ اختلاط منع نہیں عین مطلوب ہے ان سے بے رنجی دکرے اخلاق سے پیش آتے مگر استغناء کو اب بھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔

حیلہ شرعی کو حیلہ بنانا

بعض علماء کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری غنی بنایا ہے ان کو کسی کے ہاتھ کی طرف دیکھنے کی نوبت نہیں آتی لیکن اپنے مالی معاملات میں ایسا کرتے ہیں کہ اگر شریعت پر عمل کرنے سے کوئی ان کی مالی منفعت ضائع ہو رہی ہو تو ضعیف تاویلوں اور غیر مشروع حیلوں سے (گو نام ان کا حیلہ شرعی رکھتے ہیں) کام لیتے ہیں یہاں تک کہ عام لوگوں کے زبان زد ہو گیا ہے کہ مولوی اپنے مطلب کا مسئلہ جس طرح چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں۔

میرے نزدیک اگر گناہ کر کے اپنے کو گنہگار سمجھے اور گنہگار ہونے کا اقرار کرے تو اتنا مفسدہ نہیں جتنا گناہ کو کھینچنا کہ جائز بنانے میں مفسدہ ہے اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے اور علماء سے بد اعتقاد ہوتے ہیں اور پھر اپنے

معاملات میں تاویلیں اور حیلے پوچھتے ہیں اور اگر کوئی نہیں بتاتا تو قیاس نامہ سے خود ہی اپنی من سمجھوتی کر لیتے ہیں۔

مضرت عوام کی حفاظت

علماء کی شان تو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بلا تاویل بھی جائز ہو مگر کسی وجہ سے اس کے ارتکاب میں عوام کی دینی مضرت ہو تو اپنا ضرر بقدر تحمل گوارا کر لیں لیکن عوام کا دین بچائیں نہ کہ ان کے لئے فتنہ کا دروازہ کھول دیں لیکن اس سے تصحیح معاملات کی ان وجوہ پر اگر ان کو بھی بعض کتابوں میں حیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے کوئی شبہ نہ کرے جن میں بلا کسی نفسانی غرض کے عام مسلمانوں کو تنگی سے نکالنے اور معامی سے بچانے کے لئے اذن دیا گیا ہے جیسا کہ خود حدیث میں ہے کہ بیع الجمع بالدر اہم ثم ابع بالذلہم التمدد وغیرہ ہے فرق دونوں میں یہ ہے کہ جس سے مقصود کسی شرعی مقصود کا ابطال ہو وہ مذموم ہے اور جس سے مقصود کسی مقصود شرعی کا حاصل کرنا ہو وہ محمود ہے مثلاً ربا مقصود نہ ہو بلکہ خود اجناس ہی قیمت میں متفاوت ہوں۔ لیکن اتحاد بدلنے کے سبب تفاضل ممنوع ہو وہاں حدیث مذکور کے سبب تصحیح کر لینا جائز و مشروع ہے

علماء کی جاہ طلبی

یہ تو بصورت مال دنیا طلبی محضی۔ بصورت جاہ دنیا طلبی کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں۔

بعض علماء اس لئے اصرار سے ملتے ہیں کہ لوگوں میں عزت و وقعت بڑھے گی حالانکہ عام مسلمان اس کو اہل علم کے لئے عیب سمجھتے

ہیں، واقع میں بھی علماء کی عزت و شان کے لئے یہی مناسب ہے کہ دین کی خدمت کریں، امراء سے مستغنی رہیں، غرباء کے ساتھ غرض خلقی کریں اور امراء کی نظر میں تو اس سے اچھی خاصی ذلت ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ خوشامد کے لئے ملتے ہیں اور ایک اثر امراء و غرباء دونوں پر ایسا ہوتا ہے کہ تحقیق دین اور فتویٰ کے باب میں اعتبار اٹھ جاتا ہے ان کے وعظ و فتویٰ اور تقریر و فتوحاتیں رہتا خیال ہوتا ہے کہ شاید دنیا داروں کی خوشامد میں ایسا کرتے ہیں۔

لیکن ایک اثر جو خود علماء پر امراء کی صحبت کا پڑتا ہے وہ تو اتنا خطرناک ہے کہ بالآخر ان کے دین کو ہی لے ڈوبتا ہے یعنی امراء کے منکرات پر روک ٹوک ان کے لئے دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ پھر تو ان سے لطف و صحبت ہی رہنا مشکل ہو گا۔

جانبین کو انقباض ہو گا اور چونکہ امراء کو بالعموم مطلوب بنا کر ملا جاتا ہے ان کی خلافِ شرع حرکتوں پر سکوت کرنا پڑتا ہے۔

جس سے علماء کے اندر مدامت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور صحبت کی ترقی سے اس میں ترقی ہوتی ہے حتیٰ کہ قلب سے اس کا اثر زبان پر آتا ہے یعنی پہلے قلب میں حق کی عظمت اور باطل سے نفرت کم ہو جاتی ہے پھر زبان سے اظہارِ حق کی ہمت گھٹتی ہے پھر باطل کا اظہارِ خفیف معلوم ہونے لگتا ہے پھر اس کا صدور ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ ان امراء کو اس کا احساس ہو کر اتنا حوصلہ ہو جاتا ہے کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے موافق ان علماء سے توجہات کی فرمائش کرنے لگتے ہیں اور یہ ان کو پورا کرنے لگتے ہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر ان کا قلب مسخ ہو جاتا ہے اور حق بینی کی استعداد ہی

ضائع ہو جاتی ہے بلکہ اٹے کبھی کبھی اہل حق سے جہال و عناد پر آمادہ ہو جاتے ہیں
 پھر خود ان کی اصلاح کی توقع نہیں رہتی اور امت محمدیہ کے لئے
 (العیاذ باللہ) ابلیس سے زیادہ ضرر رساں ہو جاتے ہیں کہ ان کے
 ہوتے بھڑتے اگر شیطان فارغ ہو بیٹھے تو بھی بعید نہیں میں نے اپنی
 آنکھوں سے ایسے ہی طالب دنیا کو دیکھا ہے کہ ایک ہزار روپیہ
 لے کر اور ایک ترکیب تراش کر حقیقی ساس کے ساتھ ملت
 نکاح کا فتویٰ لکھ دیا۔ حدیث میں اسی طرح کے مسخ قلب کا ذکر
 ہے کہ

لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نہتہم علماء و
 قلم ینتھوا فجالسوہموا کلہم وشاربوہم فضرب
 اللہ قلوب بعضہم ببعض ولعنہم علی لسان داؤد
 وعیسیٰ بن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون
 لیکن یہ سب خرابیاں اسی وقت ہیں کہ جب امراء کو مطلوب بنا کر
 جاویں اسی کی مذمت اعاذیت صحیحہ میں ہے کہ

البغض القراء الی اللہ اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض وہ
 الذین ینورون الامراء علماء ہیں جو امراء سے ملتے ہیں۔
 اور۔ العلماء امتاء الدین اور علماء دین کے محافظ ہیں جب
 مالم یخالطوا الامراء تک امراء سے میل جول نہ رکھیں
 فاذا خالطوا الامراء ورنہ دین کے ڈاکو ہیں۔
 لصوص الدین۔

امراء سے اختلاط و اجتناب کے شرائط

البتہ اگر امراء طالب ہو کہ حاضر ہوں یا کسی ضرورت سے خود علماء کو مدعو کریں تو اس معاہدہ کے بعد کہ ہم آزادی سے جو چاہیں گے کہیں گے اور نذرانہ وغیرہ قبول نہ کریں گے تو ایسی مخالفت محال ہے دین ہے کیونکہ اگر علماء اس طرح بھی ان سے نہ ملیں تو ان کو دین کیونکر پہنچایا مگر اس طرح کا اختلاط فرض عین نہیں کہ سب پر ضروری ہو، فرض کفایہ ہے، اور اس کے لئے ایسا شخص موزوں ہے جو قوی القلب اور غنی النفس ہو ورنہ ضعیف کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ امراء سے بالکل نہ ملے، تبلیغ کے لئے دوسرے لوگ یا رسائل اور کتابیں کافی ہیں،

سبحان اللہ کیا فہم دین ہے کہ حدود سے تجاوز پر یہاں بھی متنبہ فرمایا جو حضرت جامع المجددین کی تجدید کی خاص و نمایاں خصوصیت ہے کہ امراء سے اجتناب کرنے میں ان کو حقیر اور اپنے کو مقدس نہ سمجھے بلکہ ان کو مبتلائے دنیا و جہل سمجھے کہ رحم و دعا کرے اور اپنے کو منعت دین کا مریض جان کر اجتناب کو ایسا سمجھے جیسا کہ زور طبعیت والے کو جس میں تاثر کا مادہ زیادہ ہو متعدد مرض کے مریض سے بچاؤ ہیں اور ساتھ ہی اس متعدی مرض کے مبتلا پر غصہ بھی نہیں کرتے بلکہ رحم کھاتے ہیں

سبحان اللہ کیسی محدودانہ مدد شناسی اور پھر کیسی حکیمانہ ان کی تفہیم ہے! ساتھ ہی پھر تنبیہ ہے کہ اس عدم غصہ اور عدم بغض کی بھی ایک حد ہے

کیونکہ اگر کوئی شخص حق سے عناد اور اہل حق سے بغض و عناد رکھے یا تکبر کرے تو اس سے بغض رکھنا واجب و عبادت ہے اور بغض فی اللہ یہی ہے آگے جاہ طلبی کی ایک اور دقیق تدبیر کا بیان ہے کہ

جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر

بعض دنیا داروں کو دھتکار دیتے ہیں سخت سست کھتے ہیں حتیٰ کہ بعض پہرا بٹھا دیتے ہیں اگرچہ یہ لوگ متکبر امرار کا پورا علاج ہیں جن سے امرار کو ان کے تکبر کی سزا ملتی ہے لیکن یہ تکوینی علاج ہے تشرعی نہیں۔ اور ایسا بڑا ویسا اخلاق شرع کے بالکل خلاف ہے پھر بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس طریقہ سے امرار میں شہرت ہوتی ہے لوگ بڑا بزرگ سمجھتے ہیں لہذا ایسے لوگوں کو بہ نسبت متکبر کے ریاکار (اور جاہ طلب) کہنا زیادہ زیبا ہے۔

یہ تو وہ لوگ تھے جن کے اس طرز عمل کی غایت ہی جاہ حتیٰ بعضوں کے جاہ غایت و سبب نہیں بلکہ مسبب ہوتی ہے۔

اور وہ لوگ واقع میں اپنے کو مقدس اور دوسروں کو گنہگار سمجھتے ہیں اس لئے ان سے نفرت کرتے ہیں ایسوں کو بہ نسبت ریاکار کے متکبر کہنا زیادہ بجا ہے اور یہ تکبر دنیا داروں کے تکبر سے بھی زیادہ قبیح و شنیع ہے کیونکہ ان لوگوں کو بہ نسبت دنیا داروں کے زیادہ علم ہے اور علم کے ساتھ بد عملی عند اللہ زیادہ مغفوض ہے ان لوگوں کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے (لہذا

ان کو کیا معلوم کہ جس کو یہ گنہگار جان رہے ہیں اس کا خاتمہ کیسا ہوگا اور خود اپنے کو جو مقدس سمجھ رہے ہیں ان کا خاتمہ کیسا ہوگا ؟
 صحت تیار کرنا خواہر و میلش بہ باشد

مناظرہ و مجادلہ کی حقیقت

بعض لوگ بلا ضرورت بات بات میں مجادلہ و مناظرہ کرتے اور دن رات اسی میں لگے رہتے ہیں جس سے اکثروں کی غرض اپنی علمیت کا سکھ بھانا یا علمی جاہ طلبی ہوتی ہے جس کا

بعض اوقات یہاں تک افراتفر ہو جاتا ہے کہ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی باطل پر اصرار رکھتے جاتے ہیں کہ بات ٹھنی نہ ہو جائے میں نے ایک ایسے ہی کافرمی ایک قطعی رضائی رشتہ میں نکاح کا دیکھا کہ ابتدا میں تو ان سے غلطی ہو گئی مگر پھر بات کی پیچ پڑ گئی اور باوجود سارے علماء کی مخالفت کے اور تقریراً و تحریراً تنبیہ کرنے کے ہرگز رجوع نہ کیا حتیٰ کہ بعض ثقہ لوگوں سے سنا گیا کہ خود اپنے ایک بزرگ سے کہا کہ اب کیا کروں قلم سے نکل گیا اب تو تائید ہی کرنا ضروری ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما ضل قوم بعد ہدیٰ کانوا علیہ الا اولوا الجدل ثم قرأ هذه الآية ما ضربة لك الاجد لا بل هم قوم خصمون جدل سے مراد یہاں عناد ہے اور اپنے مذہب کی ترویج کے لئے تعصب ہے۔“

اور بعض آیات و روایات میں مجادلہ و محامد کا جو امر و اذن ثابت ہے تو یہ مطلب نہیں کہ ہر مجادلہ اور ہر حال میں مذموم ہے البتہ ہمارے زبانہ میں زیادہ تر ایسے ہی مجادلہ کا رواج ہے جو مذموم ہے یا جس کا ترک محمود ہے اور جس کی مذمت آیات و احادیث اور بزرگوں کے کلام میں موجود ہے اس کی تفصیل ذرا آج کل کے مناظرہ پسندوں کے لئے کان کھول کر سننے کی ہے

طنی و قطعی مسائل کے حکم کا بڑا اہم فرق

مسائل دو قسم کے ہیں ایک جن کی شق یقیناً حق اور دوسری باطل ہے خواہ سمجھا خواہ عقلاً، یہ مسائل قطعیہ کہلاتے ہیں دوسری قسم جس میں دونوں جانب حق و ثواب کا احتمال ہو، یہ مسائل ظنیہ کہلاتے ہیں مسائل کلامیہ اکثر قسم اول سے ہیں اور بعض ثانی سے اور مسائل فقہیہ اکثر قسم ثانی سے ہیں اور بعض اول سے۔

مسائل ظنیہ میں صرف طنی ترجیح ثابت کرنے کے لئے اہل علم میں باہم گفتگو و مکالمات جائز ہے بشرطیکہ نہ بغض و عناد ہو نہ ایک جانب کی قطعیت کا اعتقاد ہو نہ دوسری جانب کے قطعی باطل ہونے کا یقین جائز، نیز جب سمجھ میں آجائے تو اپنی رائے سے بیہودہ اور حق کے قبول کا عزم ہو۔

مگر مصلحت اس میں بھی یہ ہے کہ عوام تک اس کی اطلاع نہ ہو اگر زبانی گفتگو ہو، مجمع خواص کا ہو اور اگر تحریری ہو تو عام فہم زبان مثلاً ہندوستان میں اردو میں نہ ہو، عربی میں ہو یا کم از کم فارسی میں تاکہ اگر کسی وقت شائع ہو جائیں تو عوام تک اس اختلاف کا اثر

نیچے اور سلف سے اسی طرح کی گفتگو منقول ہے کہ جیسی آج کل ہوتی ہے کہ ایک قراءۃ خلف الامام کا حق ہونا، اس طرح تبلا رہا ہے کہ اس کے نزدیک تمام حنفیہ تارک صلوٰۃ اور فاسق ہیں اور دوسرا اس کی اس طرح نفی کر رہا ہے کہ گویا اس کے نزدیک قراءۃ خلف الامام کی کوئی حدیث ہی نہیں، اور عین مناظرہ میں اگر مقابل کا قول دل کو لگ بھی جاتے تب بھی ہرگز قبول نہ کریں بلکہ گفتگو شروع کرتے ہی رد ہی کا سچا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی نیت سے سنتے ہیں کیونکہ مقصود تھا متراپا غلبہ اور دوسرے کو ساکت کرنا ہوتا ہے پھر باہمی عناد و فساد حتیٰ کہ نوبت عدالت تک پہنچتی ہے کیا یہ دین ہے کیا سلف صالح اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا

ان مسائل میں یہی طریقہ تھا

افسوس اگر آج مسلمان ان ظنی مسائل میں اختلاف و گفتگو کو اپنے حدود میں رکھتے اور محدود وقت کی حدود شناسی کو مشعلِ ہاد بنا تے تو کتنے اور کیسے کیسے حبیب و مہلک مفاسد کا سد باب ہو جاتا پھر ہمارے آج کل کے سیاسی و ملکی مسائل تو ان فقہی مسائل سے بھی زیادہ ظنی ہیں ان میں ایک دوسرے پر لعن طعن، سب و شتم، تکفیر و تفسیق اور وہ بھی کسی خاص مجمع اور کسی خاص زبان میں نہیں بلکہ عوام الناس کے بھرے جلسوں اور ہر اردو اخبار کے کھلے کالموں میں سیاسی و ملکی ہی کیا اور عوام یا انگریزی دانوں ہی پر کیا موقوف بعض مستند اور بہت سے غیر مستند مدعیانِ علم دین فقہی و ظنی مسائل تک کو رسائل و اخبارات کے میدان میں عوام الناس کے سامنے ڈال دینا عین خدمت دین جانتے ہیں یہ بین تفاوت رہ از کجا است تا کجا۔

کاش اسلام کے یہ نادان دوست مجدد وقت کی ان باتوں پر کان دھرتے تو آج مسلمان ان دینی و دنیوی ہلاکتوں اور زلتوں سے کیوں دوچار ہوتے! حضرت جامع المجددین کی اصلاحات و تجدیدات ہر معاملہ میں ایسی جامع ہیں کہ بے ساختہ دل گواہی دیتا ہے کہ اگر ان کا اتباع ہو تو دین و دنیا کی صلاح و اصلاح سب کا نقشہ سلف خدا چاہتا پھر سامنے آجاتا۔

مسائل قطعیہ میں اختلاف کی مختلف حالتوں کا حکم

اب رہ گئے مسائل قطعیہ جیسے کفر و اسلام کا اختلاف، یا اہل حق کے نزدیک جو متفق علیہ بدعت و سنت ہے تو اس میں چند حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ صاحب باطل متردد و طالب حق ہے اور اپنے شبہات صاف کرنا چاہتا ہے اور اس غرض سے گفتگو یا مناظرہ کرتا ہے تو جو شخص حق کی تائید پر قادر ہو اس پر ایسا مناظرہ واجب و فرمن ہے اور جب جواب سے عجز ہو تو صاف کہہ دینا چاہئے کہ اس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سوچ کر یا پوچھ کر تبادلوں گا۔ یا اپنے سے زیادہ جاننے والے کا ہتہ تبادلوں گا اور طالب کو چاہئے کہ وہاں جا کر رجوع کرے ایسے مناظرے سے انکار معصیت اور مَنْ سئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَلَکُمُ الْخَمِیْنِ میں شامل ہے (۲) دوسری حالت یہ ہے کہ مخاطب طالب حق نہیں لیکن متکلم مناظرہ کو توقع و احتمال ہے کہ شاید حق کو قبول کر لے، سو جب تک اس کی امید ہو مناظرہ کرنا تبلیغ احکام میں داخل ہے کہ جہاں تبلیغ واجب ہے وہاں یہ مناظرہ واجب اور جہاں مستحب ہے وہاں مستحب ہے۔ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اہل کتاب و خوارج سے مناظرات اسی قبیل سے تھے (۳) اور تیسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب بھی نہیں نہ قبول کی امید ہے مگر کسی

مفہوم مضرت کا اندیشہ بھی نہیں اور کسی ضروری امر میں خلل کا بھی احتمال نہیں تو ایسی صورت میں ایسا مناظرہ مستحب ہے۔

(۴) چوتھی حالت یہ ہے کہ طالب سے نہ امید قبول نہ کسی ضروری امر میں خلل نہ کسی مضرت کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں قوی ہمت کے لئے عزیمت و ادائیگی ہے اور ضعیف ہمت والے کے لئے رخصت و غیر ادائیگی۔

(۵) پانچویں حالت یہ کہ نہ طالب سے توقع قبول اور ساتھ ہی کسی دینی مضرت کا احتمال یا کسی اہم دینی منفعت کے فوت ہونے کا احتمال ہے اس صورت میں اس سے اعراض اور ضروری میں اشتغال واجب ہے۔

قرآن مجید میں اعراض اور ترک حلال کا امر ایسے ہی موقع پر ہے سورۃ عبس کے شان نزول کا جو قصہ تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے اس کو تیسری حالت میں داخل سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پانچویں حالت میں داخل بتلایا۔

(۶) چھٹی حالت یہ ہے کہ مناظرہ کرنے میں تو مخاطب کی نہ کوئی منفعت متوقع ہے اور نہ اس سے کسی خاص مضرت کا احتمال ہو اور مناظرہ نہ کرنے سے عموماً اہل حق کے شبہ میں پڑ جانے کا خوف ہو اور مسئلہ ایسا ہو کہ عوام اہل حق کو اس کے غلط ہونے کا احتمال بھی نہ ہو تاکہ علمائے حق سے دریافت کر سکیں تو اس صورت میں اس کی تدبیر واجب ہے جو دو ہیں۔

ایک یہ کہ خود اہل باطل کو مکالمہ یا مکاتبہ میں مخاطب بنایا جائے۔

دوسری یہ کہ اس سے خطاب نہ کیا جائے بلکہ عام خطاب سے حق کو ثابت اور باطل کو رد کیا جائے۔ ان میں جس تدبیر کو اختیار کیا جائے واجب ادا ہو جائیگا۔ ساتویں حالت یہ ہے کہ قیود مذکورہ حالت ششم کے ساتھ وہ مسئلہ

سبھی ایسا ہو کہ عوام اہل حق کو اس کے غلط ہونے کا شبہ واقع ہو سکتا ہو اس صورت میں خود عوام پر واجب ہے کہ علماء سے تحقیق کریں اور علماء پر جواب دینا واجب ہو گا ورنہ بدون سوال وہ سبکدوش ہوں گے۔

ادراں تمام صورتوں میں یہ واجب ہے کہ الفاظ و مضمون متانت و مہذب کے خلاف نہ ہوں اور اگر دوسرا درشتی کرے تو صبر ہی افضل ہے

ممنوع و مذموم بحث و مباحثہ

یہ ساری تفصیل و تقسیم ان امور میں ہے کہ جو شرعاً مقصود ہوں بعض وہ امور ہیں جو شرعاً مہتمم بالشان نہیں جیسے خاندان چشتیہ کا باہم تفاضل۔ یا بعض وہ امور جن میں بحث کرنے یا حکم لگانے سے شائع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے جیسے تقدیر کا یا کوئی دوسرا ایسا ہی مسئلہ، مثلاً باوجود اس کے کہ کسی کا کلام صحیح معنی کو محتمل ہو پھر بھی اس پر کفر کا حکم لگانا، ایسے امور میں بحث و مباحثہ کرنا ممنوع و مذموم ہے جس مرتبہ کی نہی یا مہنی عنہ ہو گا اسی مرتبہ کی ممانعت و مذمت ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ نہ ہر مناظرہ محمود ہے نہ مذموم، نیز تمام وہ نصوص و اقوال اور عادات ائمہ دین جو بظاہر اس باب میں متعارض نظر آتے ہیں ان میں تطبیق ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس نزاع میں زیادہ ایسے ہی مناظرے شائع ہیں جو مذموم ہیں

۱۔ ایک مناظرہ ہی کی بحث میں حضرت مجددی ان تجدیدی تحقیقات و تفصیلات کے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح ہر مسئلہ کے تمام جزئی پہلو آئینہ فرادیسے بجاتے ہیں اور بظاہر متضاد سے متضاد جزئیات کی چولیں کس طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہیں اور ہر شے اپنی حد میں رہتی ہے، ع

اس سعادت پر دیا زو نیست

مسٹروں کے ملکی و سیاسی مناظروں کے مولویوں کے دینی و مذہبی مناظروں کو بھی مات کر دیا۔

البتہ مولویوں اور مذہبی کے میدان یا تحریری مناظرات کی جگہ جن میں پھر بھی دین سے ایک لگاؤ تھا، اب حکومت و سیاست اور مسٹروں کے پنڈالی یا اجاری مناظرات نے حاصل کر لی ہے جن کو تحقیق حق یا قبول حق سے اتنا بھی تعلق نہیں جتنا دینی مناظروں کے معمولی سے معمولی فریقین کو ہوتا تھا۔

بس ہر جماعت اس کے ہر لیڈر و اڈیٹر اور ہر جلسہ و جلوس کا فرض یہ ہے کہ اپنی ہی بات جہاں تک ہو سکے اتنے غل و ہنگامہ کے ساتھ کہے جاتے کہ دوسرے کی نہ خود سننے نہ کسی کو سننے دے اور اس فرض کی ادائی میں بغض و عناد، دروغ و بہتان، مکر و فریب، لعن و طعن، یہ سب فریقین کے لئے عین سیاست اور عین تہذیب ہے کیونکہ یہ سب پروہنگینڈا ہے یہی نہیں بلکہ ہر درجہ کا طوفان بے تیزی فتنہ و فساد، ملک و قوم کی عین خدمت بلکہ درجہ جہاد ہے،

فریق مخالف کے جلسوں اور جلوسوں میں فتنہ برپا کرنا، مقرر کو تقریر دکر کرنے دینا، شرم شرم کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالینا، حسب ضرورت سوڈے کی بوتلوں اور انڈوں کی مار سے تواضع کرنا اس سے بھی کام نہ چلے تو اینٹیں اور پتھر ہیں اور پھر یہ فتنہ و فساد کوئی اتفاقی نہیں بلکہ ہر جلسہ و جلوس میں اس کا احتمال اس لئے پہلے سے جلسہ و جلوس کی اجازت اور پھر موقع کے لحاظ سے پولیس یا فوج کی نگرانی لازم ہے۔ اور جو خوش قسمت اس قومی و سیاسی جہاد میں پولیس کے ڈنڈوں اور فوج کی گولیوں کے لئے سینہ پیش کر کے کام آسکے اس کے مجاہد

دشہید ہونے میں کیا شک! جلسوں اور جلوسوں ہی کی قید نہیں یوں جی تقین
جو دہشت انگیزی اور کشت و خون میں بازی لے جا سکے مثلاً فلسطین کے
یہودی تو بس وہی برسرتی ہے اس کے علاوہ نہ امریکہ کے ٹرومین کے پاس
ٹرویاتی کا کوئی معیار ہے اور نہ برطانیہ کے پاس انصاف، یا اپنے وعدوں کی
شرم، جہلاقی و باطل کے پرانے مولویانہ مناظرہ کے فریقین کے پاس احقاق
حق و ابطال باطل کے لئے ایسی دہشت انگیزی کی منطق اور دلائل کہاں
موجود تھے جن کا مقابلہ بڑی بڑی حکومتوں کو اپنی فوجوں سے کرنا پڑے

مسلمانوں کی جیت سیاسی مباحثوں اور مناظروں میں بھی
حضرت مجدد کے تجدید فرمودہ اصول ہی میں ہے۔

کاش مسلمان اب بھی آنکھیں کھولتے کہ انہوں نے وحی نبوت کی روشنی
کو رکھتے ہوئے دین و دانش دونوں آنکھوں کے کیسے اندھوں کا دامن
مٹھام رکھا ہے، مسلمانوں کی تو دنیا کا بھی ہر اہم مسئلہ کسی نہ کسی طرح نقیاً یا اثباتاً
یواسطہ یا بلاواسطہ دین ہی کا مسئلہ ہے، اس لئے اگر وہ اختیار سے اجباری
وینڈالی بخت و مناظرہ میں صرف اپنی دینی راہ کے ان حدود و شرائط پر عمل پیرا
ہو جائیں جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے آخر میں بطور خلاصہ تحریر فرماتے
ہیں تو انتشار و فتنہ حق کی بدولت معاندین کے باطل پروپیگنڈے اور ناحق
کی خور زری و دہشت انگیزی کو بالآخر مغلوب ہی ہونا پڑے گا بس ذرا ایمان
و عمل صالح کے ساتھ تواضعی بالحق و تواضعی بالصبر کی ضرورت ہے
بہر حال مسلمانوں کے لئے بحیثیت مسلمان حکومت و سیاست کے

بظاہر دنیاوی مسائل میں بھی بحث و مباحثہ کے وہی آداب و شرائط ہیں جو خالص دینی مسائل میں ہیں۔

”یعنی وہ مسئلہ دین میں مقصود بھی ہو، دل سے یہ غم نہ ہو جائے کہ حق واضح ہو جائے گا تو فوراً قبول کر لیں گے یہ نیت نہ ہو کہ ہر بات کو رد کر دیں گے گو سمجھ میں بھی آجائے، مخاطب پر شفقت ہو اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو تو صبر و معدلت کے ساتھ مقابلہ کرے اگر قرأت سے عناد مشاہد ہو تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرے الفاظ و مضمون نرم ہو جو بات معلوم نہ ہو نہ جاننے کا اقرار کرے عار نہ کرے“

ذرا ان اصولوں کو مسلمان امتحاناً ہی کچھ عرصہ صبر و عنایت کے ساتھ اپنے اجباری و سیاسی مباحثوں اور اکھاڑوں میں آزما دیکھیں، گو یہ صبر و عنایت دین سے تعلق کے بغیر نصیب ہونا آسان نہیں تاہم جہاں ترقی کی سبب تدبیریں کرتے ہیں دین کے تعلق کو بھی بطور تدبیر ہی اختیار کر دیکھیں، مگر جب خود علماء ہی طوفانِ بے تمیزی کے اس اکھاڑے میں کود پڑے ہوں تو عوام سے کیا اور کس منہ سے کہا جاتے، اور دینی اعتبار سے لیڈروں کا شمار عوام ہی میں ہے درز وہی ہونا تھا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے کہ ان باتوں کو دیکھ کر

عوام الناس علماء سے بھی بدگمان ہو گئے ہیں کہ یہاں ہر شخص دوسرے کی تکذیب کرتا ہے اس لئے یا تو سب کو چھوڑ دیتے ہیں، یا ایک کی طرف ہو کر مقابل کی بے آبروئی اور ایندازِ رسانی کے درپے ہوتے ہیں اور باہمی عداوت قائم ہو کر اکیس دوسرے کی بے آبروئی (بلکہ جان تک) کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور گروہ بندیاں ہو کر

مسلمانوں کی وقعت و قوت میں رفتانہ ضعف و خطا طوطا جالتا ہے کبھی
مار پٹائی ہو کر نوبت بعدالت پہنچتی ہے۔

بعض لوگ ان مفاسد سے قطع نظر کر کے اجباری یا پڈالی بحث و مباحثوں
کے طرح طرح کے مصالح و فوائد بیان کرتے ہیں مگر خالص طبالاکہ فقد ان کی
صورت میں ہوتا وہی ہے جو ایسے مذہبی مناظرات میں ہوتا تھا کہ ملاں آں باشند کہ
چپ نشود اب لیڈر آں باشند کہ چپ نہ نشود یعنی

ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے ہر شخص دوسرے کا جواب، پھر
وہ دوسرا اس کا جواب الجواب، پھر وہ پہلا اس جواب الجواب کا
رد پھر دوسرا اس رد کا رد دونوں اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں
اور بقول ایک بڑے عالم کے کہ جب تک مولوی یا لیڈر کی زبان پر
لقوہ اور ہاتھ پرنالچ نہ کرے اس رد و قدح کا تحریری و تقریری سلسلہ بند نہیں
ہو سکتا۔ پھر ایک خرمازاری یہ ہے کہ مولویانہ وعظ کی طرح جس کس دنا کس کل
جی چاہے لیڈرانہ تقریر کے لئے بھی کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ وعظ کے متعلق حدیثوں
میں ہے کہ۔

لا یَقْضُ الا امیراً و ما موراً و مختالاً و مرآء
یعنی وعظ امیر کہتا ہے یا ما مور کہتا ہے (یعنی اس کو کہنا چاہئے) یا پھر
شیخی باز (مختال) یا ریا کار۔
اسی طرح ہے کہ

من تعلم صرف الکلام لیسبی قلوب الناس لم یقبل
اللہ له یوم القیامة صرفاً ولا عدلاً
یعنی جو آٹھری (صرف الکلام) یا باتیں بنانا اس لئے سیکھتا ہے

کہ لوگوں کے دلوں کو بچانے، اس کا قیامت کے دن نہ اللہ
فرض عمل قبول فرماتے گا نہ نفل۔

آج کل اس صرف کلام یا باتیں بنانے اور الٹ پھیر کرنے کا جیسا
نور اور جیسا بیجا استعمال ہے ظاہر ہے اور جیسے بہت سے واعظین
بدوں کا فی علم کے وعظ کہنے لگتے ہیں اور ضَلُّوا وَاَضَلُّوا کا مصداق ہوتے
ہیں ویسے ہی آج کل کے بہت سے لیڈر و اڈیٹر سیاسی و دنیوی مسائل کو
بھی پوری طرح جانے اور سمجھے بغیر نام کے رہنما لیڈر بن کر خود بھی گمراہ ہوتے
اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

مدارس کی اصلاح

یہ تو علماء کے فرائض و مشاغل کے متعلق اصلاحات تھیں۔ اس کے بعد جہاں علمائے دین ہیں یعنی مدارس کی اصلاحات کا بیان ہے، ان مدارس کی مجددانہ نگاہ میں اتنی اہمیت ہے کہ فرطتے ہیں

”اس میں خدائے شہ نہیں کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لئے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق منصوص نہیں، دنیا میں اگر اس وقت اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں کیونکہ اسلام نام ہے خاص عقائد و اعمال کا، جس میں دیانات، معاملات و معاشرت اور اخلاق سب داخل ہیں اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم پر اور علوم دینیہ کا بقاء ہر چند کہ فی نفسہ مدارس پر موقوف نہیں مگر حالات وقت کے اعتبار سے ضرور مدارس پر موقوف ہے

لیکن ساتھ ہی ان مدارس میں ہم جیسے خدام و عمال کی سوء تدبیر سے متعدد ایسے امور پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح بہت ضروری ہے اور یہ اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت ہندو ملست بھی بنتی ہے اور ان مدارس کے قائم کرنے کی خود جو روح و غایت ہے یعنی عمل بالذین وہ بھی ضعیف ہو جاتی ہے اور لوگ

علوم دینیہ سے متوحش و نفور ہو جاتے ہیں تو اس طرح یہ جماعت
علم گویا یَصْدُقُ عَنْ سَبِيلِ اللہ (خدا کی راہ سے روکنے)
کا سبب بن جاتی ہے

چندہ کے متعلق خاص اہم تجدیدی اصلاح

ایک بہت ضروری اصلاح جس کی طرف جا بجا متوجہ فرمایا گیا ہے اور
جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی خاص تجدیدی اصلاحات میں داخل ہے
اور جس میں عوام و خواص علماء و غیر علماء ریڈرو مسٹر سب ہی مبتلا ہیں وہ یہ کہ
إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ وَلَا يَقْبَلُ إِلَّا الطَّيِّبَ اور لَا يَحِلُّ مَالُ الْمَرْءِ
إِلَّا بِطَيْبِ نَفْسِهِ کسی کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں، کی صریح
نصوص ہوتے ہوئے مدارس کے چندوں میں مال کے حلال و طیب پر کہنا چاہئے
کہ بالکل نظر ہی نہیں ہوتی، مثلاً چندہ لینے میں دینے والے کے طیب نفس کی
بالکل ہی پرواہ نہیں کی جاتی، بلکہ طرح طرح کے اثرات اور دباؤ سے کام لیکر
زیادہ سے زیادہ وصول کر لیا ہی بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ

بعض جگہ دوامی چندہ کا وعدہ کرتے ملے کی موت کے بعد وارث
اس چندہ کو جاری رکھتے ہیں اور اہل مدارس اس کی تحقیق نہیں کرتے
کہ ان لوگوں نے اپنے ملک خاص سے جاری رکھا ہے یا ترکہ مشترکہ
سے اور اس ترکہ مشترکہ میں کوئی یتیم یا غائب یا غیر راضی کی ملک
تو نہیں نسر کیا ہے، اسی طرح میت کے کپڑوں کو مدرسہ میں لیتے
وقت میت کے ورثہ اور ان کے بلوغ و رضا کی تحقیق نہیں
کی جاتی۔

دوامی چندہ میں جو آخر سال بقایا واجب رہ جاتا ہے اس بقایا کا طبع کرنا (جس کا عام رواج ہے) امر منکرہ معلوم ہوتا ہے اس سے صاحب چندہ کی نادرہ ہندگی اور خلافت و عہدگی کا اظہار ہے۔ مدرسہ کانپور میں (جو خود حضرت کی نگہ لانی میں تھا) اس کی اصلاح اس طرح کی گئی تھی کہ روئداد میں صرف وصول شدہ چندہ لکھا جاتا اور بقایا کو مدرسہ کے خاص رجسٹر میں رکھ کر بذریعہ خط یا دوبانی کر دیا جاتی تھی اور یاد دہانی میں بھی میرے نزدیک ضروری ہے کہ لزوم و تاکید کے الفاظ نہ ہوں بلکہ تصریح کر دی جاتے کہ اطلاع دی جاتی ہے اگر میرے رغبت ہو تو بھیج دیکھتے ورنہ آپ آزاد ہیں اور یہ کبھی نہ خیال کیا جاتا کہ اس طرح کون دیتا ہے یہ خیال غلط ہے جتنا آتا ہوتا ہے آتا ہے اس کا کامل تجربہ ہو چکا ہے ہرگز و موسر نہ کیا جاتے۔

جب خود مدرسہ چلانے والے علماء و اکابر میں اتنا غنا و توکل بھی نہیں ہوتا تو وہاں کے پڑھنے والوں میں خدا اور دین سے کسی خاص تعلق کی توقع کہاں تک ہو سکتی ہے بعض لوگ چندہ کی رقموں میں اس طرح بیجا اخراجات اور خلافت اذن تصرفات کرتے ہیں جیسے گویا ان کی ملک ہے اس میں بہت احتیاط کرنا چاہئے۔

لیکن اس کی احتیاط اتنی کم کی جاتی ہے کہ ایک مشہور مدرسہ میں تو مسجد تک کا روپیہ بے تکلف دوسری مدوں میں صرف کیا جاتا رہا جو نہیں معلوم مسجد بننے وقت پھر کس کس طرح ادا کیا اور کرایا گیا بھلا ایسی دس گناہوں میں ظاہری تدابیر و انتظام کے باوجود اگر تقویٰ و تدین نہ پیدا ہو تو کیا تعجب؟

طلبائے دین کی ذلت سے حفاظت

اگرچہ جہاں طلبہ کو لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہوں طلبہ کسی کے گھر کھانا لینے نہ جائیں اس میں علم اہل علم کی سخت اہانت ہے، نیز ایک اخلاقی خرابی یہ ہے کہ اس عادت کی بدولت دوسروں سے مانگنے میں طبعی انقباض یعنی جھجک نہیں رہتی اور یہی طبعی انقباض جیسا کہ ایک بڑی فرد ہے جو ذلت کے سوال سے انسان کو روکتی ہے جب یہ نہ رہی تو رکنا طبعاً نہ ہوگا عقلاً ہوگا اور غرض ایسی چیز ہے جو عقلی مانع کو طبع دفع کر دیتی ہے ایسے وقت طبعی مانع ہی کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ نہ رہا تو اس شخص کو جب موقع ہوگا ہاتھ پھیلا دے گا۔ نیز جب دل میں ایسے شخص کی قدر و منزلت نہ رہی تو اس کا وعظ کیانا فاع ہوگا۔

اس لئے جو طالب علم کو کھانا دینا چاہے مدرسہ میں بھیج دے اسی طرح دعوت میں بھی طلبہ کو نہ بھیجا جائے جس کو کھانا ہو مدرسہ میں لا کر کھلاتے اور ہر چند کہ پہلے بزرگوں نے اس کو جائز رکھا تھا لیکن اس وقت کے دیندار عوام اہل علم کو ذلیل نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے آنے کو اپنے گھر کے لئے موجب برکت سمجھتے تھے، تو یہ مفسدہ نہ تھا اور خود طلبہ کے کبر کا معالجہ بھی اس میں ہوتا تھا اور اسی کی ایک صورت طلبہ کو خچہ کی فراہمی کے لئے بھیجنا ہے اس کے بھی وہی آثار و مفاسد ہیں جو کھانا لینے کے لئے گھروں پر جانے کے۔

طلباء کی وضع و لباس

بعض مدرسوں میں طلبہ کے اعمال اور وضع و لباس پر روک ٹوک نہیں

ہوتی، اس سے جو اثر عوام و خود طلبہ پر ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں، لیکن اس حسن فہم کو کیا کہتے کہ جس چیز کی ضرورت حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک محتاج بیان نہیں وہ بعض بڑے مشہور دینی مدارس اور ان کے اکابر کے نزدیک سرے سے چندال محتاج توجہ نہیں، حالانکہ اہل فہم کے لئے انسان باللباس کا اصول دونوں اعتبار سے نہایت حکیمانہ و نفسیاتی ہے جیسا آدمی ویسا لباس اور جیسا لباس ویسا آدمی، یعنی جس طرح باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اور ظاہر کی وضع و لباس کو باطن کے خیالات و رجحانات کے بنانے بگاڑنے میں دخل ہوتا ہے۔ موٹی بات ہے کہ ہماری وضع و قطع ہماری اندرونی پسند و ناپسند کے تابع ہوتی ہے جیسے اور جن عادات و اخلاق کے لوگوں کو ہم پسند کرتے اور جن کی ہمارے دل میں کسی اعتبار سے عظمت و محبت ہوتی ہے انہی کی وضع و لباس اور طور و طریق کو ترجیح دیتے اور اختیار کرتے ہیں،

آج کل کے اکثر جوان اور بوڑھے تک جو امر دینے پھرتے ہیں ان سے راقم احقر یہی عرض کرتا ہے کہ یہ ڈاڑھی مونچھ کے چند بالوں یا مرد ہو کر امر دینے کا سوال نہیں بلکہ دل کے اس چور کا اظہار بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے قلب میں خدا نخواستہ کمرزن اور کمرزینوں کی وقعت و عظمت معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور محمدیوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے اور کمرزن کی شکل و صورت معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے زیادہ پسندیدہ و محبوب ہے کون نہیں جانتا کہ جس کی ہمارے دل میں جتنی زیادہ محبت و عظمت ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ ہم طبعاً اس کی ایک ایک ادا اور نقل و حرکت کی نقالی کرتے ہیں اور اس کی حرکات و سکنات کے معقول یا نامعقول ضروری اور غیر ضروری ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ فرض و وجوب، استحباب و اباحت کی بحث کی

جاتی ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا پر جان دیتے اور اتباع کا اہتمام فرماتے تھے اس میں شرعی بحث سے زیادہ طبعی راز یہی ہے کہ ان کے رگ وریشہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت پیوست تھی۔

اب دوسری طرف لیجئے کہ اگر کسی بزدل و نامرد کو بھی پولیس یا فوج کی وردی پہنا کر کھڑا کر دیں تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے اندر بھی مردانگی کی ایک جھرجھری سی پیدا ہو جائے گی فوج و پولیس کے سپاہی جب گھریلو لباس اتار کر اپنی وردی یا یونیفارم پہن لیتے ہیں تو اپنے فرائض و منصب کا شعور قدرۃ تیز و تازہ ہو جاتا ہے پولیس کا کوئی سپاہی اگر وردی میں چوری کرتے پکڑا جاتے تو زیادہ مجرم و محبوب ہو گا کہ جو وردی چوروں کے پکڑنے کو پہنائی گئی تھی اس میں خود چوری کرتے پکڑا گیا۔ کافروں اور فاسقوں کی وضع و قطع ہیئت و صورت اختیار کی جاتے تو کفر و فسق ہی کے میلانات کو تقویت ہوگی، اور اگر آدمی محتوم القلب نہ ہو گیا ہو تو نیکوں و متقیوں کے ریائی لباس میں بھی فسق و فجور کے ارتکاب سے قدرۃ شرم و حججک ہوگی، ظاہر کے تغیرات کا باطن کے میلانات و جذبات پر اثر پڑنا نفسیات کی مسلمہ و بدیہی حقیقت ہے

افسوس کہ فکر و فہم کے قحط اور تقلید و نقالی کی دباؤ کی بدولت ایسی موٹی باتوں کی بھی اتنی تفصیل کرنی پڑی جو واقعاً حضرت علیہ الرحمۃ کے بقول سرے سے محتاج بیان ہی نہ تھیں۔ بہر حال اب یہ دبا اچھے اچھے عربی و دینی مدارس میں پھیل رہی ہے کہ اپنے بزرگوں اور صلحا و انقیاء کی صورت کے بجائے اعیانہ اور کفار و فساق کی سجد و سج کی کھلے کھلے نقالی ہوتی ہے ڈاڑھیوں پر اگر استر کاوار کسی مجبوری و مصلحت سے نہیں ہوتا تو قلیچی کی نوازش اس کو مسنون حد تک

تو مشکل ہی سے آنے دیتی ہے بہت سے طلبہ اور بعض اساتذہ تک کے انگریزی بال ٹوپوں کے اندر اہتمام کے ساتھ چھپاتے جاتے ہیں، محبوب وضع کی حفاظت بہر حال لازم ہے خواہ اظہار کی بے تابی کے باوجود کسی مجبوری سے احتیاط کی مصیبت ہی جھیلنا پڑے، پاستاموں کا ٹخنوں سے اوپر رکھنا بھی اکثر بادل غلام ہوتا ہے اس لئے ان کی کتیریونٹ جدید ہی رہتی ہے کہ جب موقع ملا نیچے کھسکا اور چڑھالیا پھر بھی مولویت کی ذلت کو کترتا خصوصاً اگر فردا سالبا ہو فاش کر دیتا تھا، سو اس کی جگہ قیصر نوگویا اب عربی طلبہ بلکہ اساتذہ تک میں ایک بالکل بے عیب فیشن ہے اور بعض عربی مدارس جو زیادہ روشن خیال و ترقی یافتہ ہیں ان کی دہشتوں اور کھیلوں میں ہاکی فٹ بال وغیرہ ہی مقبول ہیں اور نام کی اصلاحی انجن (یونین کی نقالی) کی ترقیوں کے سلسلے میں فخریہ اجناس شائع ہوتا ہے کہ انعام میں ورلڈ کپ اور ٹیڈل تقسیم ہوتے، عرض اب قرآن وحدیث پڑھنے والے یہ طالب علم اپنے نزدیک ملٹن اور شکسپیئر پڑھنے والی برادری کی نگاہ میں زیادہ رسوا نہیں۔

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس روش کی شرعی حیثیت تو بھی ہو لیکن اس سے کوئی حقیقی عزت وغیرہ کی نگاہ میں تو کیا ہوتی خود اپنی نگاہ میں اپنی ذلت اور احساس کمتری کا پکار پکار کر اعلان ہے اور دنیا کی نظر میں دنیا کی عزت بھی طبعاً وعقلاً انہیں کی ہوتی ہے جن کی نظر میں خود اپنی اور اپنے دینی وقومی شعاً وضع و لباس کی عزت ہو۔

اس کے علاوہ جو مولوی یا مدارس دینیہ کا جو طالب علم، اسکول ماسٹریا اسٹوڈنٹ کی وضع قطع میں نظر آتا ہو اس سے قدرۃ ایک عامی آدمی انگریزی کا خط یا تاری پڑھوانا چاہیگا نہ کہ کوئی فتویٰ یا دینی مسئلہ دریافت کرنے کا

خیال کر لیا۔ آخر جن کے بنائے ہوئے مسٹروں کی بوزنہ وار تقلید میں ہم دیوانے ہیں ان کے مولویوں (پادریوں) کی بھی کم از کم اب تک تو ایک خالص وضع ہی محمود خیال کی جاتی ہے بلکہ دائرہ ہی تک وہ بھی ایک مشنت سے زائد مقدار ہی کی ان کے چہروں کو بھی ایک مذہبی و مقدس جماعت کا چہرہ ظاہر کرتی ہے اس سے بھی بڑھ کر یونیورسٹیاں اپنے طلبہ تک کے لئے خاص خاص یونیفارم مقرر کرتی ہیں لہذا اس فوق تقلید ہی کی دلیل سے سہی اگر ہمارے علماء اور دینی طلبہ کا بھی کوئی یونیفارم ہو تو آخر اس میں کیوں ذلت محسوس کریں۔

حاصل یہ کہ لباس و وضع کا معاملہ خفیف و حقیر ہے کہ نہیں اس کے مصالح و مفاسد دونوں اشد بھی ہیں، اور جنہوں نے اپنے دین کو اعیانہ کے دباؤ سے کچھ آزاد کر لیا ہے ان کی نگاہ میں اظہر بھی اور اتنی تفصیل محض ہماری مغرب زدہ مرعوبیت و عبادت کی بناء پر ضروری ہوئی

عطائے سند میں بے احتیاطی و نقالی

ایک اور بہت بڑا خطرناک مرض تمام مدارس میں نقالی ہی کی راہ یہ پھیل گیا ہے کہ پاس فیل کے کچھ نمبر مقرر کر لئے گئے ہیں جس نے ان کو الٹی ٹیڈ کسی طرح حاصل کر لیا۔ بس اس کے ہاتھ میں عالم و فاضل اور مقتدر دین ہونے کی ایک سند پکڑا دی گئی، نہ سند پکڑاتے وقت علم کی استعداد و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے نہ عمل کے صلاح و تقویٰ کو، اس کی نسبت ارشاد ہے کہ بعض مدارس میں ایسے لوگوں کو سند فراغ دیدی جاتی ہے یا دستار بندی کر دی جاتی ہے جو یا اعتبار علم یا صلاح و عمل کے اس کے اہلے نہیں ہوتے جب ان لوگوں کی علمی و عملی کوتاہیاں دوسروں پر ظاہر ہوتی

ہیں تو سارے علماء کو ان پر قیاس کر کے سب بظنی ہو جاتی ہے تو
 دین کے معاملات میں پھر کس سے رجوع کریں گے۔ کس کے قول پر
 عمل کریں گے پھر دین کا کیا حشر ہو گا۔ تو ان مفاسد کا سبب وہ
 بے احتیاط لوگ ہوتے جو نا اہلوں کو قوم کے سامنے سند دے کر
 اہل ظاہر کرتے ہیں

شاید اس رسالہ کی تحریر کے وقت حضرت علیہ الرحمۃ کی نظر میں بعض مدارس ہی
 ایسے ہیں اب تو کوئی استثناء نظر نہیں آتا اگر اس ایک بات ہی کی اصلاح
 کا پورا اہتمام مدارس دینیہ کر لیں تو انشاء اللہ علم و عمل دونوں اعتبار سے خدمت
 دین کے لئے اوسط درجہ کے علماء کا اوسط بہت بڑھ جائے۔

قواعد کی پابندی میں سستی

تعلیم و تعلم وغیرہ کے معاملات میں اب اکثر عربی مدرسوں میں طلبہ کی خواہش
 و مذاق اور کثرت تعداد کے مقابل میں اصول و قواعد کی پروا کم کی جاتی ہے اس سے
 بھی وہی مذکورہ بالا قسم کے مفاسد پرورش پاتے ہیں اس لئے ضروری ہے
 کہ طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے خواہ ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو جائے، کام
 کے دو چار ناکارہ سودو سو سے افضل ہیں

تجوید و اخلاق کی تعلیم سے غفلت

اکثر مدارس میں تجوید کا علم و عمل داخل نصاب نہیں، اسی طرح اخلاق کی کوئی
 کتاب درس میں نہیں اول کی کمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر طلبہ ملکہ علماء بھی افسوس
 کہ قرآن مجید اچھا نہیں پڑھتے جس پر عوام بھی ہنستے ہیں کتنا بڑا ظلم ہے کہ امام

عالم ہو اور نماز فقہ کی رو سے درست نہ ہو، لہذا طلبہ پر لازم کیا جاوے کہ تجوید علماً و عملاً حاصل کریں۔

راقم سطور اس معاملہ میں ایک بڑی نامی عربی درسگاہ کا تلخ تجربہ درج کر چکا ہے کہ بچوں کے لئے مکتب تو قائم کر دیا گیا اور اس میں قرآن مجید لازم بھی ہے لیکن تجوید کیا معمولی فصیح منہارج ملک کا انتظام نہیں تھا اور نیچے سے اوپر تک کے ذمہ داروں سے عرصہ کرتے کرتے تھک گیا یہاں تک کہ خود اپنے بچے کو وہاں سے ہٹالینے کا بڑا سبب یہی ہوا۔

بڑا نہ مانا جاتے تو اصل یہ ہے کہ ایسی درسگاہوں کے خود اساتذہ و منتظمین اور اکابر کے اندر دین کی فکر و عظمت دونوں کا ایسا زوال ہے کہ سمجھتے ہی نہیں کہ کس کو تاہی کا اثر کتنی دور تک جاتا ہے یہ تو فکر کی کمی ہے، اور اگر سمجھے بھی تو عظمت کی کمی کی وجہ اس کی اصلاح و تدبیر میں مستعدی نہیں فرماتے بلکہ رکیک رکیک عذرات کرتے ہیں

”دوسری کمی (یعنی تعلیم اخلاق کو درس سے خارج کر دینے) کی مضر تیں اس قدر کثیر ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ علماء کی اس فن سے بیخبری کی بدولت جھوٹے مکار پرہیز گئے ہیں جو خلقت و دنیا کو فوج کر رہے ہیں اس لئے چاہئے کہ اخلاق کی کتابوں کو درس میں داخل کریں اور صرف درس اخلاق ہی کافی نہیں، بعد فراغ الترمائط طلبہ محققین اہل اللہ کی خدمت میں حسب گنجائش قیام کریں اور ان سے عملاً آداب اخلاق سیکھیں اور ان کی صحبت سے برکت حاصل کریں اور چند ان کی خدمت میں آمد و رفت رکھیں جس سے کہ نسبت باطنہ ایک گوشتِ راسخ ہو جائے، تب خلق اللہ کے ارشاد کو اپنے ہاتھ میں لیں

انشاء اللہ عموماً عوام اہل اسلام ان سے وابستہ ہو کر جھوٹوں کو چھوڑ دیں گے اور مضمون قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَذَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ط آنکھوں سے نظر آجائے گا۔

بات یہ ہے کہ باطنی اخلاق کی اصلاح و درستی جس کا اصطلاحی نام فقر و درویشی یا تصوف پڑ گیا ہے یہ دین کی روح ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے قلبی و روحانی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور دین بے جان یا نیم جان رہتا ہے لوگوں کو سونے ساکھے دین میں خدا کی توبہ نہیں محسوس ہوتی ورنہ انسان کی عام فطرت تو یہ ہے کہ ہر کجا بولتے خدا می آید خلق را میں بے سرو پا می آید اس لئے جہاں جہل کے باوجود یہ بوجھ موجود ہوتی ہے خواہ زیادہ تر نقلی و نمائشی ہی ہو لوگ پھنس جاتے اور جہل کی گمراہیوں کے ہاتھ تباہ ہوتے ہیں اس لئے علم کے ساتھ تزکیۂ اخلاق کا اہتمام ضروری ہے۔

اس آخر دور میں بھی دہلی کے شاہ ولی اللہی خاندان میں اس اجتماع کے کیسی کیسی عظیم برکات و اثرات کا مشاہدہ ہو چکا ہے، دیوبند کا سلسلہ خیر و برکت بھی اسی اجتماع کا فیض ہے وہاں کے اکثر اکابر و اساتذہ ظاہر و باطن کے جامع کمالات سے ہیں، فرنگی محل لکھنؤ کے بھی بہت سے اکابر دونوں رنگوں کے جامع تھے لیکن اب ہر جگہ اس رنگ کے اکابر کی روز بروز کمی بلکہ فقہ ان ہے، دیوبند و فرنگی محل دونوں پر تو مسلمانوں کا موروثی حق ہے اس لئے ان دونوں حضرات کو خصوصاً اور عام مداحین عربیہ کے حضرات کو عموماً اس جامعیت کے رنگ کو پیدا اور قوی کرنے کی طرف پوری توجہ فرمانے کی ضرورت ہے۔

اصلاح درس و تدریس

قدیم طرز کے مدارس عربیہ کا درس و تدریس بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہو گیا ہے، مولانا عبداللہ گنگوہی کا بالکل حضرت ہی کے اصول و رنگ کا نامہ صحیہ الطالبہ نام ایک مضمون ہے اس میں درس و تدریس سے متعلق اصلاح طلب امور کی جو تفصیل ہے وہ ہمارے تمام قدیم طرز کے مدارس کے اساتذہ و منتظمین کے لئے لفظ بہ لفظ پڑھنے اور توجہ فرمانے کے لائق ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو تحصیل علم کے سامان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ فراہم ہیں۔ کتابوں کو لیجئے کہ حضرت شاہ اسحق صاحبؒ کے درس میں ۲۲ آدمی بخاری شریف میں شریک تھے اور صرف ایک نسخہ تھا سب اس سے نقل کر کے پڑھتے تھے آج ہر درس کی کتاب بلا اس محنت و مشقت کے ہر طالب علم کے پاس موجود ہے لیکن دوسری طرف یہ حال کہ نہ کتاب کی طرف توجہ، نہ اساتذہ سے اُنس، نہ شوقِ طلب، نہ مطالعہ، نہ تکرار، دستارِ فضیلتِ ذیاب سر ہو جاتی ہے اور استعداد کی یہ حالت کہ عبارتِ صحیح نہیں پڑھ سکتے، املا تک درست نہیں (الامشاء اللہ)

اس قابلیت کے خیرات ظاہر ہے کہ درس و تدریس یا افتاء وغیرہ کسی اعلیٰ خدمتِ علم کے قابل نہیں ہوتے کہیں وعظ کو پیشہ بنا لیا کہیں مسجد کے امام بن گئے کہیں الٹی سیدھی طب پڑھ لی وہ بھی چلتی نہیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر کم عقلوں نے سمجھ لیا کہ علم دین کا نتیجہ جب یہی ہے تو اپنی اولاد کو پڑھا کر کیوں برباد دروازا کریں۔ اس کم عقلی کا جواب تو یہ ہے کہ نہ

مدارس اسلامیہ میں بیکار پڑے رہنا بھی انگریزی میں مشغول ہونے سے لاکھوں کروڑوں درجے بہتر ہے اس لئے کہ گویا قوت اور کمال حاصل نہ ہو لیکن کم از کم عقائد تو خراب نہ ہوں گے اور مسجد کی جبار و کشی اس وکالت و بیرونی سے بہتر ہے جس سے ایمان میں تزلزل ہو اور خدا و رسول، صحابہ اور بزرگانِ دین کی شان میں بے ادبی ہو، جو انگریزی کا اس زمانہ میں اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے ہاں جس کو دین ہی کے جانے کا غم نہیں وہ جو چاہے کرے اور کہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربی مدارس کی اصلاح نہ ہو یہ اصلاح بہت ضروری ہے اگر ان کی اصلاح ہو گئی تو ایک عالم کی اصلاح ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ کہ پرانے طریق تدریس سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوتے اور اب بھی کچھ نہ کچھ ذی استعداد مکمل آتے ہیں گو کم ہی ہیں، لیکن اس زمانہ میں طلبہ کی کم توجہی اور قوتِ فہم کی کمزوری کی وجہ سے یہ طریق تدریس کافی نہیں۔

اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا اور مدرس مطلب بیان کر دیتا ہے اگر کسی کو کچھ شبہ ہو اور دریافت کر لیا ورنہ آگے چل پڑے۔ یہ طریق مبتدیوں بلکہ متوسطین کے لئے بھی غایب ہے صرف ایسے منہتی طلبہ کے لئے نافع ہے جو فاضلانہ استعداد حاصل کر چکے ہیں اور بڑے اساتذہ کے ہاں مستفید ہو رہے ہیں۔

اس میں اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے بلا ضرورت ان کی امداد نہ کی جائے خود ان ہی سے یہ مطلب کی تقریر کرائی جاتے نیز ہر قاعدہ و مسئلہ کی کثرتِ امثلہ سے مشق کرائی جائے البتہ جو مقام طلبہ کی استعداد سے باہر ہو اس کی خود تقریر کر دے، یہ طریقوں تو سارے درس

کے لئے مفید ہے ورنہ ابتدائی کتابوں میں تو بہت ضروری ہے، مثلاً میزان
منشعب میں ایسا نہ کیا جائے کہ سبق پڑھایا اور اس کو روٹا کر سن لیا اس سے
کچھ نہیں ہوتا بلکہ ہر سبق کی بکثرت مثالوں سے مشتق کرائی جاتے مثلاً ماضی کی
بحث پڑھائی جاتے تو کم سے کم اس کے تین چار سو مختلف صیغوں کی مشتق
کرائی جاتے اور مصادر دے کر ماضی کے صیغے بنوائے جاتے، اور ماضی کے
صیغوں کی اردو دیجاتے۔ کہ اس کی عربی بناویں اگرچہ اس اجراء میں ایک
ہی سبق میں کمی روز صرف ہو جائیں۔

اسی طرح جب نحو میر تک پہنچے تو ہر قاعدہ کے متعلق چھوٹے چھوٹے عربی
جملے دیکر اردو ترجمہ اور اردو کے جملے دیکر عربی بنوائی جاتے حتیٰ کہ نحو میر کے ختم پر
طویل طویل سلیس عبارتیں اردو کی دے کر عربی بنوائی جاتے اور سلیس
عربی کا ترجمہ کرایا جائے۔ اس طرح جب نحو میر ختم ہوگی تو شرح مائتہ و ہدایت النحو
کی عبارت طالب علم خود صحیح پڑھے گا اور اگر کہیں غلطی کرے تو بتلایا نہ جائے
اس سے خود قاعدہ پر جواب طلب کیا جائے

اس میں شبہ نہیں کہ اگر قدیم طریق میں اتنی اصلاح کر لی جاتے تو وہ جدید
کے بہت قریب آجاتا ہے اور دونوں کا نفع بڑی خوبی سے جمع ہو جاتا ہے
نحو و صرف کی قواعد دانی پر پرائون کا جو اصرار ہے اور جو نفع اس کا بتلاتے ہیں
وہ بھی قائم رہتا ہے اور نیوں کا نحو و صرف کو بے سمجھے خالی رٹانے اور وقت
و ذہن کو خراب کرنے کا اعتراض بھی جاتا رہتا ہے اور ہدایت النحو تک پہنچ کر
یقیناً عبارت خوانی کی کافی استعداد حاصل ہو جائے گی جو رائج الوقت کا فیہ
و شرح جامی تک پڑھ کر بھی حاصل نہیں ہوتی۔

آگے چل کر ہر فن کی تعلیم اسی طریقہ پر ہو، مثلاً بلاغت شروع ہو تو

ہر قاعدہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات اور اشعار جاہلیت نے کر تو اعد بلاغت کو جاری کرایا جائے، اسی طرح فقر میں ہر کتاب کے موافق چھوٹے چھوٹے مسئلے دیتے جائیں کہ بحوالہ کتب ان کے جواب لکھیں و قس علیٰ ہذا۔

اس میں گو پہلے مدت زیادہ لگے گی لیکن استعداد بڑھنے سے جی بڑھیکا اور توجہ زیادہ ہوگی تو آگے چل کر وقت بھی کم صرف ہوگا اور ابتداء کی کسر انتہاء میں مکمل آدے گی۔

البتہ اس طریق اصلاح میں اصلی محنت و توجہ استاذ کو کرنا ہوگی اور ہر درس پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے بھی یہ تجویز فرمائی گئی ہے کہ ایسی درسی کتابیں شائع و مرتب کر دی جائیں جن کے حواشی پر مشقی مثالیں سلیقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ جمع ہوں اور جہاں ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہو چنیدہ کر کے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے تو یہ اس اعتبار سے سب سے ضروری کام ہے کہ لائق و ذی استعداد علماء کے کم ہوتے ہوتے بالآخر علوم دین ہی کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہے جس پر سارے دین کا ہمارا ہے۔

بلکہ اگر ایک دفعہ کچھ سرمایہ فراہم کر کے ایسی درسی کتابوں کی اشاعت کا صرف آغاز کر دیا جائے تو بار بار کسی چندہ کی ضرورت نہیں ہوگی انہی کی فروخت سے آگے کا کام انشاء اللہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔

نیز اس قسم کی اصلاحات سے وحشت و استنکاف کی کوئی وجہ نہیں ایسی ایسی ترسیلات تو ہمیشہ ہوتی رہی ہیں، سلف صالحین و محدثین کا طرزیتھا کہ شیخ خود پڑھتے اور تلامذہ سنتے تھے اس وقت یہی نافع و کافی تھا پھر علماء نے اس طرز کو بدل دیا تلامذہ میں ایک پڑھنا اور شیخ سنتے، اس کے بعد

ممبر مقرر کیا گیا کہ نمبر وار سب پڑھیں اس میں یہ شبہ ہوا کہ جس کا نمبر ہوگا وہی مطالعہ دیکھے گا باقی نہ دیکھیں گے اس لئے یہ کیا گیا کہ جس کو استاد کہے وہی پڑھے، غرض حسب ضرورت طرق تدریس میں ترمیم و اصلاح ہمیشہ سلف سے آج تک ہوتی رہی تو اب اس سے خواہ مخواہ پھر کھنکھنے کی کیا وجہ؟

اصلاح اعمال و اخلاق

یہ تو علمی و تدریسی اصلاحات کے متعلق تھا عملی و اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی اصلاح و تدارک کی طرف بہت خاص توجہ و اہتمام کی ضرورت ہے ان میں دو باتوں کا خصوصاً ذکر فرمایا گیا ہے۔

دو ایک بے ریش لڑکوں کا فتنہ ہے اس لئے مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ دس دس، بیس بیس لڑکوں پر ایک معلم نگران مقرر ہو جو ان امور کی نگرانی رکھے کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے، نگران سے الگ ہو کر آپس میں باتیں نہ کریں ان کے نام جو خطوط آئیں وہ بھی دیکھ کر دے ان کے سر منڈاتا ہے پان نہ کھانے دے لباس سادہ ہو، اگرچہ امراء کے بچوں کا قیمتی ہو نماز و جماعت میں ان کی حاضری کی فکر رکھے، تفریح یا کسی ضرورت سے بازار جاتیں تو ان کے ساتھ ہے ان باتوں کی خلاف ورزی پر مناسب سزا دے۔

نئی روشنی کے اثرات

دوسری نہایت قابل افسوس چیز نئی روشنی یا نیچریت کے اثرات ہیں جو ہر صنف و طاعون کی طرح پھیل گئے ہیں جس سے بہت کم نفوس محفوظ ہیں عربی مدرسوں کے طلبہ بھی ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں الحمد للہ کہ ابھی عقائد پر تو زیادہ اثر نہیں پہنچا ہے لیکن پہلی سی سادگی دبے تکلفی جاتی رہی ہے وضع قطع سے مسٹر یا نیم مسٹر معلوم ہوتے ہیں نہ چہرہ پر تقویٰ کے انوار نہ بات چیت میں تواضع کے آثار، کتابوں میں جی نہیں لگاتے نہ مطالعہ سے کام نہ تکرار سبق سے سروکار، مقرر بننے کی فکر، اخباروں اور پرچوں میں مضمون نگاری کی دھن، تاویل یہ کہ ضرورت زمانہ سے مجبوری ہے کہ تبلیغ کے لئے تحریر و تقریر نے رنگ و مذاق کی ہو۔ اس کی ضرورت مسلم، لیکن اس کے اندر جو خفیہ مقاصد ہیں ان پر اطلاع ضروری ہے بخیر یہ ہے کہ ایسی تحریر و تقریر بالعموم جب جاہ پیدا کرتی اور اخلاص کے رنگ کو مٹاتی ہے اور طالب علمانہ رنگ و سادگی قلب سے دور ہو کہ صرف عبارت آرائی اور دعوے ہی دعوے رہ جاتے ہیں اس لئے عام طلبہ کو عموماً ایسی تقریر و تحریر اور فی روشنی والوں کے ساتھ افادہ یا استفادہ کی نیت سے ملنے سے قطعاً روکا جائے کچھ اپنا رنگ چڑھانے کے بجائے خود ان کے رنگ میں رنگ جائے ہیں البتہ تبلیغ احکام اور مخالفین کے مضامین کو تحریراً و تقریراً رد کرنے کے لئے ایسے مہتمی طلبہ کو منتخب کیا جائے جن کے ظاہر

دباطن میں کچھ تو دین کی طرف خاص میلان موجود ہو اور پھر ان کو حضرات اہل اللہ کی خدمت میں رکھا جائے جس سے ان کا اخلاص راسخ اور ان کے اخلاق کی درستی ہو، یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ عرفی صوفی ہو جائیں اور ضربیں لگانے لگیں بلکہ ان کی صحبت سے انشاء اللہ اخلاص کا کچھ حصہ ضرور مل جائیگا حسب استعداد جب کافی مدت تک ان کی خدمت سے مستفید ہو لیں تب ان کو تحریری و تقریری تبلیغ کے منصب پر مقرر کیا جائے، اس وقت ان کی تقریر و تحریر نئے پرانے کسی طرز کی بھی انشاء اللہ مفید ہی ہوگی مضر نہ ہوگی باقی جو لوگ بے اس کے آج کل کے مذاق کی تحریر و تقریر کے عادی ہوئے ہیں وہ یاد رکھیں کہ خود کاتب و مقرر کی بڑائی کا کچھ اثر بے وقوفوں پر ہو جاتا ہے ورنہ اصلاح یا تبلیغ جو بتائی جاتی ہے اس کا اثر برائے نام ہی ہوتا ہے۔

عام مدارس کے ساتھ کاش یہ چند سطریں خاص طور سے اکابر ندوہ کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں، اراقم احقر کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کے وقت اگر علما و تجربہ نہیں تو کشف و الہاماً خصوصیت کے ساتھ ندوہ ہی پیش نظر تھا

مختصر نصاب

علوم دینیہ کے نصاب تعلیم و تدریس میں ایک اور بڑی اہم اصلاح و تجدید کی ضرورت یہ تھی کہ اس کے لئے کوئی ایسا مختصر راستہ تجویز کیا جائے جو بقدر ضرورت کافی بھی ہو اور اتنی مدت نہ صرف ہو کہ علوم معاش کی تحصیل کا عذر اس کی تحصیل سے لوگوں کو مانع ہو۔ حضرت جامع المسجدین کی تجدیدی جامعیت نے اس ضرورت کا بھی پورا احساس فرمایا اور صرف نظری خاکہ پیش نہیں کیا بلکہ ”تلخیصاً عشر“ کے نام سے مروجہ نصاب کا دیگر ضروری اصنافوں مثلاً اخلاق

وفلسفہ جدیدہ وغیرہ کے ساتھ ایسا عطر کھینچ دیا ہے کہ اس بحث کی گنجائش بھی نہیں رہی کہ کونسا علم و فن قدیم نصاب کا تقییل مدت کی ضرورت سے سرے سے خارج کر دیا جائے اور لوگوں کو یہ وسوسہ و اعتراض باقی ہے کہ فلاں چیز کے بایک لکل جانے سے فلاں خاص خامی رہ جائے گی۔

اس نصاب میں تمام چیزیں تجوید سے لے کر صرف و نحو، معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، عقائد و کلام، مناظرہ و ہدیت، تفسیر و حدیث، اصول فقہ، اخلاق و تصوف، سب ہی کا اتنا ضروری حصہ اور ایسا ملخص موجود ہے کہ ضروری ضروری مسائل سب کے آگئے ہیں اور حضرت کی مقررہ ہدایات کے مطابق ان کی تعلیم ہو تو انشاء اللہ العزیز ہر فن سے اتنی مناسبت حاصل ہو جائے گی کہ پھر جس میں چاہے آگے تکمیل کر سکتا ہے یا ذاتی مطالعہ سے استعداد پڑھا سکتا ہے یہ پورا نصاب کم و بیش تین سال کی مدت میں پورا ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں کہ اس کی بدولت اس قلیل مدت میں سارے علوم دینیہ عربیہ فی الجملہ واقفیت و مناسبت پیدا ہو سکتی ہے اور ساتھ ہی دینی تربیت کا بھی ان تین سالوں میں اگر پورا اہتمام رکھا جائے تو پھر علوم معاش یا دنیوی علوم میں مشغول ہونے سے بھی انشاء اللہ ایمان و عمل ایسا برباد نہ ہوگا کہ اسلام کے نام کے سوا اس کا کام کوئی نہ رہ جائے بلکہ خود ان دنیوی و معاشی علوم کی فہم و قابلیت اور ان میں عسر و ترقی کے لئے ذہن میں ایک مضبوط و مستحکم بنیاد قائم ہو جائے گی اس پر بھی اسرار و غریب اگر سب ہی معاش و معاد دونوں کے جامع منافع کے لئے اس کو بسیک نہ کہیں تو غ

ہی دستاں قسمت را چہ سود از رہبر کامل
ذیل میں اس تجویز و تجدید کے مقصد و مطلب کو مختصراً خود حضرت مجدد کی زبان

سے بھی سُن لینا چاہتے جو اسی نیکو صفت عشر کی تہید سے مانو ذہ سے سب سے پہلے
اس پر تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ یہ نصاب کوئی ایسی بدلت طرازی نہیں جو قدامت پسند
حضرات کے لئے موجبِ دُشمنی ہو۔

”بلکہ نصاب قدیم کی دینیات مقصودہ یعنی تفسیر و حدیث و فقہ و کلام
و فرائض کی ضروری کتابوں کی تحصیل کو زوائد پر مقدم کر دیا گیا ہے
اور جو کچھ یہ علوم بعض فنونِ آئیمہ صرف و نحو و معقول و اصول پر موقوف ہیں
لہذا ان سے پہلے پہلے یہ رکھ دیئے گئے ہیں اس لئے یہ نصاب قدیم ہی کا
ایک جزو ہے۔“

اس کے بعد اس مسئلہ تجویز کا اصل مقصد ملاحظہ ہو جس کی دو غرضیں بیان فرمائی
گئی ہیں۔

”اول جن لوگوں کو تحصیلِ معاش کی ضرورت یا کسی اور وجہ سے مہلت
کم ہے اور ساتھ ہی علوم و دینیہ میں فاصلانہ استعداد حاصل کرنے کی
رغبت اور شوق ہے مگر متعارف درسیات کی تطویل دیکھ کر ہمت
پست ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ ترکِ محض ہوتا ہے ان کی تنگی رفع ہو
جاتے گی۔ دوسرے جو لوگ علوم و دینیہ کے لئے فارغ بھی ہیں ان کو بھی
اتفاقاتِ زمانہ سے کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا وقت نہیں ملتا اور
درمیان ہی سے چھوڑ دینا پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس قدر وقت
ملا تھا وہ علوم آئیمہ میں صرف ہو گیا اور اصل مقصود محروم ہی رہے
اس جدید نصاب یا طریق سے اس محرومی کا بھی تدارک ہو جاتا ہے۔“

لہذا اس مصلحت کے پیشِ نظر عام اور رائج الوقت تطویلِ نصاب پر ہر حال میں
اس مختصر نصاب کو مقدم رکھنا انسب ہے، اس کے پورا کرنے کے بعد۔

اگر وقت مساعد ہو تو بقیہ درسیات کو پورا کر لیا جاسکتا ہے نیز چونکہ
اس شخص کی استعداد میں ایک گونہ قوت زیادہ ہوگی اس لئے بقیہ درسیات
پر سرعت و بصیرت سے عبور کر سکیگا اور اگر وقت نہ ملا تو اصل مقصود کو
حاصل ہی ہو چکا اگر توجہ کرے گا تو چونکہ مطالعہ کا ملکہ پیدا ہو چکا ہے کتب
بینی سے اپنی استعداد و تبحر کو جہاں تک چاہے ترقی دے سکتا ہے۔“

ایسی صورت میں چاہئے تو یہ تھا کہ دیوبند، سہارنپور، نظامیہ (فرنگی محل، ندوہ
وغیرہ سب ہی بڑی بڑی درسگاہیں اپنے ہاں بطور ایک شاخ بلکہ بطور ایک جڑ اور
بنیاد اس کا التزام لازماً کرتیں تاکہ ایک طرف طالبانِ دنیا پر طلبِ دین کی حجت قائم
ہوتی اور دوسری طرف خود ان درسگاہوں کے فیض و فائدہ میں وسعت ہوتی اور جو
لوگ تین چار سال سے آگے کی ہمت و فراغت رکھ کر لوہی تکمیل کرنا چاہتے ان کے
لئے یہ شاخ اسی طرح جڑ کا کام دیتی جس طرح دنیوی تعلیم کا میٹرکولیشن معمولی
نوکرہ لویں وغیرہ سے زیادہ حوصلہ رکھنے والوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی بنیاد کا بھی کام
دیتا ہے۔ بلکہ اگر اس طرز کے سہ سالہ مدارس مستقلاً جا بجا ملک میں کثرت سے قائم
ہو سکیں اور دنیوی یا معاشی مدارس میں جانے والے مسلمان بچے پہلے اس کی تکمیل
کر لیا کریں تو انشاء اللہ ایک ہی نسل میں اس ”بیک کہ شمشہ دوکار“ کے دینی و دنیوی
منافع کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ ان سہ سالہ بنیادی مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ
دینی تربیت کا بھی اہتمام لازم ہو تو ان کے طلبہ دین و دنیا جہر بھی جائیں گے
خدا سے امید ہے کہ وہی آگے ہوں گے

کاش ہمارے پاکستانی علماء اور دین دوست حضرات حکومت پاکستان
کو اس طرف متوجہ فرما سکتے تو ایک ہی نسل میں پاکستان تمام ناپاکیوں سے پاک
ہو کر واقعی پاکستان بن جاتا۔ ذہنی و قلبی انقلاب کا بڑا دار و مدار تعلیم و تربیت

ہی پر ہے اگر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کوئی انقلاب پیدا کرنا ہے تو اس کا راستہ پاکستان و ہندوستان بلکہ ساری دینائے اسلام کے لئے اس کے سوا نہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت کی اساس اسلام ہو، یہ بنیاد اگر کج ہے تو پھر تاثریامی رو دیو لو اور کج کے نتیجہ کو کوئی سیاسی و انتظامی طاقت نہیں روک سکتی۔

لیکن اس محرومی کا کیا علاج کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے سر پر مغربیت یا فرنگیت کا جادو ایسا سوار ہے کہ اسلام کا نام لے کر بھی ان کی سمجھ میں کام غیروں ہی کا آتا ہے۔

تجربہ یہ ہے کہ خود اہل دین اور دینی مدارس کے اکابر تک کا دل و دماغ اس درجہ مسحور ہو رہا ہے کہ دین کی سیدھی بات سمجھنا اور سیدھی راہ پر چلنا ان پر شاق ہو رہا ہے۔
 اِنْ يَكُودُ اسْبِيلَ التَّمْشِدِ لَا يَتَّخِذُ وُجُو سَبِيلًا وَاِنْ يَكُودُ اسْبِيلَ النُّعْيِ يَتَّخِذُ وُجُو سَبِيلًا (اعاذنا اللہ منہ)

بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی ایک صورت اور حضرت جامع المجددین کی زندہ کرامت ہے کہ حضرت ہی کے ایک مستعد جوان صالح خادم اور مجاز بیعت (مولانا ابراہیم الحق سلمہ اللہ تعالیٰ) نے اللہ کا نام لے کر اس راہ میں قدم اٹھایا ہے اور اپنے وطن ہر دوئی میں اشرف المدارس کے نام سے رہنمائی کا نشان کھڑا کر دیا ہے جس کا اصل مقصود حضرت مجدد وقت کی اس مذکورہ بالا مجددانہ تعلیمی تجویز کی تکمیل ہے بڑی بات یہ ہے کہ تربیت کی طرف تعلیم سے کم نہیں زیادہ توجہ ہے یہ سنی سنائی نہیں بلکہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بناء پر عرض کیا جا رہا ہے اور خود اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے باب میں بڑی بڑی نامی گرامی جگہوں سے ٹھوکریں کھا کر اور سالیوس ہو کر بالآخر حضرت جامع المجددین کی اس زندہ کرامت کے دامن میں پناہ ملی، ورنہ ایک بڑے خاندانی مٹانے زادہ اور خود دین دار صاحبِ علم و فضل

میرزا محمد رفیع

لے مگر اہل ثروت کی بے توجہی اور مدرسہ کا خود اپنا مکان وغیرہ ہونے سے قریباً سارے مصارف کا

نے تو اس سلسلہ میں ایک مخدوم بزرگ کی مثال پیش کر کے یہاں تک تحریر فرمادیا تھا کہ فلاں صاحب دین و دولت بزرگ باوصف غایت دینداری اپنی اولاد کو کالج ہی میں تعلیم دلا رہے ہیں۔ اور متوسط و غریب طبقہ کے لئے اس سے چارہ نہیں کہ موجودہ تعلیم کو اختیار کرے یا اولاد کو نرا جاہل رکھ کر کارخانوں کا مزدور بننے پر مجبور کرے جہاں بے علمی کے ساتھ بے اخلاقی و بد اخلاقی کا بھی شکار ہوں باقی ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے دعا کریں اِنَّا لِلّٰہ۔ ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے صرف دعا۔

مگر یہ نادان اس فتوے پر کیسے عمل کرتا جب کہ اس کے مشاہدہ و تجربہ میں خود ابناء کے لئے بھی خالی دنیا کے علم سے نرا جاہل بہتر اور دین کے حق میں کمتر ضرر رساں ہے کیونکہ اس جاہل میں کچھ بُرا عیلا ایمان و اعتقاد تو سلامت رہ جاتا ہے اور اس اعتبار سے کارخانہ کا مزدور بن جانا کو نسل کے ممبر بن جانے سے بدرجہا اہم ہے خود حضرت مجدد کے افادات اس بارے میں آگے تعلیم انگریزی کی تحقیق میں آتے ہیں

ہماری عام عمری و دینی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی بڑی کمزوری و غفلت یہی ہے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت و عمل کا بہت کم اہتمام و التزام فرمایا جاتا ہے بلکہ گویا طالب علمانہ زندگی کو عملی آزادی کا پرواز (لائسنس) خیال کیا جاتا ہے یہ تصور بھی فرنگی طالب علمی کی برکات میں ہے۔ اور اگر کوئی اس پر معترض ہو تو غلطی کو غلطی کے لئے حجت بنایا جاتا ہے کہ ”آپ بھی اپنی طالب علمی کو یاد کریں۔ حالانکہ موٹی بات ہے کہ تربیت کی بنیاد کو بچتہ کرنے کا زمانہ تو طالب علمی کے سن سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے تو عین علم دین کی تحصیل کے زمانہ میں عمل دین سے غفلت و مسامحت کیسے روا ہو سکتی

(بقیہ از صفحہ سابقہ جانشین) بار طلباء وہی پر پڑ رہا ہے جس کو معمولی کیا متوسط درجے کے سرپرست بھی برداشت نہیں کر سکتے جس کی وجہ سے نفع محدود ترقی محدود اور بقاء خطر میں ہے۔

خود حضرت علیہ الرحمۃ نے تو بے عمل طالب علموں کو سند فراغ و تکمیل دے دینا موجب مؤاخذہ قرار دیا ہے تلخیصات عشر کی تمہید میں اس مختصر نصاب کی تحصیل کا جو دستور العمل تحریر فرمایا ہے اس کا آخری نمبر (۱۰) بھی یہی ہے کہ جو کچھ پڑھے اس پر پورا عمل کرتا ہے۔

دینی نصاب و تعلیم کی مقدار و مدت میں اختصار و تسکین کی اس مجددانہ تجویز کی جو اہمیت و حاجت حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی نگاہ میں ہے اس کا مزید اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کو حذف فرما کر یا ان کا بدل تجویز فرما کر ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سبب سے اور زیادہ اختصار کا طالب ہو تو ایسے شخص کے لئے یقیناً تین سال میں سے اور چھ ماہ گھٹ جاویں گے۔

پھر آگے ارشاد ہے کہ :-

اگر کوئی شخص صرف اپنی اصلاح و نجات آخرت کے لئے کتب دینیہ کو عربی زبان میں پڑھنا چاہے تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہ سمجھے یا علوم عقلیہ سے دلچسپی نہ ہو اس کے لئے اس درس کا ادب بھی اختصار ہو سکتا ہے یعنی صرف و نحو کی کتب مندرجہ کے بعد فوری کامل اور سراجی اور متن معانی اور تجوید اور تلخیص البدایہ اور متن عقائد نسفیہ اور تیسیر یا مشکوٰۃ اور جلالین کافی ہے۔“

حنن کی عمر زیادہ ہو چکی اور مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم کی نہ رہی ہو اور عربی ہی ذریعہ سے علوم دینیہ کے حصول کا شوق ہو جس میں وقت بھی زیادہ صرف نہ ہو اور قابلیت بقدر ضرورت پیدا ہو جائے اس کے لئے بھی ایک ہی مختصر و مناسب نصاب تجویز فرمایا ہے کہ

اول ایک کتاب ادب کی پڑھاوے خواہ مفید الطالبین ہی ہو

مگر اس میں صرف ونحو کے قواعد کو بھی ساتھ ساتھ جاری کرتا جائے
 اور ایسے قواعد کچھ زیادہ نہیں پندرہ بیس ہوں گے جس سے صرف اتنا
 معلوم ہو جائے کہ اس کلمہ پر زیر زبر کیوں ہے اس کے بعد قرآن شریف
 کا ترجمہ اسی طرح ہو کہ اس میں بھی قواعد جاری کرائیں اور ایک کتاب
 حدیث شریف کی پڑھادی جائے مثلاً مشارق الانوار کہ بہت بڑی
 بھی نہیں اور ایک کتاب فقر جیسے قدوری اس کے بعد یا ساتھ
 دو تین کتابیں صرف ونحو کی بھی پڑھادی جائیں اس سے مناسبت
 پیدا ہو کہ ضروری کتابوں کا مطالعہ بہت سہل ہو جائے گا۔

ادارہ تعلیمات اسلام (لکھنؤ) نے مولانا عبدالسلام صاحب ندوی
 کے زیر نگرانی و ہدایت قریب قریب یہی نصاب و طریق اختیار کر رکھا ہے بلکہ
 اس میں ابتداء ہی کلام مجید سے ہوتی ہے اور قواعد کے ساتھ ساتھ اجراء کے
 علاوہ مستقل نحو و صرف کی کسی کتاب کی بھی تجربہ سے ضرورت ثابت نہیں ہوئی
 اور الحمد للہ کامیابی ہوئی لیکن افسوس کہ یہ تعلیمی ادارہ ہے تربیت کا کوئی اہتمام
 و انتظام نہیں نہ مدرسہ کی شکل ہے نہ کوئی دارالافتاء، اس لئے افادہ بہت
 محدود اور تعلیم بالعمان کے ایک مختصر ادارہ کی شکل ہے

لیکن نفس اپنی اصلاح و نجات آخرت کے لئے چونکہ عربی زبان میں بھی
 پڑھنا لازم نہیں۔ اس لئے مزید ارشاد ہے کہ

جو عربی زبان کی قید بھی ضروری نہ سمجھے اس کے لئے صرف ہشتی
 زیور کے پانچ حصے اور مفتاح الجنۃ اور صفائی معاملات اور
 تعلیم الدین اور فروع الایمان اور جزاء الاعمال اور اصلاح الرسوم
 اور قیامت نامہ اور دو شاہ رفیع الدین اور حقوق الاسلام اور

سراج السالکین اور تواریح جیب اللہ اور مال تہذیب کے سب جہتے
 اور عورتوں کے لئے بلکہ کم فرصت مردوں کے لئے بھی بہشتی زیور
 کے سب حصے پڑھ لینا اور ضرورت کے وقت علماء سے رجوع کرتے
 رہنا کافی ہے۔

بہر نوع دینی تعلیم اختصارِ نصاب و تقلیلِ مدت کی یہ اصلاح و تجدید اتنی ضروری
 ہے کہ حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک سارے عربی مدارس اور ان کے سارے طلبہ کیلئے
 اس کی تقدیم مناسب ہے حتیٰ کہ اگر

کسی وجہ سے سب کے لئے علی الاطلاق تقدیم نہ ہو تو اقل درجہ حضرات
 علماء و اہل مدارس اسلامیہ دامت فیوضہم و برکاتہم اس قدر التزام کی
 تکلیف گوارا فرمائیں کہ جن کی حالت اپنی تحقیق یا ان کے استفسار سے
 اس تجویز کے مصالح مذکورہ بالا کی بناء پر تقدیم کی مقتضی پادیں تو ان
 کے لئے ایک جداگانہ جماعت قائم کر دیں تو اس سے اہل حاجت
 کی رعایت کا ثواب بھی ملیگا اور امید ہے کہ مدارس میں طلبہ بالخصوص
 امیرزادوں کی ترقی ہو جائے اور کوئی طالب علم باوجود کمی وقت کے
 محروم نہ رہے اور جو اہل وسعت اساتذہ کو مکان پر بٹھلا کر اس طرز
 سے تعلیم دلانا چاہیں استعداد کو یہ نقشہ دے کر اس کی پابندی کیلئے
 فرمائش کر دیں۔

کاش اسراء اور اہل وسعت میں عین کی اتنی ہی ہوتی کہ وہ اس رعایت کو رعایت
 سمجھیں اور دنیا کی ترقی کے ساتھ اپنی اور اپنی اولاد کی آخرت کی فلاح و نجات سے
 اتنی بے فکر نہ ہو کر گویا مرنے کے بعد کچھ ہونا ہی نہیں۔ اگر اس دنیا کی ۶۰-۷۰ سال
 کی غیر یقینی زندگی کے لئے (اور اتنی غیر یقینی کہ یقین ایک پل کا بھی نہیں) ہم اپنی اولاد

کو ۲۵-۳۰ سال تک مسلسل تعلیم میں جوتے رہتے ہیں تو کس منہ سے آخرت پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں جب کہ آخرت کی یقینی وابدی زندگی کو سنوارنے والی تعلیم و تربیت کے لئے ڈھائی تین سال بلکہ ڈھائی تین ماہ مہینے سے بھی گریز کریں

مسئلہ معاش

ایک مخدوم بزرگ جو خود ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں اور ایک معروف بزرگ و شیخ کی قائم کردہ خالص دینی درسگاہ میں ناظم ہیں اور اسی درسگاہ میں خود اپنے ایک بچے کو قرآن حفظ کرا رہے ہیں، باوجود اس کے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ”یہ تو بتاؤ کہ آخر حافظ و عالم ہو کر کھائیں گے کیا“

اسی طرح ایک اور مخدوم و مخدوم زادہ بزرگ جن کا ہندوستان کے ایک مشہور و مسلم خاندان سے قریب ترین تعلق ہے جس کا فخر و امتیاز نسب لہا نسل تک علوم و دینیہ ہی کی طلب و خدمت رہا اور جو ابھی ایک ہی پشت پہلے کے ایک ایسے صاحب تقویٰ و توکل مشہور و مسلم شیخ وقت کے صاحب سجادہ ہیں جن کے یہاں فاقہ ہو جانا بھی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ ان مخدوم کے ایک صاحبزادے جب ایم اے ہو کر ملازمت اور اس کے لئے سعی و سفارش میں سرگردان و پریشان تھے تو ایک موقع پر احقر نے اپنے ان مخدوم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے آخر اپنے خاندان کے دینی علم و توکل کے سلسلہ سے اولاد کو ہٹا کر اس دنیوی تعلیم و تذلیل کو پسند کیوں فرمایا جواب وہی کہ دین اور علم دین کا پلو چھنے والا اب کون ہے اور اس کو حاصل کر کے کھاتے کہاں؟ احقر نے عرض کیا کہ اس سے تو تجارت اور کاروبار کی کوئی راہ اہوں و اسلم

ہوتی۔ اس کا جواب واقعی بڑا پرمعنی اور پر لطف عطا فرمایا کہ
میاں تجارت بڑی محنت و مشقت، ہوشیاری و بیداری کا کام ہے
ہم تو بس ملازمت ہی کے رہ گئے ہیں کہ سوتے جاگتے بڑی بھلی طرح تیس
دن کے بعد کسی پر کچھ واجب ہو جائے۔“

اس میں شک نہیں کہ ملازمت کا یہ بہترین ترجمہ ہے، میمن، بوہڑے وغیرہ نسلا
نسل کی تجارت پیشہ مسلمان جماعتوں کا ذکر نہیں ورنہ عام مسلمانوں خصوصاً آخوندوں
کو دیکھا کہ نوکری تو وہ بڑی بھلی طرح بنا کر اور تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب کر کے
وصول کر لیتے ہیں لیکن تجارت میں اکثروں کا دیوالہ ہی نکلتے دیکھا۔

غرض جب خود ایسے ایسے خاندانی مشائخ اور دیندار علمائے دین تک اپنی اولاد
کو تعلیم دین سے یہ ڈر کر دور رکھتے ہیں کہ علم دین کو حاصل کر کے کھائیں گے کہاں سے
تو پھر ماوشمایا امرا کا ذکر ہی کیا جو خاندانی دیندار اور دینی تعلیم دہوایات کیسر محروم ہیں
ایسے دیندار اور دیندار دونوں قسم کے مسلمانوں کی خدمت میں عرض ہے کہ
”کھائیں گے کہاں سے“ یہ خوف وہی خشیت اطلاق (خوف افلاس) ہے جس کی
بنا پر جاہلیت کے مشرکین اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتے تھے اتنا فرق ہے کہ وہ اس
خوف سے اپنی اولاد کی چند روزہ دنیا کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے تھے اور ہم ہمیشہ کی
اخروی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ آج بھی جاہلیت جدیدہ میں ضبط تولید کی رجحان
اولاد کی خفی شکل ہے، بڑی دلیل یہی بیان کی جاتی ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے
اتنے آدمی آخر کھائیں گے کہاں۔“

اس کا حقیقی جواب نئے اور پرانے سب جاہلوں کو قرآن نے جو دیا ہے وہ
ایسے مسلمانوں کے لئے اور زیادہ حقیقی ہے جو خوف افلاس کی بناء پر اپنی اولاد کو
تعلیم دین سے محروم رکھ کر دنیا کی غیر یقینی زندگی کو بنانے سے زیادہ آخرت کی یقینی

زندگی بگاڑتے ہیں، جواب یہ ہے کہ تمہاری اولاد کو بھی وہی رزق دے گا جس نے تم کو دے رکھا ہے (نَحْنُ نَزِدُّهُمْ وَأَنَّا كُمَّ) اگر ہم کسی درجہ میں مسلمان ہیں اور قرآن پر ہمارا کچھ بھی ایمان ہے تو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کے خدانے انسان کو کھانے کمانے کی فکر میں قما ہو کر مرنے کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ ہمارا زیستن برائے خوردن نہیں بلکہ خوردن برائے زیستن ہے اور زندگی کا اصل مقصود عبدیت و بندگی کے فرائض کی ادائی ہے، صاف صاف دو ٹوک ارشاد ہے کہ

مَا خَلَقْتُ الْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِي مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِّنْ تَرْغُفٍ وَمَا أُرِيدُ أَنِّي تُطْعَمُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝

میں نے جن وانس کو محض عبدیت و بندگی کے لئے پیدا کیا ہے رزق کی فکر کے لئے نہیں پیدا کیا ہے اور نہ اس لئے کہ مجھ کو کھلائیں، رازق تو سب کا صرف اللہ ہی ہے، وہی رزق رسائی کی سچتہ قوت رکھتا ہے۔

باقی اپنی بندگی و عبدیت کو جھلا کر رزاقیت کی تدبیر و قوت کے مدعی انسان کی درماندگی کا تماشہ جو مسلسل سالہا سال سے دیکھا دکھلایا جا رہا ہے تاریخ نے تو کب دیکھا ہوگا لیکن آج ہر آنکھ والے کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو زیستن کا مطلب تمام تر خوردن قرار دے لیا گیا ہے اور حکومت و سیاست سب کا اصل مطلب و مقصود پکار پکار کر فحش و فحش پر مبنی کپڑا بتایا جا رہا ہے دوسری طرف عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں اور خصوصاً اس کے بعد ساری دنیا جس طرح عالمگیر قحط کے چنگل میں پھنسی ہے اس کے ازالہ کی ہر روز ہر حکومت کی جانب سے طرح طرح کی تدبیروں کا اعلان کیا جا رہا ہے فراہمی غذا کی مستقل وزارتیں اور محکمے قائم ہیں ہر دن قومی و بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں ساری حکومتوں نے راشن بندی

کر رکھی ہے یعنی ٹاپ تول کر دو وقت کا بڑا اچھلا غلہ حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اکثر صورتوں میں انسان کی معمولی مقدار غذا کا نصف سے زیادہ نہیں ہوتا ہے اس پر بھی وقتاً فوقتاً تخفیف و تقلیل کی دھمکی اور اطلاع شائع ہوتی رہتی ہے کہ بس ایک مہینہ یا دو مہینہ کا غلہ رہ گیا ہے اور آئندہ فلاں مہینہ بڑا نازک آئو والا ہے امریکہ جو دنیا کا سب سے دولت مند و خوشحال ملک ہے ابھی (۴۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے) پانیر میں وہاں کے غذا و زراعت کے ڈائریکٹر جنرل کا بیان چھپا ہے کہ

اس موسم سرما میں ایسے شدید قحط سے دوچار ہونا ہے جو دنیا میں کبھی نہ پڑا ہوگا اور جس کا مقابلہ ہر طرح کی معاشی تدابیر اور قومی و بین الاقوامی اجتماعی جدوجہد ہی سے ممکن ہوگا۔

انسان نے جس طرح اپنے خالق سے منہ موٹا ہے اس کی سمجھ میں تو آنا اب مشکل ہے لیکن راقم ہذا کو یہ روز افزوں و عالمگیر قحط نہیں بلکہ عالمگیر قحہر ہی نظر آ رہا ہے اور قرآن مجید میں جا بجا جو رزق و رزاقیت کا ذمہ بالکلہ حق تعالیٰ نے خود لے کر، نہ صرف یہ کہ انسان کو عبدیت و بندگی کے لئے فارغ و بے فکر فرمانا چاہا ہے بلکہ خود کیجئے تو اس دنیا میں اس کی سب سے جامع الصفات صفت ربوبیت کا سب سے بڑا اور نمایاں مظہر رزاقیت ہی ہے اور انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر بالکلہ اپنے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر نہ صرف اللہ تعالیٰ کی اس صفت خاصہ میں اپنے کو شریک و شہیم ٹھہرا رہا ہے بلکہ دراصل خدا کی خدائی چھین کر خود خدا بن بیٹھا ہے اس کے بعد اگر اس کا قہر و عذاب اسی قبض رزق کی راہ سے ظاہر ہو تو عین سنتہ اللہ ہے۔

اپنا تجربہ تو اپنے عزیزوں دوستوں کے انفرادی واقعات تک میں یہی ہے کہ جو بھی خود کو لگا اس کو بھی تجربہ ہوگا کہ معاش و رزق کا معاملہ کچھ مہنت حَیْثُ لَا يَحْتَسِبُ ہی ظاہر ہوتا ہے اور تدبیر کے تیر بالعموم اپنے نشانہ

سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں بارہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں بھی طالب علمی میں جن کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا وہ کچھ نہ ہوتے اور جن کو انہوں سمجھا گیا وہ ان ہونہاروں سے میدان معاش میں کہیں آگے نکل گئے، یہی تجارت وغیرہ ہر چیز میں مشاہدہ ہو رہا ہے کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں وہ رہ جاتی ہے اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں وہ چل جاتی ہے باقی یوں نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال ہی لئے جاتے ہیں

بڑی ایمانی خامی

الغرض کوئی اور سمجھے نہ سمجھے مگر مسلمان کو اس کے سوا سمجھنے کا کیا حق ہے کہ رزق یا معاش کی تنگی و فراخی، قبض و بسط، عطا و منع بالکلیہ ان کے رب کی ربوبیت و مشیت پر منحصر ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ
أَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ إِنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ

وَيَقْدِرُ - وغیرہ آیات کثیرہ نے اس باب میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ رزق کے ظاہری اسباب بس ظاہری سے زیادہ نہیں اس لئے غیروں کی طرح ان میں اتنا غلو و فنا کہ گویا اسباب و تدابیر ہی حقیقی رزاق ہیں نہ اسلام ہے نہ اسلام کے خدا پر ایمان اور نہ حقیقی اسلام اور نہ حقیقی مسلمانوں کی تاریخ و زندگی ہے اس کی شہادت ملتی ہے یہ تو دراصل زبان سے خدا کا اقرار اور عمل سے اپنی خدائی کا اعلان ہے اس قسم کے تصورات کو جب تک دماغ سے بدر نہ کر دیا جاتے اس وقت تک اسلام کی دینی و دنیوی برکات اور انفرادی و اجتماعی ثمرات کی توقع کا حق ہی کیا حاصل ہے۔

بڑی خود فریبی

یہ تو اس سوال کی کہ عربی یا دینی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا۔ بڑی خطرناک ایمانی و اعتقادی خامی تھی۔

ایک دوسری بڑی خود فریبی اور مغالطہ یہ ہے کہ کھانے سے مراد ضروریات زندگی سے زیادہ فضولیات زندگی ہوتی ہیں یعنی ہم نے کھانے پینے، پہننے پہننے شادی بیاہ، مکان اور سامان زندگی کے تمام جاری و وقتی مصارف کا ایک خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے جب تک وہ پورا نہ ہو اس وقت تک ہم سمجھتے اور کہتے ہیں کہ کھانے ہی کو نہیں مل رہا ہے حدیہ کہ امرات تک سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر آپ کو اس کی کیا حاجت ہے کہ دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اولاد کو حجتی و کلکٹری کے لئے دنیاوی تعلیم دلاتے ہیں تو جواب یہی ملتا ہے کہ اگر ہماری آمدنی زیادہ ہے تو ہماری حیثیت و مصارف بھی تو ویسے ہی ہیں یعنی اس حیثیت جاہ و مال کو موجودہ آمدنی میں اضافہ اور جاہی مناصب حاصل کئے بغیر کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے یہ ایسی منطق ہے کہ جاہ و مال کے کسی اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی ظاہر جواب نہیں ہو سکتی۔

ورنہ انجی عالمگیر جب جاہ و مال کی اس عالمگیر جنگ سے پہلے اسی ہندوستان میں زندگی کی نفس ضروریات پانچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھیں یعنی چھوٹے بڑے چار پانچ آدمیوں کے گھر کے لئے پچیس تیس روپیہ ماہوار نفس ضروریات کی حد تک بلا کسی تکلیف و تنگی کے کافی ہوتے تھے اور بہتیرے مولوی بلکہ اچھے اچھے علماء اس سے بھی کم میں گذر فرماتے تھے۔ خود حضرت علیہ الرحمۃ کی تنخواہ کانپور میں سچیس روپیہ ماہوار تھی جو حضرت کے علم و فضل کے لحاظ سے کیا تھی، پھر بھی حضرت نے اس کو بہت بڑی تنخواہ سمجھا تھا اور

فرماتے کہ :-

میں طالب علمی میں سوچا کرتا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار
کی مدرسہ اپنی ضروریات معاشی کے لئے کافی سمجھتا تھا اس میں
مبھی (پانچ روپیہ) اپنے خرچ کے لئے اور پانچ گھر کے خرچ کے لئے
اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی نہ اس سے زیادہ
کا اپنے کو مستحق سمجھتا تھا۔ (اشرف السوانح حصہ اول ص ۳۷)

آپ بیتی

خود را قلم نہا کو اپنے گھر کا تجربہ ہے کہ حضرت والد مرحوم دیہاتی اور وہ بھی
نہایت قانع و متوکل طبیعت کے طبیب تھے خرچ اوسطاً ۸ روپیہ ماہوار
اندر باہر دوا ایک نوکر چاکر بھی، کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ سب کامیاب
اوسط درجہ کے شرفاء اداہل برادری کا۔ مگر آمدنی کا اوسط شاید ہی کبھی ۲۰ رو
۴۰ روپیہ سے بڑھتا ہو، نہ آمدنی میں ترقی کی کبھی فکر فرمائی۔ البتہ اللہ اللہ
والوں سے تعلق میں ترقی کی فکر آخر دم تک رہی۔ حضرت مولانا محمد نعیم صاحب
فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت کے باوجود ان کی وفات کے
بعد حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آخر تک برابر اصلاح و استفادہ
کا تعلق جاری رہا۔ زیادہ عبرت و سبق کی بات یہ کہ گھر بھر میں چھوٹے بڑے
سب کو قلب کی جو راحت و طمانیت یا دل کا جو سکھ چین نصیب تھا وہ اس
نالائق نام لیوا اداہل کے متعلقین کو سینکڑوں ہزاروں کی آمدنی اور کوٹھی دھوڑ
میں بھی میسر نہ ہوا۔ ہاں گھر بھر میں والد علیہ الرحمۃ کے اس رنگ و برکت کا وارث
والدہ صاحبہ مدظلہا کا دم رہ گیا ہے (رَبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا مَ تَبَّیَانِ)

صَغِيرًا) برکت کی حقیقت بھی ان اللہ والے والدین ہی کی زندگی و آمدنی کو دیکھ کر سمجھ میں آتی۔

باقی اپنی سینکڑوں ہزاروں کی آمدنی، کوٹھی، موٹر، نوکر چاکر، سب کے چھوٹائی صدی کے تجربات کی میزان اپنے ایک حکیم اور حکیم طبع استاد (مولانا شیر علی صاحب مرحوم) کے ایک بڑے ہی حکیمانہ فقرہ کے سوا کچھ نہ نکلی۔ مولانا مذہب میں جب کہ راقم الحروف آخری جماعت میں تھا صدر مدرس و مہتمم تھے پھر جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات میں علم کلام کے استاد مقرر ہو گئے تھے مشاہیر و چھوٹے سوا ہوا تھا ابھی تک موٹروں کے بجائے گھوڑا گاڑی کا چلن وہاں زیادہ تھا اکثر عہدہ دار خود اپنا گھوڑا گاڑی رکھتے تھے مولانا کے پاس بھی تھی جس پر یونیورسٹی تشریف لاتے تھے کچھ دن بعد دیکھا کہ کرایہ کی گاڑی پتہ شریف لانے لگے عرض کیا کہ حضرت گھر کی گاڑی کیا ہوئی؟ فرمایا نکال دیا، دو گھنٹے اس پر میں سوار ہوتا تھا اور چوبیس گھنٹے وہ میرے اوپر سوار رہتی تھی۔

اُس وقت تو یہ حکیمانہ بات میری سمجھ میں نہ آئی اور مولانا کی پرانہ سالی اور کم ہمتی کا تقاضا معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد خود گھوڑا گاڑی رکھی اور موٹر بھی رکھا، سو پوچھا ہوا تک کی کوٹھی، بجل کا مزا بھی کچھ لکھنؤ میں ایک بھڑی میں خود اپنی دو منزلہ لمبی چوڑی کوٹھی بنوائی لان اور چلواری، نوکر چاکر، سامان اور فرنیچر سب ہی کا ٹھکانہ اپنی حیثیت و حوصلہ سے بڑھ کر دیکھا دکھلایا مگر خدا کو گواہ کر کے گواہی دیتا ہوں کہ جیسا جیسا حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی جوتیوں کے تعلق سے کچھ عقل ٹھکانے ہوئے لگی، ویسا ہی ویسا اس سائے فخر و نمائش کے ساز و سامان کو راحت و آسائش سے زیادہ خود اپنے دل و دماغ پر سوار پانے لگا اور بالآخر کچھ عرصہ بعد حیدر آباد ہی میں جب ایک محبہ و محسن کی ہمت و احسان سے جامعہ کے قریب ایک نو تعمیر مسجد

رہ ڈاکٹر محمد عثمان صاحب رکن شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ جو اپنی ذات صفات سے سراپا کریم و احسان ہیں۔

کے احاطہ میں خاص اس راقم احقر کے لئے دو حجرے تیار ہو کر ان میں قیام نصیب ہوا تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ قید کی کوئی بڑی سزا جھیل کر باہر آ گیا ہے اور آج بھی لکھنؤ کی ذاتی طویل و عریض کوٹھی میں بیٹھ کر حیدر آباد کی کوئی چیز یاد آ جاتی ہے تو شہر و شہریت سے دور مسجد اقصیٰ کے یہی دو حجرے اور اسی زاویہ کے دو چار انے گئے عنایت فرما لکھنؤ کی اپنی کوٹھی کا معاملہ بھی دارم چرا پنوشم کا ہونا ہے ورنہ اب کوٹھی کے بجائے کوٹھڑی ہی کو دل ڈھونڈھتا ہے یہ تو آپ بتی تھی، جگہ بتی بھی جو کچھ وطن و دکن ہر جگہ دیکھی اور سنی، وہ یہی کہ بڑے بڑے عہدہ دار اور بلند مناصب و زدار و اسرار بظاہر جاہ و مال سب کچھ رکھ کر بھی سب کے سینہ کے اندر بل میں مزید کے مقابلہ و مسابقت کی جھٹی دکھتی رہتی ہے اور بالعموم اسی کے انگاروں میں لوٹتے لوٹتے دم نکل جاتا ہے

گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں

یہ اپنی پرانی بظاہر طویل داستان اپنے مقصد و مفاد کے اعتبار سے طویل نہیں قصیر ہی ہے اس لئے کہ دنیا کی جس طلب میں دین و آخرت کا ہوش نہ ہے، جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جاتے، دوزخ و جنت کا خوف و شوق دل سے نکل جاتے خدا کی رضا و نافرمانی کا غم نہ ہو تو یہ تو (معاذ اللہ) مومن و ایمان کے منافی کا فوکر فکر کی دنیا کے سوا

لے یہ مسجد شہر کے بالکل کنا سے اور دور (جو لفظ اقصیٰ کے معنی ہیں) واقع ہے جہاں اب جامعہ کی بدولت کچھ آبادی ہو چلی ہے مولانا گیلانی احقر کے سالہا سال کے رفیق قیام و طعام بھی اسی مسجد کی جوار میں تشریف فرما تھے اور اس مسجد کا ”مسجد اقصیٰ“ نام تو ایک دوست نے تجویز کیا تھا مگر اس کا تاریخی نام ثابت ہونا مولانا ہی کی یادگار ہے۔

کیا ہے اور یہ دنیا کی طلب نہیں، دنیا کا عشق بلکہ متیون ہے بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے کسب دنیا یا دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں مگر یہ نہو کہ اس میں بالکل کھپ جائے کہ گویا خدا تعالیٰ سے بالکل واسطہ ہی نہیں یہ تو کافر ہی کی زندگی کی خالص شان ہے کہ گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں۔

مومن کی شان

اور مومن کی زندگی کی خاص شان یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے بس مسافر اور سرسے کا سا تعلق رکھتا ہے باقی فکر و عمل مجدد و جہد کا اصل تعلق خدا و آخرت سے ہوتا ہے اور جو دنیا میں جو ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے یہ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ :

پورا خلل دماغ

ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تنہا کرے کہ یہاں جھاڑ فالتوس سب لگا دیتے جاتیں اور پھر اپنی کمانی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے خاص کر جب یہ حکم ہو، مثلاً اس سرائے میں چار دن سے زیادہ کوئی قیام نہ کر سکے گا۔ اس وقت تو اپنی کمانی وہاں کی تر تین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کے سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا تو اول تو سرائے میں قیام اگر اختیاری بھی ہو تب بھی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سامعہ نہ کرے۔ اور جب اختیاری بھی نہیں تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہئے۔

الدُّنْيَا سَجْنُ الْمُؤْمِنِ ط

اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک الدنیا سجن المؤمن کے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جلی خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا بلکہ اس لئے کہ جلی خانہ میں جی کبھی نہیں لگا کر تا خواہ کیسا ہی عیش ہو، تو مسلمان کی شان ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو، کیونکہ جی لگنے کی بجگہ گھر ہے اور دنیا گھر نہیں۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچیں گے کہ یہ ہوا اور وہ ہوا، بلکہ اب یوں سوچیں گے کہ دنیا تو پر دلیں ہے یہاں جس طرح بھی گذر جائے اور دنیا کی بجائے آخرت کی سوچ ہوتی چاہئے۔ اور یہ سوچیں گے کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر وہاں یوں بہار ہوگی یوں عیش ہوگا ورنہ یوں پریشانی ہوگی، یوں مصیبت ہوگی۔

لیکن ہماری زندگی ہمارے برتاؤ اور معاملات سے (الاما شاء اللہ) پس ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ

جیسے کوئی منکر آخرت ہو

کیونکہ حقیقی محبت دنیا کی ہے آخرت کی نہیں نہ اس کا اتنا شوق ہے چنانچہ دنوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ یوں رہیں گے یوں کریں گے جائداد ہوگی ملازم ہوں گے ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی ایسی انگلیں ہوتی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہوگی

اس میں باغات ہوں گے مکانات ہوں گے حوریں ہوں گی، غالباً کبھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت کم آتا ہے۔
 بعض ایسے ہیں کہ جن کے پاس دنیا کی خوشی کا کوئی سامان نہیں اور وہ لوگ کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی وارث نہیں زندگی کیسے کٹے گی تو ان سے یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیسے سہی جائے گی پھر جیسے یہاں تکلیف کو سوچ کر تدبیر کو سوچتے ہو کہ شاید قلال تدبیر سے یہ تکلیف کٹ جائے یا فلاں تدبیر مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کے لئے بھی سوچا

آخرت کی کوئی مصیبت لا علاج نہیں

حالانکہ دنیا کے مصائب بعض ایسے ہیں جن کی کوئی تدبیر ہی نہیں اور اس لئے اس کو سوچا ہی عبث ہے مگر پھر سوچتے ہو کہ ادا آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں جو لا علاج ہو، بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے لیکن پھر اس کا ذکر نہ فکر، (الرفیق ص ۳۳/۳۴)
 خدا و آخرت سے بے تعلقی و بے فکری کا یہ حال صرف عام دنیا داروں ہی کا نہیں بلکہ جو لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے اور سمجھے جاتے ہیں ان کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ بہتر نہیں، ارشاد ہے کہ:-

”دنیا دار تو الگ ہے، دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے، حالانکہ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا
قَدَّمَتْ لِإِعَادَةٍ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ زندگی

پھر جو لوگ علم بھی دنیا کا نہیں دین ہی کا حاصل کرتے ہیں ان کو بھی اگر دین
و آخرت کی امنگوں اور اندیشوں کے بجائے اس کی فکر دامن گیر ہے کہ کھائیں گے
کہاں سے تو یہ کیسے ظلم و حسرت کی بات ہے ان کی زندگی تو امت کے لئے مثلاً
واسوہ ہونی چاہئے اور ان کا اسوہ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہونی
چاہئے کہ حضورؐ کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کیسی زندگی پسند و مامور تھی
اس کا اندازہ اس سے کرو کہ لوگوں کی اسودہ حالی سے متاثر ہو کر ازدواج مطہرات کو
بھی طبعاً کچھ اس طرف میلان ہوا اور حضورؐ سے کچھ مزید نان نفقہ اور سامان کی
درخواست کی جو حضورؐ کے قلب مبارک پر اتنی گراں گزری کہ ایک مہینہ گھر میں نہ جانے
کی قسم کھالی بالآخر یہ آیت اتری جس کا خلاصہ یہ کہ حضورؐ کو امر ہوا کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّإِنِّ وَاجِلَكَ
إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ
أُمْتِعْكُمْ وَأَسْرِحْكُمْ سَوَاحِلَ
جَبِيلٍ وَإِن كُنْتُمْ تُرِيدُونَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْآخِرَةَ
فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنِينَ
مِنْكُمْ أَجْرًا عَظِيمًا

صاف صاف اپنی بیبیوں سے فرمادیں
کہ اگر تم کو دنیا اور اس کا ساز و سامان
مطلوب ہے تو میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا
اور اگر تم خدا و رسول کی رضا و خوشنودی
اور آخرت کے مراتب و انعامات کی
طالب ہو تو ایسی نیک بیبیوں کے لئے
اللہ تعالیٰ نے آخرت میں عظیم الشان
اجر و انعام مہیا فرما رکھا ہے۔

ازواجِ مطہرات آخر ازواجِ مطہرات تمہیں سب کی آنکھیں اتنی ہی تہنیت سے کھل گئیں اور پھر مدتِ العمر حضورؐ کے ساتھ خوشی خوشی فقر و فاقہ میں گزار دی کیونکہ حضورؐ کے ہاں بارہا فاقہ ہو جاتا تھا قرض لینے کی نوبت آ جاتی تھی اور حضورؐ کا یہ فقر و فاقہ اضطراری نہیں بالکل اختیاری تھا، جس کو حضرت مجددِ مٹھالوی علیہ الرحمۃ نے فقرِ صادق سے تعبیر فرمایا ہے۔

فقرِ صادق

جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو اور دل چسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقرِ محبوب تھا، حتیٰ کہ اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً و عملاً اختیار کر کے دکھلایا۔ قولاً تو یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اِیِّ مُحَمَّدٍ قُوتًا
اے اللہ محمدؐ کی اولاد کو رزق بقدر گذر اوقات عطا فرما۔

اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں لیکن ایک مرتبہ جب ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے چھالے پڑ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی لوٹدی، غلام کی..... درخواست کی تاکہ کچھ مدد ملے آپؐ نے فرمایا کہ تو لوٹدی غلام دوں اور کہہ تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں۔ یہ سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پھر نہ پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی چیز ہی دیدیکھے آپؐ نے فرمایا کہ سوتے وقت سُبْحَانَ اللہِ طَبِیْتِیسْ بَارِکَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ طَبِیْتِیسْ بَارِکَ اور

اللہ اکبر جو تیس بار پڑھ لیا کرو، بس یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے
 اس خدا کی بندگی خوشی خوشی قبول کر لیا، تو دیکھتے حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم کو نفر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو تجویز کر کے
 دکھلا دیا، (المرقی فی سوار الطریق ص ۳۷۴)

اور جو اولاد کے لئے محبوب تھا، محبوب اصل میں وہی امت کے لئے بھی تھا۔
 جیسا کہ اس عمومی ارشاد سے ظاہر ہے کہ

من اصابہ منکم معافیٌ یعنی جس کو جسم کی صحت و عافیت اور
 فی جسمہ و امنائی سربہ دل کا امن و چین نصیب ہوا اور ایک
 عندہ قوت یوم فکانہا دن کا کھانا پاس ہو تو گویا ساری دنیا
 حیوٰت لہ الدنیا یجذ افید جمع ہو گئی۔

البتہ یہ ضعفائے امت کے حال پر رحم الراحمین و رحمۃ للعالمین کی شان رحمت
 مہدی کہ جائز حد تک دنیا کے کسب و طلب کی اجازت و اباحت فرمادی لیکن دنیا
 کا ایسا عشق و مہنون کہ جیسے کوئی شکر آخرت ہو، یا جیسے خدا سے کوئی واسطہ ہی
 نہیں اس کی اگر اجازت ہو تو پھر دین و دنیا، کافر و مومن کا جھگڑا ہی کیا رہا !

مومن کی معاشی منطق

را، الغرض اسلامی و دینی زندگی کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ہر کام میں یوم دین
 اور مالک یوم الدین سے معاملہ و واسطہ پیش نظر ہو، اس کے بعد دنیاوی زندگی کے
 سارے مسائل و مشکلات از خود حل و سہل ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کی قدر
 و قیمت وزن و اہمیت ہی مستقل مسائل و مقاصد کی نہیں رہ جاتی نہ اپنی سعی و
 عمل کا سارا زور کوئی ہوش مند اس دنیا کے کھانے پینے عیش و آرام پر اس طرح لگانے

کو راضی ہو سکتا ہے کہ ساری جدوجہد اسی ادنیٰ یا خیس و حقیر زندگی میں گم ہو کر رہ جائے اور پھر جس فہم یہ کہ بڑا کار نمایاں انجام دے رہے ہیں اَلَّذِي نَصَلَّ سَعِيَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا یہ تو بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے ویسا ہی خلل دماغ ہوگا جیسا کوئی شخص کسی منزل مقصود کو بھلا کر ویٹنگ روم، ہوٹل یا مسافر خانہ اور سرائے کے چند ساعت یا چند دن کے قیام کے لئے اپنے ٹکڑے عمل کی ساری قوت اس کی زینت و راحت پر خرچ کر ڈالے، سرائے و سفر میں تو آدمی کو اگر ایک دو وقت کا کھانا بھی نہ ملے اور فاقہ ہو جائے تو بھی زیادہ پروا نہیں کرتا چہ جائیکہ کسی ایسی سرائے میں مستقل جی لگا بیٹھے جہاں سے نکال دیا جانا یقینی ہے یہ وَرَ ضُوءًا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأْنَنُوا فِيهَا تَوْخَافُ كَافِرٌ وَمُنْكَرٌ فَرَّتْ بِهَا كَاشِيُوهُ هِيَ اَوْرَاغُهَا كُوْمَارُكَ هُو۔

۲، دوسری بات جو منکر کے مقابل میں مومن بالخصوص اہل علم مومن کے پیش نظر رہنے کی ہے وہ ہمارا یہ ایمان و اعتقاد ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح رزق اور اس کا قبض و بسط، یا فراخی و تنگی بھی بالکلہ حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور پہلے ہی سے اس کا سارا پروگرام یا نظام عمل متعین و مقدم ہو چکا ہے اس طرح اصل نظر اسباب کے بجائے مسبب الاسباب اور تدبیر کے بجائے تقدیر پر رہنا عین ایمان ہے جس کے بغیر ایمان ہی صحیح اور پورا نہیں ہوتا۔ جو کچھ خدا دینا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جو کچھ وہی نہ دینا چاہے تو کوئی دے نہیں سکتا (لَا مَعْطٰی لِمَا مَنَعْتَ وَلَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ)

حدیث میں تو صاف صاف ہے کہ کوئی بندہ بلا ان چار باتوں پر ایمان لائے مومن نہیں ہو سکتا ایک تو حید (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ)، دوسرے رسالت محمدؐ

رِصْلِ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِسْرَ آخِرَتٍ يَّالْبَعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ اور چوتھے تقدیر۔ الفاظ حدیث یہ ہیں۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ
عَبْدٌ حَتَّى يُؤْمِنَ بِأَنَّهُ لَيْسَ يَشْهَدُ أَنَّ لَإِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ وَإِلَى رَسُولِ اللَّهِ لَبَعَثْنِي بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ
بِالْمَوْتِ وَالبَعَثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ
بِالْقَدَرِ

(۳) تیسرے جوان دونوں مقدمات کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں مومن بس زیادہ سے زیادہ اپنی سعی و طلب کو ضروریات زندگی تک محدود رکھے اور فضولیات زندگی کی فکر و سعی قطعاً وقت عزیز کو گنوا نا ہے اور طفلانہ ہو و لعب سے زیادہ تہیں، البتہ بلا اضاعتِ وقت اور بلا ابتلاء ہو و لعب کچھ راحت کا سامان بھی میسر ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اس طرح ایک انعام و احسان جان کر مستمتع ہو۔ جس سے خدا و آخرت کا تعلق اور بیدار، و پائدار ہو، البتہ راحت بھی یاد رہے کہ اصل میں قلب کی راحت کا نام ہے اور یہ بات کان کھول کر دینداروں ہی کو نہیں دینا داروں کو بھی سن اور سمجھ لینی چاہئے جیسا اوپر اپنے اور پرانے سب کے تجربات سے واضح کیا جا چکا کہ قلب کی راحت یا دل کے سکھ چین کا از مادی ساز و سامان یا فضولیات کی بہتات میں نہیں بلکہ ضروریات زندگی پر قناعت ہی میں پوشیدہ ہے اور ساتھ ہی اگر ایمان و عمل صالح یا دینداری کی زندگی بھی نصیب ہو تو حیوۃ طیبہ کی موعودہ زندگی کا تجربہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے

مومن کی معاشی بنے فکری

سو اپنے اچھی طرح دیکھ لیا کہ مومن کامل کے اس سوال کا کہ کھائیں گے کہا
سے کیسا کامل و سہل حل موجود ہے، بلکہ جس کو معاش کی فکر و پریشانی کہا جاتا ہے
ایمانی زندگی سے خیم و جان کو گھلانے والی یہ فکر معاش دراصل سرے سے خارج
ہو جاتی ہے اور یہ سوال سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے کہ دینی یا عربی تعلیم حاصل کر کے
کھائیں گے کیا خصوصاً علم دین کی تحصیل و تعلیم کی ہمت و سعادت نہ کھنے والوں
کا یہ سوال تو اور بھی بے معنی ہے اس کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ ابھی علم دین کی ایجاد
میں سمجھی اور دستار فضیلت باندھ لی اس لئے جیسا کہ اوپر تصریح و تاکید کے
ساتھ عرض کیا گیا ہے زندگی میں دین پیدا کرنے کے لئے تعلیم دین کے ساتھ ساتھ
تربیت دین بھی لازم بلکہ الزم ہے کیونکہ تربیت بلا تعلیم تو دیندار بنا دیتی ہے
لیکن تعلیم بلا تربیت سے شاذ و نادر ہی دین پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم دین کے ساتھ تحصیل معاش

تاہم انسان ایک تو بالطبع اس عالم اسباب میں اسباب و تدابیر کا سہارا
ڈھونڈھتا ہے اور اس سے قسلی پاتا ہے دوسرے وقت کے حالات جب کہ
ہر طرف پیٹ ہی پیٹ پکار رہے اور بھرپور عام ایمانی و اعتقادی ضعف
و اضمحلال کی بنا پر حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے تعلیم کے ساتھ بقدر ضرورت تحصیل
معاش کے ظاہری اسباب کا بھی جا بجا مشورہ دیا ہے اگرچہ ایسے غیر مستطیع
علمائے دین کی جو اپنا سارا وقت خدمت دین میں صرف فرماتے ہوں معاشی
کفالت اسلامی حکومت یا بیت المال اور اغنیائے امت کے ذمہ ہے جیسا

کہ ادر خود حضرت علیہ الرحمۃ لفقراء الذین اُحصوا فی سبیل اللہ کی تفسیر بالتفصیل واضح و ثابت فرما چکے ہیں۔ لیکن جینے ایسی اسلامی حکومت نہ بیت المال نہ اغنیائے امت کو اس کا ادراک نہ ہمت تو علمائے امت کی مزید سعادت اسی میں ہے کہ گذراؤقات کے بقدر تدبیر معاش کی خود ہی ہمت فرمائیں اس ہمت افزائی کی مثالیں اسلاف امت کے اکابر ائمہ میں بے شمار موجود ہیں اور تلخیصات عشر کی تہہد کو بھی حضرت نے اس مشورہ پر ختم فرمایا ہے کہ جو لوگ صرف اردو کتب و دینیات کے ذریعہ احکام دین حاصل کرنے کے بجائے اور علوم دینیہ حاصل کرنا چاہیں

(۱) تو صنعت و حرفت یعنی دستکاری و پیشہ سے معاش حاصل کرنے میں بہت آسانی و سلامتی ہے

(۲) ادر عربی کی تکمیل کرنے والوں کے لئے چند صورتیں معاش کی مناسب ہیں اسکول میں نوکری کر لینا، مطب کرنا، مفید رسالے یا حواشی تصنیف کر کے یا درسی کتابیں چھپوا کر ان کی تجارت کرنا، کاپی نویسی کرنا کسی مطبع میں تصحیح کی نوکری کرنا اور سب صورتوں میں اوقات فراغ میں مطالعہ و تدریس کا شغل رکھنا یا کسی اسلامی مدرسہ میں مدرسہ کرنا۔ بشرطیکہ چندہ کی درآمد و برآمد سے تعلق نہ ہو

باقی اصل راہ علم دین حاصل کرنے والوں کی وہی ہے کہ اگر غنائے ظاہری و باطنی یعنی ثروت یا قوت توکل حاصل ہو تو محض حسبہ اللہ اپنے کو دینی خدمات تدریس و تالیف و عطا و افتاد وغیرہ کے لئے وقف کر دیں۔

اس مشورہ کے پیش نظر اور اس میں آسانی و سہولت پیدا کرنے کے لئے راقم
 نہا کے خیال میں مدت سے یہ بات ہے کہ خود عربی و دینی مدارس ہی میں اور زمانہ تعلیم
 و تعلیم ہی میں طلبہ میں صنعت و حرفت اور تجارت کی مختلف و مناسب صورتوں
 مناسب و ذوق پیدا کر دیا جائے جس کی تدبیر یہ ہے کہ کم از کم ہر بڑے مدرسہ میں
 ساتھ ساتھ ایک مطبع بھی ہو جس میں مفید درسی و غیر درسی دینی کتابیں شائع ہوں
 جس کے ذیل میں طلبہ کو کالی نو لسی، تصحیح، جلد سازی، وغیرہ طباعت و اشاعت کے
 مختلف متعلقات سے گنجائش وقت کے بقدر واقفیت کا موقع دیا جائے
 اسی طرح ایسی ضروریات زندگی نہ کہ فضولیات زندگی جن کی صنعت کا با آسانی
 انتظام ہو سکتا ہو، مثلاً کفش سازی، ان کی صنعت کا بھی انتظام ہو اور کھانے
 پینے کپڑے وغیرہ دیگر ضروریات زندگی کی بڑی چھوٹی حسب موقع و محل دوکان ہو
 جس سے بیرونی خریداروں کے علاوہ خود طلبہ و اساتذہ وغیرہ تمام متعلقین مدرسہ کی
 ضروریات بھی فراہم ہوں اور باری باری طلبہ اس میں حقوڑا حقوڑا وقت دے کر
 اس قسم کی صنعت و تجارت سے مناسبت پیدا کریں تاکہ حسب مناسبت آئندہ زندگی
 میں اس سے تحصیل معاش کا کام لے سکیں۔

اگر کچھ زمین دستیاب ہو سکے تو باغبانی اور غلہ اور ترکاریوں وغیرہ کی کاشت
 کا بھی کچھ ضرور انتظام ہو جس سے معاشی مشغلہ کے علاوہ وزشی و تفریحی مشغلہ کا کام
 بھی لیا جاسکتا ہے

اگر طالب علمی ہی کے زمانہ سے ایسی چیزوں کا مذاق پیدا کر دیا گیا تو انشاء اللہ پھر ظاہری
 اسباب کی حد تک دین کے طلباء و علماء کے متعلق ضروریات زندگی کے بقدر نہ یہ
 سوال ہو گا کہ کھائیں گے کہاں اور نہ انشاء اللہ مخلوق کی زندگی اور ملازمت کی ذلت
 سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔

ایک تہنیه

نہایت ضروری اس معاملہ میں یہ ہے کہ ایک درس گاہ نے دوکان وغیرہ کی قسم کی چیزیں کچھ جاری بھی کیں جن میں اسحق کے مشورہ کو بھی مصالح مذکورہ کی بناء پر کچھ دخل تھا لیکن ہوا یہ کہ نظر طلبیہ کی معاشی تربیت کے بجائے زیادہ تر مالی منفعت پر رہنے لگی اور آگے چل کر عربی و دینی مدرسہ کے مناسب مطبع و مکتبہ وغیرہ کی کچھ مزید مفید تر تجاویز جو پیدا ہوئیں ان کے نقشے میں بھی مالی منفعت کا رنگ زیادہ بھرا تھا اس کے علاوہ مزید نقص یہ تھا کہ اصل مقصد یعنی درس و تدریس کے فرائض میں خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ تھا لہذا جس طرح ایک طرف وقت کے تقاضوں کی بناء پر دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ معاشی تربیت کا خیال رکھنا ضروری ہے اسی طرح یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ مقصود بالذات دین کے طلبہ و علماء کو ملک التجار بنانا نہیں ہے بلکہ وہی گذر اوقات بقدر ضروریات زندگی کے لئے کوئی حیلہ فراہم کر دینا ہے تاکہ خدمت دین استغناء کے ساتھ کر سکیں نہ یہ کہ تاجرانہ منفعت کی فکر و تدبیر میں دینی تعلیم و تعلم کے اصل مقصد ہی میں خلل واقع ہونے لگے۔ ما حاصل یہ کہ اہل دین خصوصاً علمائے دین کی دنیا کا زندگی کے ہر شعبہ میں دین اور مقاصد دین کے تابع رہنا ضروری ہے۔

و عطا و افتاء و تصنیف کے متعلق اصلاحات

علماء سے متعلق تین خدمات اور ہیں و عطا، افتاء اور تصنیف ان میں بھی جو ضروری باتیں اصلاح طلب ہیں ان کی طرف بھی حقوق العلم کی ایک خاص فصل میں متوجہ فرمایا گیا ہے۔

و عظمیٰ کوتاہی ایک تو وعظ نہ کہنے کی ہے اکثر اہل علم کو دیکھا کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیق کرنے اور علم کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ تعلیم دین کا اصلی طریقہ جس کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے یہی وعظ وارشاد ہے جس کے ذریعہ تبلیغ دین فرماتے تھے باقی تدریس و تالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہیں سلف میں قوت حفظ و تدبیر کی بنا پر زبانی روایات اور خطبات عام پر قناعت و وثوق تھا بعد میں علوم کی حفاظت کے لئے تدریس و تالیف کی ضرورت ہوئی اس سے بھی اصل مقصود تبلیغ ہی ہے جس کی خطاب عام کی صورت کو وعظ کہا جاتا ہے۔

باقی جو کوتاہیاں خود وعظ کہنے کے متعلق ہیں وہ یہ ہیں (۱) وعظ پر نذرانہ لیا یا پہلے سے ٹھہرا لیا جس کی بدولت وعظ کا اثر نہیں ہوتا (۲) وعظ کو اس وقت مال کے خوف اظہارِ حق سے رکنا ہے تنخواہ لے کر وعظ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے جس کا ادب مہبوط بیان ہو چکا (۳) وعظ میں غیر ضروری یا عوام کے حق میں مضر مضامین مثلاً دقائق تصوف وغیرہ بیان کرنا (۴) مغلطی تقریر کرنا (۵) کسی خاص شخص پر وعظ میں تقریض کرنا جس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے (۶) وعظ میں کسی کی فرمائش کے تابع بن جانا۔

ظاہر ہے کہ وعظ وہی ہے جو ان شرائط کے ساتھ ہو ورنہ وعظ کی نقالی بلکہ اس کا تسخر ہے۔

افسوس یہ کوتاہیاں ہیں حصولِ نذر کا اس کو آگے بنانا۔ البتہ اگر اس کی تکمیل و انتظام میں کچھ خرچ ہوتا ہو تو اس کے بقدر وہ بھی اہل استطاعت

پر کچھ فیس کے بطور لگا دینے میں مضائقہ نہیں، ہر سوال کے جواب کی کوشش کرنا نہ بھی معلوم ہو تو یہ نہ کہنا کہ نہیں جانتا بلکہ کھینچ تان کر کچھ لکھ دینا۔ اسی طرح معلوم ہونے پر بھی ہر سائل کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں اس کا عوام پر بُرا اثر پڑتا ہے علماء کو اپنے تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا جو سوال فی نفعہ یا کسی سائل کے اعتبار سے غیر ضروری ہو صاف کہہ دیا جائے کہ یہ سوال غیر ضروری ہے یا جو سائل دلیل سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو اور دلیل معلوم کرنا چاہے اس کو بھی صاف جواب دیدینا چاہئے سمجھانے کی کوشش نہ کرنے لگے۔

جب دلیلِ اِتی کے متعلق یہ مشورہ ہے تو دلیلِ لمی یعنی علتِ دریافت کرنے کی عوام کو گنجائش ہی نہ دے کہ اس کا علم تو خود علماء کو پورا اولیٰ انہیں الا ماشاء اللہ مثلاً نماز کے پانچ وقت فرض ہونے کی دلیلِ اِتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور لمی اس کی وہ حکمتیں ہیں جن کی بناء پر نماز فرض کی گئی۔

بعضے فرمائش کرتے ہیں کہ قرآن مجید سے پانچ وقت کی نماز کا ثبوت لاؤ، اب مجیب صاحب ہیں کہ قرآن مجید میں اس کی تلاشی کرتے اور دوسروں سے مدد لیتے پھرتے ہیں حالانکہ حکم شرعی کے لئے مطلق دلیل شرعی کافی ہے خاص دلیل کی حاجت نہیں اور ازلہ شرعیہ چار ہیں کتاب و سنت اور اجماع و قیاس مجتہد، ان میں سے کسی ایک دلیل سے بھی جو حکم ثابت ہو جائے، وہ ثابت ہے البتہ حسب تفادوتِ ادلہ ثبوت احکام کا درجہ متفاوت ہوگا۔

بعضے استفسار کرنے والے حیلے پوچھا کرتے ہیں جو ہرگز نہ تسلیم کیا جاتے

بعض اوقات سوال پہل یا نا صاف ہوتا اور دو صورتوں کو محتمل ہوتا ہے وہاں کثر اہل علم تشفیق سے جواب دیدیتے ہیں کہ یہ صورت ہو تو یہ حکم اور وہ صورت ہو تو وہ حکم، اس سے تجربہ کاروں نے منع فرمایا ہے کیونکہ ناخذ ان ترس لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق سوال تراش لینے کی گنجائش ملتی ہے کہ وہ مفید مطلب ہی شق کے مدعی بن جاتے ہیں اور اصل واقعہ ملتبس ہو جاتا ہے۔

تصنیف میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں غیر مفید فنون میں تصنیف کرنا، رد و قدح اور مجادلہ کہ تصنیف کا بڑا مقصود بنالینا، ایسے مباحث لکھنا جن کی ضرورت عوام کو نہ ہو یا جن سے وہ تشویش میں پڑ جائیں مثلاً تصوف و کلام کے نازک مسائل، اور اگر خواص کی نفع رسانی کے لئے ایسی ہی ضرورت ہو تو خاص زبان مثلاً عربی میں لکھے کہ عوام کی نظر تک پہنچے، محض تجارت کے لئے عوام کے مذاق کی کتابیں لکھ کر اُس سے روپیہ کمانا یا حق تصنیف کی بیع کرنا۔

یہ تصنیف و تالیف کی وہ موٹی موٹی خرابیاں ہیں یا کوتاہیاں ہیں جو دینی کتابوں تک میں سرایت کر گئی ہیں اور جن سے اس زمانہ میں بس اللہ کا کوئی خاص نبردہ ہی محفوظ ہو گا۔

متفرق اصلاحات

سب سے آخر فصل میں کچھ متفرق اصلاحات بیان فرمائی گئی ہیں مثلاً بعض اہل علم اپنے کو خوب بناؤ سنگار سے رکھتے ہیں جو شان علم کے خلاف اور ضروری خدمات علم سے بے فکری کی علامت ہے کیونکہ اس فکر کے ساتھ لباس و طعام وغیرہ کے تکلفات کی طرف اتنا توجہ نہیں ہوتا اسی طرح مجلس میں صدر یا ممتاز جگہ پر بیٹھنے کا شوق چلنے میں تقدم کی فکر، مجمع میں امام ہونے کا خیال، یہ سب بیاہر و کبر کے شعبے ہیں تو واضح و بے تکلفی اور سادگی ہی میں علم و دین کی شان ہے حدیث میں ہے البتة اذلة من الایمان اس سے مساکین کو بعد و تو حش نہیں ہوتا اور یہی لوگ دین کے زیادہ قبول کرنے والے ہیں البتہ سادگی کے ساتھ طہارت و نظافت ضروری ہے۔

اور مثلاً دوسرے مولویوں کو بُرا کہنا جس میں بعض اوقات معصیت کے علاوہ عوام پر بُرا اثر ہوتا ہے وہ سب بدگمان ہو جاتے ہیں اگر کسی صاحبِ باطل کے شر سے بچانا ہی ضروری ہو تو تہذیب کے ساتھ اصلاح کر دینا کافی ہے اسی طرح دوسروں سے مولویوں کی بلکہ غیر مولویوں کی بُرائی سننا بھی گو کسی حالت میں جائز بھی ہو مگر علماء کی شان کے مناسب نہیں بعض دفعہ اس کے مفاسد سے خود اپنے دین میں حرج ہونے لگتا ہے اور مثلاً کسی کے فیصلہ میں پڑنا گو فی نفسہ طاعت ہے لیکن حسبِ ارشاد

نبوی کہ حضرت ابوذرؓ کو فرمایا لا تقضین بین اثنتین ان علما کو جو حکام نہیں اس میں پڑنا مناسب نہیں، طرفداری کا شبہ اور بدنامی بھی ہوتی ہے اور جو دینی نفع مسلمانوں کے ساتھ یکساں تعلق رکھنے سے ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے البتہ ایک صورت اسلم ہے کہ اگر فریقین درخواست کریں تو ان سے کہے کہ دونوں سوال لکھ کر اپنے اپنے دستخط کر دو پھر بطور جواب کے اس پر حکم شرعی لکھ کر حوالہ کر دے کہ اس پر دونوں عمل کر لو۔ یا کسی ثالث کو مقرر کر کے اس سے نافذ کر لو۔

اور اسی مصلحت سے مناسب ہے کہ کسی شخص کے دنیوی معاملہ میں دخل نہ دے اور مالی معاملات بھی الگ ہے مثلاً چندہ وصول کرنا اس کا تحویل دار بنایا اس کے صرف کا اہتمام لینا، یہ سب صورتیں بدگمانی اور تہمت کی ہیں۔ ایسے کام متدین رؤسا کے متعلق ہوں البتہ ان کو چاہئے کہ جو کام کریں علماء سے شرعی احکام دریافت کر کے کریں۔

اہل دنیا اور علما کے تعلقات

سب سے آخر میں خاتمہ کے تحت ان باہمی تعلقات کا بیان ہے جو اہل دنیا اور علماء میں ہونے چاہئیں جو مختصراً یہ ہیں کہ:-

” دنیا دار علماء کو مخدوم سمجھیں وہ جو کام دین کا کر رہے ہوں بدوں ان کی استدعا کے اس میں اعانت کریں مالی بھی (اور غیر مالی بھی) جو بات پوچھیں ادب سے پوچھیں، دلائل نہ دریافت کریں اگر کوئی شبہ ہے معاندانہ سوال نہ کریں مستفیدانہ پوچھیں ان سے کوئی نغزش ہو جائے تو ان کی مذمت نہ کریں آخر وہ بھی بشر ہیں اور اس حال میں بھی تمہارے نفع اور ہدایت کے لئے کافی ہیں تم ان کے اقوال پر عمل کرو۔

افعال کو مت دیکھو تمہارا شبہ ایک سے حل نہ ہو تو دوسرے سے حل کرو،
 مگر ایک کا قول دوسرے کے روبرو مت نقل کرو
 اور علماء کو چاہئے کہ دنیا داروں کو اپنا برابر کا بھائی سمجھیں ان
 تعلیم و خدمت کے متوقع نہ ہوں اگر بلا توقع کچھ نہ دیں تو سمجھیں کہ علم
 دین کی خدمت تو ہمارے ذمہ تھی ہی انہوں نے احسان کیا کہ ہماری
 اعانت کی، اس میں قیل و قال نہ کریں جیسے کہ بعض کی عادت ہے کہ
 کہیں سخاوت پر بکھرا رہے کہیں ترقی کا تقاضا، کہیں تہذیب پر بحث، اگر کسی
 کچھ بے تمیزی ہو جاتے صبر کریں کہ جب ان کو ہمارے برابر علم نہیں تو ہمارے
 برابر تمیز کیسے ہوگی؟ اگر کسی کو قولاً یا فعلاً شرع کے خلاف دیکھیں تو جس پر
 قدرت و حکومت نہ ہو اس پر تشدد نہ کریں، نرمی سے بہت اصلاح ہوتی
 ہے اگر عامی کوئی حق بات کہے قبول سے عار نہ کریں۔ اگر کسی مسئلہ میں
 اپنی غلطی ظاہر ہوا اعلان کر دیں

معلم و متعلم و خسر کاتے علم کے باہمی حقوق

اس رسالہ حقوق العلم میں چونکہ معلم و متعلم اور شرعیہ تعلیم کے حقوق کا ذکر نہیں فرمایا
 گیا تھا اس لئے بعد میں اصلاح انقلاب حصہ اول کے آخر میں اس کی تفصیل فرمائی
 گئی ہے۔ کیونکہ

علوم دینیہ کی جس طرح تعلیم و تعلم ضروری ہے اسی طرح اس تعلیم و تعلم
 کے سبب جن لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں ان تعلقات کے
 حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ تمام حقوق آیات و احادیث سے
 مستنبط فرماتے ہیں

حقوق معلم

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ قَوْلَهُ وَ يَعْلَمُهُمْ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت کے نعمت و منت ہونے کی علت تعلیم کتاب و حکمت کو قرار
دیا گیا ہے جو اس امر کی صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم
دے وہ اس کے حق میں نعمت الہی ہے اور اس کی قدر و تعظیم لازم ہے
اور اس تعلیم میں نہ صرف باقاعدہ سبق پڑھانا بلکہ مسئلہ وغیرہ بتلانا بھی
سب داخل ہیں حتیٰ کہ کسی کی تصنیف سے انتفاع یہ بھی مصنف
کے شاگردوں میں داخل ہو جاتا ہے

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا جو قصہ قرآن میں مذکور ہے اس میں
بھی استاد کے کئی آداب و حقوق ثابت ہوتے ہیں اول یہ کہ استاد
کی خدمت میں خود شاگرد جایا کرے ، دوم اگر استاد کسی اعتبار سے
مرتبہ میں شاگرد سے کم ہو تب بھی اس کا اتباع کرے سوم جس بات
کے پوچھنے کو استاد منع کرے نہ پوچھے ، چہارم اگر غلطی سے استاد کے
خلاف مزاج کوئی بات ہو جائے تو معذرت کہ لے پیغم اس کے تنگ
ہونے یا مرض وغیرہ کی وجہ سے کسلمند ہونے کے وقت سبق بند
کر دے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تم پر احسان کرے ، اگر اس
کی مکافات کر سکتے ہو تو مکافات کرو ورنہ دعا کرو ، تعلیم دین کے
احسان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے لہذا اس کے مکافات میں

ہر قسم کی جانی و مالی خدمت سے سعی کرنا چاہئے اور جب کسی قسم کی استعانت نہ ہو یا استاد سے عداوتی کے بعد نہ ہے تو کم از کم دعا ہی سے یاد رکھنا چاہئے بعض طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ غمراہ محوِ اہتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہیں حالانکہ خود بھی اس کو مہمل سمجھتے ہیں مگر محض اپنی ذہانت جتلانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول باتیں کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور سے منع فرمایا ہے کہ (نہی عن الاغلو طات) چہ جائیکہ استاد کو مغالطہ دینا،

ایک حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو سب سے زیادہ سخی کون ہے انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ دانائے حال ہے تو آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ سخی، پھر وہ جن نے علم دین سکھلایا اور اس کو پھیلایا، یہ شخص قیامت میں تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا اس حدیث میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جو تدریس و تلقین و عطا و

تصنیف کسی طرح بھی دین کی تعلیم و اشاعت کرتے ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ سخاوت و جود کرے، اس کا کتنا حق ہوتا ہے حجۃ الوداع کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کرادو، جس سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش و متوجہ رہنا چاہئے کسی سے بات یا کسی کی طرف التفات نہ کرے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور اس کو پڑھنا شروع کیا۔ جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ اے عمرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کو تو دیکھو کہ ناخوشی کے آثار پائے جاتے ہیں حضرت عمرؓ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں

اس سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا چاہئے۔ دوسرا حق شاگرد کا یہ ثابت ہوا کہ اس سے کوئی امر نامناسب صادر ہو تو اس کو تنبیہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو اور تیسرا حق شریک علم یا رفیق سبق کا یہ ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جس پر وہ خود مطلع نہ ہو تو خیر خواہی کے ساتھ اس کو مطلع کر دے تاکہ تدارک کر لے۔

راقم ہذا کے نزدیک ایک ضروری امر اور بھی اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی کتاب کے متعلق شاگرد کو معلوم ہو جائے کہ استاد کسی وجہ سے اس کے لئے اس کا پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ کم استعدادی یا اور کسی مضرت و مصلحت کی وجہ سے تو اس سے باز رہنا چاہئے۔

ایک اور حدیث میں استاد کا یہ ادب صراحتہ مذکور ہے کہ علم سیکھو اور اس کے لئے سکینہ اور وقار اختیار کرو اور جس سے علم سیکھو اس کے ساتھ تواضع اور ادب سے پیش آؤ۔

اگے طلبہ کی ان مختلف موٹی موٹی کوتاہیوں پر کیا متنبہ فرمایا گیا ہے جو محتاج

اصلاح ہیں مثلاً :-

استاذ کے ظاہری ادب و سلام کا لحاظ نہ رکھنا، اس کی پوری اگلی نہ کرنا۔ کوئی بات مان لی تو کسی کو بلا عذر ٹال دیا۔ خلوص میں کمی، بدنی یا مالی خدمت میں کمی، بلکہ بدنی خدمت بیکھا وغیرہ جھلنے کو ثواب بہت سے شاگرد ذلت و عار سمجھنے لگے ہیں۔

خاص طالب علمانہ کوتاہیاں

یہ ہیں کہ :- مثلاً مطالعہ نہ دیکھنا یا کم دیکھنا جس سے سبق سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اور استاد کو بار بار تفسیر کرنا پڑتی ہے یا اس کم سمجھنے کی بدولت فضول سوال کرنے سے استاد کو ہنگامی و پریشانی ہوتی ہے اور مثلاً تفسیر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ ہے اور وہ دوسری طرف جس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے یا بعض کا اپنی ذہانت جملانے یا استاد کا امتحان کرنے کے لئے فضول سوالات کرنا، یا مقدار سبق و کتاب وغیرہ کے معاملہ میں استاد کی رائے نہ ماننا کہ ہم تو اتنا ہی سبق پڑھیں گے یا فلاں ہی کتاب شروع کریں گے یہ تو زمانہ طالب علمی کی بعض کوتاہیوں کا بیان تھا۔ بہت سے لوگ طالب علمی کے بعد یا استاد سے جدائی کے بعد کوئی حق نہیں سمجھتے، یا سمجھتے ہیں مگر ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے کبھی خط تک نہیں بھیجتے کہ استاد کی خیریت ہی معلوم کر لیں حالانکہ چاہئے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی اس کے حقوق ملحوظ رکھے جس کا خلاصہ دو باتیں ہیں ایک اس کے لئے دعتِ مغفرت ہمیشہ کرتے رہنا، دوسرے اس کے اقارب

واجاب اور معاصرین کی تعلیم و خدمت کا خیال رکھنا جیسا کہ والدین کے اس قسم کے حقوق کی حدیث میں تاکید ہے۔

کچھ بذنبیب ایسے ہیں جو کسی نفسانی غرض سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں اور تحریراً یا تقریراً ان کی شان میں گستاخی کرتے ہیں حالانکہ استاد وہ چیز ہے کہ اگر دینی ضرورت سے بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تو بھی کافر باپ کی طرح دین میں مخالفت کرنے کے باوجود ادب و احترام ترک نہ کرے۔

جو اساتذہ کسی مدرسہ سے تنخواہ پاتے ہیں ان کے حقوق اور بھی ضعیف سمجھے جاتے ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ ان حقوق کی جو بنیاد ہے وہ تنخواہ پانے سے معدوم نہیں ہو گئی، کیا تنخواہ تعلیم دین جیسے احسان کا بدل ہو سکتی ہے اگر اس نے محض تنخواہ یا دنیا کی نیت سے بھی تعلیم دی تو بھی تنخواہ کم ہو جاتے مگر احسان تو ویسا ہی ہے۔

بعض شاگرد استاد کی تعلیم و تکریم اس کی کسی دنیوی وجاہت و عظمت کی وجہ سے کرتے ہیں وہ بھی شاگردی کی خوبی نہیں چنانچہ اگر استاد جاہ و شہرت میں شاگرد سے کم ہو تو بعض ناخلف اپنے کو اس کی طرف منسوب کرنے میں بھی عدا سمجھتے ہیں مبارک ہے وہ جو ایسے استاد کا بھی حق استادی ادا کرے

متعلم کے حقوق

اس کے بعد اب کچھ متعلم و شاگرد کے حقوق، معلم و استاد بھی اپنے اوپر سن لیں۔ اُنْعِ اِلٰی سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ

الْحَسَنَةِ وَجَادَ لَهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط اس آیت سے نصاً معلوم ہوا کہ مستفیدین کے ساتھ اگرچہ وہ طالب نہ ہوں (کیونکہ آیت میں معبودین ایسے ہی لوگ ہیں) ان کے مذاق و استعداد اور رفیق و ملاطفت کی رعایت ضروری ہے، ابتدائی خطاب (مثلاً کتاب کی تقریریں بھی جیسا کہ اُدْعُ سے مراد ہے اور سوالات کے جواب میں بھی جیسا کہ "جَادَ لَهُمْ" سے یہی مقاولت مراد ہے۔

اور حدیث میں تو صاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ ہمارے پاس دور دراز ملکوں سے علم دین سیکھنے آئیں گے ان کے بارے میں میری وصیت ہے کہ بھلائی سے پیش آنا

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹا ہے جس سے معلوم ہوا کہ سبق میں غلط سلط یا مستفی کو غلط فتویٰ بتلا دینا حرام ہے۔ جیسا کہ بعضوں کے عادت ہے کہ اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہیں اتنا کہتے کی توفیق نہیں ہوتی کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، سوچ کے بتائیں گے یا دوسرے سے پوچھ لیں، یا طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدیں اس سے عار آتی ہے۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا آپؐ بارہا کسی سوال کے جواب میں فرمادیتے کہ نہیں معلوم اور جب وحی نازل ہوتی اس وقت بتلا دیتے اور حدیث ہی میں ہے کہ اگر کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتلا دیا تو اس کا وبال بتانے والے پر ہوگا۔

اس میں کئی خرابیاں ہیں اگر طالب علم کو تپہ لگ گیا کہ استاد نے غلط سسلط
بتلا دیا ہے تو اس سے نفرت اور دل میں حقارت پیدا ہوگی جس استاد کی
کے حقوق ادا کرنا دشوار ہوگا اور اگر تپہ لگا تو طالب علم بچارہ عمر جبریل میں
مبتلا رہا جس کا سلسلہ آگے معلوم نہیں کہاں تک جاتے پھر اسناد
کے اخلاق اکثر شاگرد میں سرایت کر جاتے ہیں تو یہ ہٹ دھرمی اور سخن
پروری کا عیب شاگردوں میں بھی پیدا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر حجرات کو وعظ
فرمایا کرتے تھے کسی نے عرض کیا کہ حضرت روزانہ فرمایا کریں۔ تو فرمایا میں تم
کو تھکانا نہیں چاہتا۔ اور میں تمہارا ایسا ہی خیال رکھنا چاہتا ہوں جیسا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا خیال فرماتے تھے کہ ہم تنگ نہ جائیں
اس حدیث سے مستفیدین علم کا یہ حق بھی معلوم ہوا کہ ان کے
شوق و نشاط کو باقی رکھنے کا بھی خیال رکھے، مثلاً اتنا سبق نہ پڑھاتے
یا اتنی کتابیں نہ شروع کراے کہ طالب علم اتنا جائیں۔ بعضے تعطیل
میں بھی طالب علموں کی جان مارتے اور اس کو اپنی بڑی کارگزاری جانتے ہیں
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے اور ایسے وقت
آکر طے کہ نماز کا وقت آگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے جلدی میں کسی وجہ
پاؤں دھونے میں کچھ سوکھا رہ گیا۔ تو آپ نے دو تین مرتبہ زور سے فرمایا
کہ خبردار عذاب ہے ان ایڑیوں کے لئے جو سوکھی رہ جائیں۔

اس سے تین حق شاگردوں کے ثابت ہوتے ایک تو یہ کہ صرف
قلیم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال کی بھی نگرانی رکھے۔ جس کی طرف

اب بالکل ہی توجہ نہیں کی جاتی۔ اساتذہ صرف سبق پڑھانے کو فریضہ سمجھتے ہیں۔ دوسرا حق یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے اس کا احتمال ہو کہ بدوں آواز بلند کئے آواز نہ پہنچے گی مثلاً حلقہ درس پڑا ہو تو تقریر بلند آواز سے کرے، تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار کی تقریر سے طلبہ نے نہ سمجھا ہو گا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کر دینا مناسب ہے، اور یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی بات مہتمم بالشان ہوتی تو تین بار فرماتے تاکہ لوگ خوب سمجھ لیں۔

بعض اہل علم کو ضرورت بلا ضرورت اپنے علم کے اظہار کا عارضہ ہوتا ہے جس سے بعض جماعتوں کو ضرر بھی ہوتا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاذ رضی فرمایا کہ جو شخص مرے امیر خدا سے اس حال میں ملے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گا تو حضرت معاذ نے عرض کیا کہ کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں آپ نے فرمایا نہ سناؤ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ اس پر حکم نہ کر لیں۔

دیکھو یہ مضمون اپنی جگہ صحیح اور شریعت کے مقاصدِ عظیمہ میں سے تھا پھر بھی آپ نے لوگوں کے ضرر کے خیال سے اس کی اشاعت ناپسند فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ جو مسئلہ یا کتاب کسی طالب علم کے لئے مضریا نامناسب معلوم ہو اس سے روک دینا بھی اساتذہ کے ذمہ ہے اور طالب علم کو اس میں استاذ کی اطاعت لازم ہے۔ حضرت ابن عمر رضی فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ دیا گیا۔

میں نے خوب سیر ہو کر پایا۔ کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا۔ پھر بچا ہوا دودھ عمر کو دیدیا۔ لوگوں نے عرض کیا حضور اس کی تعمیر کیا ہوئی؟ فرمایا دودھ سے مراد علم ہے۔

اس سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لبین کے اور ایک معنی لبین کے۔ اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا کرے جس سے اس کا دل بڑھتا اور محبت زائد ہوتی ہے اور جس قدر استفادے محبت ہوگی اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اگر حق تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی نعمت عطا فرمائے تو شاگرد سے دریغ نہ کرے غرض ظاہری و باطنی غذا کا کچھ حصہ اس کو بھی دے

ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فلاں شخص کی نماز اتنی طویل ہوتی ہے کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ نہ پاسکوں یعنی بد دل ہو کر جماعت چھوڑ دوں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اتنا برا فروختہ ہوئے کہ کبھی اتنا برا فروختہ ہوتے نہ دیکھا تھا۔ پھر اپنے فرمایا کہ تم لوگوں کو متفر کرتے ہو، جو نماز میں امامت کرے اس کو چاہئے کہ (قرارت میں تخفیف سے کام لے، کیونکہ نماز میں مریض، ضعیف و ما جتہد سب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس سے بھی دو امر ثابت ہوئے ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق اپنے شاگرد دیا ماتحت کے سپرد کئے جائیں اور اس کی شکایت ہو تو شکایت سننا اور تحقیق کے بعد انتظام کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ شکایت کرنے والے کو محض طالب علم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے

دوسرا یہ کہ اگر کسی شاگرد یا طالب علم سے کوئی نامناسب حرکت ہو اور

معلوم ہو کہ غصہ ہو کر کہنے سے زیادہ نفع ہوگا تو اس کی مصلحت سے غصہ ہی کرنا افضل ہے۔

عورتوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم پر مرد غالب آگئے ہیں کہ آپ کا وعظ سننے کا ہم کو موقعہ نہیں ملتا ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیا جائے آپ نے مقرر فرمادیا اس سے اوقات کی تعیین و تقسیم اور طلبہ کی جماعت بندی کا مصلحت ہونا معلوم ہوا۔ ایک عظیم مصلحت یہی ہے کہ جن کے لئے جدا سبق مناسب ہے وہ ایک ہی میں کیسے شریک ہوں اس قسم کی خاص خاص باتوں کے ساتھ ساتھ شاگردوں کا ایک عام اور بڑا حق یہ ہے کہ ان کے حق میں علم کی دعا بھی کیا کرے جیسا کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر کو سینہ سے لگالیا اور فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرمائیے۔

شرکائے علم کے حقوق :- آگے شرکائے علم کے حقوق کا بقدر ضرورت بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی عوالی مدینہ میں کچھ فاصلہ پر رہا کرتے تھے اور باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے جس دن میں جاتا جو کچھ سن کر آتا ان سے بیان کر دیتا جس دن وہ جاتے مجھ سے بیان کر دیتے۔ اس معلوم ہوا کہ اپنا شریک تعلیم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق اس کو حکم کر دیا جائے اور یہ اس کا حق ہے، نیز مدعوں میں باری باری سے پڑھنے کی بھی اس سے اصل عکلتی ہے، باقی خود کلام محمدیؐ والجار والجنب والعتبا بالجنب یعنی ہمسایہ و ہم صحبت یا سنا اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ احسان کا جو حکم ہے وہ حسب موقع شرکائے تعلیم کا بھی ایک دوسرے پر حق ہے جیسا کہ مفسرین نے شریک تعلیم کے ساتھ اس کی تفسیر بھی کی ہے۔

اس کے علاوہ شرکائے تعلیم کے باہمی حقوق کی پوری

پوری تفصیل و تکمیل کے لئے حضرات صحابہ کی باہمی معاشرت و طرز عمل کا پیش نظر رکھنا کافی ہوگا اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سب کے سب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہی تھے

ضروری تنبیہات

آخر میں تین ضروری تنبیہات فرمائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ گو متعلم کے مفہوم میں متعارف استاد کی طرح پیر، واعظ اور مصنف جس سے بھی افادہ و استفادہ کا تعلق ہو سب داخل ہیں لیکن حقوق سب کے مساوی نہیں بلکہ متعارف معنی میں جس کو استاد کہا جاتا ہے اس کا حق زیادہ ہے اولاً تو اس لئے کہ یہ استاد شاگردوں کے لئے جتنی مشقت برداشت کرتا ہے دوسرے اہل افادہ نہیں کرتے بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت ہی نہیں اور بعض میں اگرچہ مشقت ہے مگر وہ کسی خاص مستفید کے لئے برداشت نہیں کرتا۔ حالانکہ ووصینا الانسان بوالدیه حملته امّہ کرہا ووضعتہ کرہا کی نص قطعی سے مشقت کی بناء برحق کا عظیم ہونا ثابت ہے۔ ثانیاً شاگرد استاد کی تابعیت کا التزام کرتا ہے اور التزام ایک وعدہ ہے اور وفائے عہد لازم ہے۔

عام لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں کہ پیر کی تعظیم اور خدمت و اطاعت میں تو حدود شرعیہ سے بھی تجاوز کرتے ہیں لیکن استاد کے حقوق ادا کرنے میں حد شرعی کے قریب بھی نہیں پہنچتے اور یہ شریعت کی تغیر کے سوا کیا ہے ؟

دوسری قابل تنبیہ بات یہ ہے کہ استاد اور پیر کا حق زیادہ ہے یا باپ کا اس میں بھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیر اور استاد روحانی مربی ہیں اور باپ جسمانی اور روحانی مربی کا درجہ جسمانی سے بڑا ہے اس دعویٰ کی غلطی اجمالاً اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ نصوص میں جس شد و مد سے باپ کے حقوق بتلائے گئے ہیں استاد اور پیر کے نہیں بتلاتے گئے دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ باپ نرا جسمانی مربی ہے حالانکہ اس کے ذمہ روحانی تربیت بھی ہے خود نہ کر سکے تو کسی اور استاد کے پاس یا مدرسہ میں بھیجے جیسا بہت سے کرتے ہیں۔

اتنا بھی نہ کرے تو قابل مواخذہ ہے جیسے کوئی باپ جسمانی تربیت یا کھلا پلانے میں کوتاہی کرے بہر حال باپ باپ ہی ہے جہل کی اور بات ہے ورنہ اس کے برابر جسمانی و روحانی اعتبار سے خیر خواہ کون ہو سکتا ہے، پھر

سب سے بڑے روحانی مربی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حق تعالیٰ تو جسم و روح دونوں کے مربی ہیں اور جب خدا و رسول نے ہی باپ کا حق زائد فرما دیا تو ان کی اطاعت بڑے مربی کی چھوٹے مربی کے حق پر تقدیم ہے۔ البتہ واجبات شرعیہ کی مخالفت میں نہ باپ کی اطاعت ہوگی نہ استاد پیر کی اور مباحات میں باپ کا حق مقدم ہوگا، تیسری تنبیہ یہ ہے کہ آیا معقولات، فاری اور حساب وغیرہ کے استاد بھی حقوق مذکورہ کے حقدار ہیں یا نہیں، اسی طرح کافر استاد بھی، اس میں قواعد سے تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو چیزیں مضر ہیں ان کا استاد تو خود مضر و مضل ہے اور استاد کا جو کچھ حق تھا وہ بوجہ مفید و محسن ہونے کے اور جو چیزیں مضر نہیں ہیں ان میں تفصیل ہے کہ اگر علوم دینیہ میں نافع و مہین

ہیں تو چونکہ مقدمہ کا حکم مقصود کا ہوتا ہے اس لئے ایسے اساتذہ حقوق مذکورہ کے مستحق ہوں گے گو استاد مقاصد کے درجہ میں نہ سہی جس طرح اقرار کے حقوق میں قوتِ قربت کے تفاوت سے حقوق میں تفاوت ہو جاتا ہے اور اگر نہ مضر ہیں نہ مفید تب بھی ایک دنیاوی احسان ہے اور دنیوی احسان پر شکریہ گزاری نصوص عامہ سے ثابت ہے اس لئے اس کا بھی حق ثابت ہو گا گو دینی احسان کے برابر نہ سہی

اقتباسات بالا میں صریح نصوص سے جو استنباطات فرماتے گئے ہیں اور ان سے طلبہ و اساتذہ کو تعلیم و تعلم کے جن حقوق و آداب کی طرف متوجہ اور جن کوتاہیوں پر متنبہ فرمایا ہے، دنیوی درسگاہوں یا انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے اکابر و اصاغر کی خدمت میں تو اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہی عبث ہے ان کی تو دنیا ہی الگ ہے البتہ عربی و دینی مدارس کے اساتذہ و تلامذہ کی ان سے غفلت بلکہ الٹے انگریزی اسکولوں اور کالجوں ہی کے اساتذہ اور شاگردوں کی نقالی کو فخر جانے کی جو وہاں میں بھی پھیل گئی ہے اس کی بناء پر حضرت مجدد کی اس باب میں تجدیدات و اصلاحات بالا کی کچھ مزید تفصیل و تشریح کا جی چاہتا تھا مگر کس کس چیز کی کہاں کہاں تک شرح کیجاتے ،

تنہمہ داغ داغ شد پنہمہ کجا کجا نہم

باقی مدارس دینیہ کے مخلص و اہل فکر حضرات کے لئے جن کو دل سے کچھ اصلاح کی فکر ہے حضرت کے یہ اجمالی ارشادات و اشارات بھی رہنمائی کے لئے کافی ہیں ورنہ اکثر دس اندلیتہ تو ان باتوں کو محقرات امور کہہ کر ٹال دینے کا ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی اور ان کی اصلاح سے بے فکری کا یہ بھی ایک چلتا ہوا بہانہ بنایا گیا، کہ یہ چھوٹی اور حقیر باتیں ہیں جس کا جواب دہی ہے جو حضرت ایسے مواقع پر فرمایا

کرتے تھے کہ ”اچھا تو ایک چھوٹی سی چنگاری اپنے کپڑوں کے صندوق میں رکھ دو“

اصلاح تعلیم نسواں

وقت کی رائج و مقبول بولی اگر بولی جاتے تو کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام تہذیب و تمدن میں عورت کو چونکہ اصلاً و اصولاً کسب معاش کی فکر و ذمہ داری سے آزاد رکھا گیا ہے اس لئے خالص معاشی و دنیوی تعلیم کی توجہ استثنائی حالتوں کے اس کو حاجت ہی نہیں، زیادہ سے زیادہ کچھ گھریلو اور ہلکی قسم کی ایسی دستکاریوں کی تعلیم کافی ہے جو اتفاقی صورتوں میں عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ گزراوقات میں معین ہوں۔ اسی طرح دینی تعلیم میں بھی عام و عظیم تبلیغ یا مدارس میں درس و تدریس وغیرہ کی متعدد خدمات دین بھی عورت کے فرائض میں داخل نہیں اس لئے قدرۃً اس کی تعلیم کا معیار و معاملہ خود اپنے دین کی فکر و درستی، اپنے بچوں کی تربیت و نگرانی یا خاص شرطوں کے ساتھ خود اپنی ہجمنسوں کی دینی تعلیم و خدمت تک محدود رہ جانا اس محدود ضرورت کی تمام اطراف و جوانب کی جامعیت کے ساتھ خود حضرت

جامع المحمدین علیہ الرحمۃ نے بڑی حد تک ہستی زیور کے ذریعہ تکمیل فرمادی ہے لیکن عورتوں کی تعلیم کی یہ محدودیت مردوں کے مقابلہ میں اس کی اہمیت میں کمی کو ہرگز مستلزم نہیں بلکہ ابتدائی تربیت کے ذریعہ بچوں میں دین کو راسخ کرنے کے لئے یہ زیادہ اہم و الزم ہے اس لئے حضرت نے مختلف مواظب و مضامین وغیرہ میں اس کی مستقلاً اور جا بجا تفصیل و تاکید فرمائی ہے۔ ایک طویل مضمون ”اصلاح تعلیم نسواں“ کے عنوان سے رسالہ انقاسم میں شائع فرمایا تھا پھر کچھ رد و بدل کے

ساتھ بطور ضمیمہ ہشتی زیور میں شامل فرما دیا اس مضمون میں افراط و تفریط کی ان کوتاہیوں کی اصلاح فرمائی گئی ہے جو بالعموم عورتوں کی تعلیم کے معاملہ میں لوگ کرتے ہیں۔

مختلف خیالات

تین خیال کے لوگ ہیں ایک وہ جو نہ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں نہ حامی مگر تعلیم کا اہتمام نہیں، دوسرے جو مخالف ہیں اور تیسرے حامی۔ ان سب سے مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

طبقہ اول

اس کی سب سے اشد و اعظم کوتاہی یہ ہے کہ ایسے خیال کے مردوں اور عورتوں کے نزدیک عورتوں کو تعلیم دینے کی سب سے ضرورت ہی نہیں اور دلیل یہ ہے کہ کیا عورتوں کو نوکری کرنا ہے، ان لوگوں نے نہ تعلیم کی غرض سمجھی اور نہ نصوص و روایات میں غور کیا۔ جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے تحصیلِ علم کو ایک درجہ میں فرض و واجب قرار دے رہی ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ علم سے غرض نوکری نہیں کیونکہ جس علم کا حاصل کرنا شہرخص پر واجب ہے وہ علم معاش نہیں علم دین ہے جس سے انسان کے عقائد و اعمال، معاملات، معاشرت، اور اخلاق درست ہوں جس کا ثمر و دنیا میں اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّنْ رَبِّهِمْ ہے کہ یہی لوگ اپنے رب کی راہ پر ہیں اور آخرت میں اُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ کی بشارت کہ انہی کے لئے کامیابی ہے لہذا اس تعلیم کا وجوب نقلاً و عقلاً

ظاہر ہے نقلًا تو طلب العلم واجب علی کل مسلم۔ طَلَبُ الْفِقْهِ حَتْمٌ
واجب علی کل مسلم۔ یا ایہا الناس علیکم بالعلم اور ویل لدن
لا یعلم وغیرہ روایات ہیں۔

جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کے وجوب و فرضیت کی بنیاد نفس اسلام
کے لئے ہے نہ کہ عورت یا مرد کی خاص جنس و صنف کے لئے، اس لئے کہ اسلام
کی حقیقت ہی خاص عقائد و اعمال کے علم و عمل کے سوا کیا ہے اور عمل بلا علم کے
کیسے ممکن ہے اس لئے عقلاً بھی ثابت ہے کہ جب اصلاح عقائد و اعمال فرض
ہے اور وہ موقوف ہے ان کا علم حاصل کرنے پر اور فرض جس پر موقوف ہو اس کا
فرض ہونا بدیہی ہے۔ البتہ اس کے لئے عرفی یا کتابی علم فی نفسہ واجب نہیں۔ صحیح
اعمال و عقائد کا کسی نہ کسی طرح سُن سنا کر بھی جان لینا کافی ہے۔

لیکن یہاں تین بانیں قابل غور ہیں اول یہ کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب
ہوتا ہے جیسے جو شخص پیدل سفر حج کرنے پر قادر نہ ہو اور ریل و جہاز
وغیرہ کی استطاعت رکھتا ہو تو اس پر واجب ہوگا۔ کہ سفر کا عزم کرے
اور ریل و جہاز کا ٹکٹ لے کہ اس پر سوار ہو، سو ریل یا جہاز کا ٹکٹ خریدنا
اور اس پر سوار ہونا فی نفسہ شرطاً واجب نہیں لیکن ایک فرض کا ذریعہ
ہے اس لئے یہ بھی فرض ہوگا مگر بالغیر، دوسرے تجربہ سے معلوم ہوا کہ
اب علم کا محفوظ رہنا کتابوں ہی کے پڑھنے پڑھانے پر موقوف ہے جو تعلیم کا
متعارف طریق ہے اور علم دین کا محفوظ رکھنا واجب ہے لہذا بطریق متعارف
تعلیم کا جاری رکھنا بھی واجب ہے البتہ یہ واجب علی الکفایہ ہے یعنی ہر مقام
پر اتنے آدمی دینیات پڑھے ہونے چاہئیں کہ اہل حاجت کے دینی سولہ
کا جواب دے سکیں۔

عشق بازی کے قصے، سازش اور لگاوٹ کے ناول، ترقی انگیز غزلیں، سچے ان سے طبیعت بگڑتی ہے وغیرہ وغیرہ، ان واقعات انکار نہیں لیکن ان کی حقیقت کے سمجھنے میں کوتاہ نظری سے کام لیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان سب خرابیوں کی ذمہ دار تعلیم نہیں بلکہ نصابِ تعلیم، طرزِ تعلیم، طرزِ عمل، یا سوسائٹی ہے۔ یعنی یا تو ایسی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں جن سے حلال و حرام کے احکام، ثواب و عذاب کی تفصیل اور تہذیبِ اخلاق کا طریقہ معلوم ہو اور جن سے دل میں خوف و خشیت اور حق کی معرفت و عظمت پیدا ہو، یا یہ ہو کہ نصابِ تعلیم کے کافی و مفید ہونے کے باوجود مضامین کو قلب میں جمانے کی کوشش اور ان پر عمل کی نگرانی نہیں کی گئی مثلاً جس روز لڑکی یہ پڑھے کہ غیبت گناہ ہے اس کے بعد جب غیبت کرے تو فوراً اس کو ٹوکا اور یاد دل جائے کہ دیکھو تم نے کیا پڑھا ہے اور اس کے خلاف کرتی ہو..... اس طرح اگر ان کو برابر متنبہ کیا جاتا ہے تو امید ہے کہ اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کا ان میں ملکہ پیدا ہو جائیگا ہاں اگر طبیعت ہی میں خرابی ہو، تو

ع ناکس بہ تربیت نہ شود لے حکیم کس

غرض مفسد کے اسباب یہ ہیں تو اس میں عورتوں کی کیا تخصیص، یہی اسباب مفسد مردوں کو پیش آئیں تو وہ بھی ویسے ہوں گے۔ البتہ عرفاً ان قبائح کا عورتوں سے صدور، یا ان کی نسبت رسوائی و ذلت کا زیادہ موجب خیال کی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس باب میں مرد و عورت یکساں ہیں اور عرف کو شرح پر اس طرح ترجیح دینا بہت بڑا شعبہ ہے جاہلیت کا۔.... جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ مردوں کے لئے ایک معصیت کو ضعیف سمجھتے ہیں اور عورتوں کے لئے شدید، جس پر استحقاقِ دین کے فتوے کا اندیشہ اور سخت اندیشہ ہے۔

تیسری طبقہ

باقی جو تعلیم نسواں کے حامی ہیں ان سے اس تعلیم کی تعیین اور اس کے طریقہ کی تجویز میں غلطی ہوتی ہے ان کی بعض غلطیوں کا بیان اوپر طبقہ ثانیہ کی اصلاح کے ضمن میں گذر چکا۔ مثلاً ان کو صرف پڑھا کر چھوڑ دینا۔ کہ جس قسم کی دایمات، خرافات کتابوں اور رسالوں کا جاہیں آزادی سے مطالعہ کرتی ہیں، یا تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت اور عمل کی نگرانی کا خیال نہ رکھنا۔

ان کے علاوہ بعض یہ ہیں کہ مستورات کو بجائے علوم دینیہ پڑھانے کے تاریخ جغرافیہ، یا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انگریزی پڑھاتے ہیں جس کی وجہ صرف یورپ کی تقلید ہے حالانکہ ہم میں ان کے رسوم و عادات و عجزہ کے علاوہ سب بڑا فرق مذہب کا ہے وہ یا تو کوئی مذہب نہیں رکھتے، اور زیادہ ایسے ہی ہیں اور یا ان کا مذہب ہمارے مذہب سے الگ ہے اس لئے ان کو یا تو مذہبی تعلیم سے سروکار ہی نہیں یا اپنے مذہب کی تعلیم ہوگی یا صرف دنیوی معلومات۔

لہذا جب ان کی غرض تعلیم اور ہے اور ہماری اور جس کا اوپر طبقہ اولیٰ کی اصلاح خیال میں ذکر ہوا۔ یعنی ہماری غرض تعلیم اسلامی عقائد و اعمال، معاملات معاشرت اور اخلاق کا علم اور ان کی اصلاح ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی تقلید کرنا ہمارے لئے بالکل بے جوڑ ہے۔

بعض لوگ اپنی لڑکیوں کو آزاد و بیباک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں اور صحبت کا اخلاق و جذبات پر ضرور اثر پڑتا ہے، خاص کہ جب ہم صحبت بڑا اور ایسا ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ استاد کی عظمت و اطاعت دونوں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اگر استانی آزاد و بیباک نہ ہو لیکن ہم سبق لڑکیاں ایسی ہوں تب

بھی اسی کے قریب قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

اس تقریر سے تعلیم کی دو خاص صورتوں کا حال بھی معلوم ہو گیا جن کا اس وقت بے تکلف مداح ہے، ایک لڑکیوں کے لئے عام زمانہ اسکول بنانا اور عام مدرسوں کی طرح اس میں مختلف قوم اور مختلف طبقات و خیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو استانی مسلمان ہی ہوا اور پردہ کا بھی اہتمام ہوتا ہم واقعات و تجربہ نے دکھلادیا کہ یہاں بھی ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کا اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے اور اگر استانی بھی کوئی مکار اور آزاد مل گئی تو کرملیا نیم چڑھا۔

دوسری صورت یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم صاحبہ سے بھی روزانہ یا ہفتہ وار تعلیم کی نگرانی یا صنعت سکھانے کے بہانہ سے اختلاط ہونے لگتا تب تو نہ آبرو کی خیر ہے زلیمان کی، مگر افسوس صد افسوس کہ بعض لوگ ان آفات کو مایہ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں۔

اسلم طریقہ لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانہ و زمانہ سے چلا آرہا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے تعلقات کی جگہ آویں اور پڑھیں۔ اگر ایسی استانی مل جاتے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت و با اثر ثابت ہوتی ہے ورنہ بدتر مجبوری تنخواہ کا بھی مضائقہ نہیں اور جہاں کوئی بھی استانی ایسی نہ ملے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں نصائے تعلیم یہ ہو کہ اول کلام مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جائے پھر ہل زبان کی دینی کتابیں جن میں تمام اجزائے دین کی مکمل تعلیم ہو اس وقت ہمیشہ زلیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں، اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرم کے ہوں ان کو چھوڑ دے اور اپنی بیوی کے ذریعہ سمجھو دے، اور یہ انتظام بھی نہ ہوا سکے تو ان پر نشان کر دے کہ وہ سیانی ہو کہ خود سمجھ لیں، یا عالم شہر میسر ہو تو اس سے پوچھ لیں گی یا شہر کے ذریعہ عالم سے تحقیق کرا لیں گی۔

بہشتی زیور کے آخر میں کچھ اور مفید رسالوں کے نام بھی لکھ دیئے ہیں جن کا پڑھنا اور مطالعہ عورتوں کے لئے مفید ہے اگر سب نہ پڑھے تو ضروری مقدار پڑھ کر باقی کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں، نیز تعلیم کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا اہتمام بھی رکھیں کہ ان کو پڑھنے پڑھانے کا شوق پیدا ہوتا کہ عمر بھر علمی مشغول رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تخریص ہوتی رہتی ہے۔

اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں قابلیت دیکھیں تو عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن و حدیث و فقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں البتہ قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطیاں کرتی ہیں اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں۔

یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی، رہا لکھنا تو اگر قرآن سے طبیعت میں بیباکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ خانگی ضرورتوں کے لئے اس کی بھی حاجت ہوتی ہے اور اگر خرابی کا اندیشہ ہو تو مفاسد بچنا غیر واجب مصلح کے حاصل کرنے سے اہم ہے ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھلاویں

تحقیق تعلیم انگریزی

یہ تو تفصیل تھا متردنی تعلیم سے متعلق اصلاح و تجدید کی تھی جو تعلیم دین کے تمام اطراف و جوانب کو محیط ہے، دینی مدارس ان کے اساتذہ، اوطلباء ان کے نصاب تعلیم و طرز تعلیم، علماء و عوام کا باہمی استفادہ و افادہ، واعظ و افتاء، تالیف و تصنیف، عورتوں کا مسئلہ تعلیم، غرض تعلیم دین کے جس گوشہ میں جو خلل و فساد نظر آیا اس پر تنبیہ اور اس کے ازالہ کی تدبیر فرمائی گئی، امد و معدودین کو اصولاً و اصولاً تعلیم دین ہی کی تجدید سے سروکار تھا جو گویا اصلاح کا

ایجابی پہلو تھا۔

لیکن اس ایجاب کا ایک سلب بھی بہت تحقیق طلب تھا پرہیز کے بغیر کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔ لادینی حکومت و سیاست کے غلبہ و تسلط کی بدولت ایک ایسا نظام تعلیم مسلط ہو گیا ہے جو اپنی فطرت و ساخت، اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے بالکلہ دین پرستی کا معلم اور دین کی بالکلہ ضد اور نفی واقع ہوا ہے یہ وہ جدید یا ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم ہے جو دین کے لحاظ سے گویا مکھیوں کا پکا ہوا سالن ہے یا کاغذی جراثیم میں لپٹا ہوا چوہا جس کو جلا دینے یا جس سے بھاگ کھڑے ہونے ہی میں جان کی سلامتی ہے اسی طرح ایمان کی سلامتی بھی، جس کو ایمان عزیز ہو اس جدید یا انگریزی تعلیم سے بُعد و فرار ہی میں ہے۔ یہی خلاصہ ہے اس مختصر و محققانہ مضمون کا جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے تحقیق و تعلیم انگریزی کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے اور جو محض معنی ہی محققانہ نہیں صرف بھی چند مسلم و بدیہی مقدمات پیش فرما کر ان کے منطقی نتائج کو واضح فرما دیا گیا ہے۔ اس طرح کہ پہلے دس مقدمات پھر ایک ایک مقدمہ کے حوالہ سے ان کے لازمی نتائج بیان فرمائے گئے ہیں

لیکن چونکہ آج کل کے خطابت پسند دماغ بالعموم اتنی منطق کے متحمل نہیں ہے اس لئے ذیل میں خفیف لفظی رد و بدل کے ساتھ اس کو پیش کیا جاتا ہے خصوصاً نتائج کو سب مقدمات کے بعد نہیں بلکہ ساتھ ساتھ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ذہن کو ہر نتیجہ کی گرفت اور مقدمہ سے اس کے ربط میں دشواری نہ ہو۔

پہلا مقدمہ

کسی شے کا قیح ہونا یا تو ذاتی ہوتا ہے یا عارضی، جیسے زنا و سرقر کہ قیاحت

ان کی ذات ہی میں داخل ہے کسی عارضی چیز کی وجہ سے نہیں آئی اس لئے یہ کبھی کسی حالت میں جائز و مباح نہیں ہو سکتے اور عارضی چیز کی مثال جیسے اذان جمعہ کے بعد خرید و فروخت ہے کہ یہاں نفس بیع میں کوئی خرابی نہیں بلکہ ایک عارضی سبب یعنی قَامَسَعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰہ کے حکم کی وجہ سے جمعہ کی اذان کے بعد بیع ناجائز و ممنوع ہوگی۔

نواب ظاہر ہے کہ انگریزی اپنی ذات میں محض ایک زبان ہے اور اس کی تعلیم متعارف نصاب کے اعتبار سے چند علوم و فنون کا نام ہے اور کسی زبان یا علم و فن کا سیکھنا اپنی ذات میں ممنوع نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مقدمہ

البتہ جو چیز کسی عارضی و خارجی سبب سے مفاسد کا ذریعہ بن جائے تو بذات خود مباح ہونے کے باوجود ان مفاسد کی وجہ سے عارضی طور پر حرام ہو سکتی ہے جیسے ہتھیار فروخت کرنا بذات خود جائز ہے لیکن دشمن یا غداروں کے ہاتھ بوجہ غدر و دشمنی کے فساد کے حرام ہے۔

لہذا اگر انگریزی تعلیم پر بھی مفاسد مرتب ہوتے ہوں تو فی نفسہ جائز و مباح ہونے کے باوجود ان مفاسد کی وجہ سے حرام و ممنوع قرار پائے گی۔

تیسرا مقدمہ

دین، نماز، روزہ حج و زکوٰۃ وغیرہ صرف ظاہری اعمال ہی کا نام نہیں بلکہ سب سے بڑھ کر عقائد کا جڑ ہے جس پر نجات کا مدار ہے، اور ایک جڑ صبر و شکر، اخلاص و تواضع وغیرہ اخلاقی حمیدہ کلمہ ہے وہ بھی محققین کے نزدیک نماز و روزہ ہی کی

کی طرح فرض ہے اگر کوئی صرف چند اعمال ظاہری کو پورا کر لے نہ عقائد ٹھیک ہوں نہ اخلاق تو اس کو پورا مسلمان ظاہر ہے کہ نہ کہا جائے گا۔

اب انگریزی تعلیم کے جو آثار و نرات مشاہد ہیں وہ ملاحظہ ہوں کہ نماز روزہ میں کاپی بلکہ اعراض، عقائد میں ضعف بلکہ تشویش و انکار، اخلاق میں بکبر و نمائش و تصنع اور کافروں کی تقلید بلکہ دینداروں کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھنا۔

چوتھا مقدمہ

جس دنیا کی قرآن و حدیث میں ممانعت ہے اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں حُب مال، اور حُب جاہ، یعنی مال و جاہ کا ایسا محبوب ہونا کہ ان کے مقابلہ میں دین کے ضائع ہونے کا صدمہ نہ ہو، یعنی جس چیز سے مال و جاہ کی ترقی لیکن دین کا تنزل ہو تو مال و جاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پرواہ نہ کرنا۔ قرآن و حدیث پر جن کی نظر ہے ان کے نزدیک یہ مقدمہ اعلیٰ بدیہیات میں ہے

انگریزی تعلیم یافتہ دماغ کا کام دن رات مالی ترقی اور جاہ و منصب کے حصول کی ہوس پکھانا۔ ان کی تحصیل کے پیچھے شرعی احکام کی ذرہ برابر بھی نظر میں وقعت نہ رہنا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جو اللہ و رسول کے نزدیک مبغوض و ملعون ہے

پانچواں مقدمہ

شریعت کے احکام کا دار و مدار حقیقت پر ہے نہ کہ نام پر پس اگر شراب کو شربت یا زنا کو نکاح کا نام دیدیا جائے تو اس سے حکم نہ بدل جائے گا دونوں

بدستور حرام ہی رہیں گی۔

تو گو اس وقت ہو سنا کوں نے اسی ملعون و مبغوض دنیا کا نام ادلوا الغری
و ترقی رکھ لیا ہے لیکن نام یا عنوان بدل جانے سے حقیقت یا معنوں تو نہیں بدل
جاتا۔

چھٹا مقدمہ

کسی شے پر جو حکم لگایا جاتا ہے وہ غلبہ و اکثریت کی بناء پر ایک آدھ استثناء
اس حکم کو غلط نہ ٹھہرائے گا مثلاً سنکھیا کی ایک خاص مقدار عام طور سے
مہلک ہوتی ہے لیکن اگر اتفاق سے کوئی شخص ہلاک نہ ہو تو اس سے سنکھیا
کے مہلک یا نہ ہر قاتل ہونے کے حکم میں فرق نہ آئے گا۔

اسی طرح اگر بعض لوگوں میں انگریزی تعلیم کے مذکورہ بالا آثار نہیں پیدا ہوتے
ہیں تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

ساتواں مقدمہ

اگر کسی چیز پر کسی خاص اثر کے مرتب ہونے کا حکم
لگایا جاتے تو اس کے اسباب کا معلوم ہونا ضروری نہیں مشاہدہ و تجربہ ہی
بالکل کافی ہے، مقناطیس کی علت و سبب نہ بھی معلوم ہو تو بھی اس کے اثر
کا حکم لگانے کے لئے کشش کا مشاہدہ و تجربہ کافی ہے

لہذا صحت حکم کے لئے اس سے بحث ضروری نہیں کہ انگریزی تعلیم کے
اثرات ملاحظہ کی صحبت، مصنفین کے خیالات، سائنس وغیرہ کسی
خاص فن کی تعلیم، یا تعلیم دین کے عدم اہتمام وغیرہ کس سبب سے پیدا ہوتے ہیں
جب تک یہ آثار پیدا ہوتے رہیں گے عدم جواز کا حکم بدستور قائم رہیگا۔ ہاں

اس کی اصلاح کے لئے ان اسباب پر بحث ہوگی جس کا ذکر راقم ہذا آگے کرتا ہے

آٹھواں مقدمہ جس شے کو حاصل کیا جاتا ہے وہ یا تو خود مقصود ہوتی

ہے یا مقصود کا ذریعہ ہوتی ہے ذریعہ تو بقدر ضرورت ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً غذا خود مقصود ہے تو وہ ہمیشہ حاصل کرنے کی چیز ہے بخلاف اس کے دو اتودہ دفع مرض کا ذریعہ ہے جب مرض نہ رہیگا دوا سے روک دیا جائیگا اس لئے جو شخص دینا کی ایسی ضرورت سے انگیزی پڑھنا چاہے جو شریعت کی نگاہ میں بھی ضرورت ہو (اور بڑے بڑے عہدوں کے لئے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنا جس میں شریعت کی طرح طرح کی مخالفت کرنا پڑتی ہے وہ حد ضرورت سے خارج ہے) یا کسی دینی ضرورت سے بڑھے مثلاً مخالفوں کو اسلام کی دعوت دینے یا ان کے اعتراضوں کو رفع کرنے کے لئے تو اس کے لئے بقدر ضرورت اجازت ہوگی۔

نواں مقدمہ جس امر میں اہل رائے کا اختلاف ہو تو وہ حاصل دلیل کے کسی مقدمہ میں ہوگا یہ نہیں ہو سکتا کہ دلیل تو مسلم ہو اور پھر نتیجہ میں مخالفت ہے، مثلاً زید آدمی ہے اور جو آدمی ہو وہ لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے اس لئے زید لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص زید کسی گدھے کا نام رکھ دے۔ اور کہے کہ زید جو گدھے گدھا ہے اور گدھا لکھ نہیں سکتا۔ اس لئے زید لکھ نہیں سکتا۔ تو یہ اختلاف نتیجہ میں نہیں مقدمہ یا دلیل میں ہے جو ذرا سے غور کے بعد اٹھ جاسکتا ہے کہ اگر زید آدمی کا نام ہے تو پہلا نتیجہ صحیح اور دوسرا غلط ہے

اور اگر زید گدھے کا نام ہے تو دوسرا صحیح اور پہلا غلط ہے

لہذا اگر کسی مستند عالم کا قول یا فتویٰ انگریزی تعلیم کے نتیجے یا جواز کے خلاف پایا جائے تو حقیقت میں یہ اختلاف کسی مقدمہ میں ہو گا نہ کہ نتیجہ میں، سو یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ انگریزی کی مروجہ تعلیم سے فلاں فلاں خراب یا بے دینی کے اثرات پیدا ہوتے ہیں دوسرا یہ کہ جس تعلیم سے ایسے خراب اثرات پیدا ہوں وہ قبیح یا ناجائز ہے، سو پہلا مقدمہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ایک واقعہ کی تحقیق ہے جس میں مشاہدہ و تجربہ میں اختلاف کی بناء پر اختلاف ہو سکتا ہے اور اسی کی تحقیق سے ایک رائے کی صحت اور دوسری کی غلطی کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

لیکن دوسرا مقدمہ شرعی مسئلہ اور کلی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف کوئی مستند عالم یہ بھی تسلیم کرے کہ انگریزی تعلیم سے اتحاد و بے دینی پیدا ہوتی ہے اور پھر بھی اس کے جواز کا فتویٰ دے۔

آخری دسواں مقدمہ یہ ہے کہ جو حکم یا فتویٰ کسی عارضی

سبب سے ہوتا ہے وہ قدرۃً اس عارض کے بدل جانے سے بدل جاتا ہے اس لئے اگر کسی طرح انگریزی تعلیم کے ان خراب اور مخالف دین آثار کا انداد ہو جائے جن کی اوپر تفصیل گذری اور اس تعلیم کی عام و اکثری مضرت کا دفیہ ہو جائے تو اس کے قبیح یا عدم جواز کا حکم بھی اٹھ جاوے گا۔ گو موجودہ حالت میں اس کی امید بہت کم ہے۔

کم کیا بس منطق اسکان سے زیادہ نہیں، راقم ہذا چوتھائی صدی سے زیادہ انگریزی کی نئی تعلیم گاہوں کالج اور یونیورسٹی ہی میں خدمت کرتا رہا ہے

خصوصاً عثمانیہ یونیورسٹی اجید آباد میں اس تعلیم کی دینی مضرتوں کے انہاد کا دنیا بھر سے زیادہ ظاہری سامان فراہم، اسکول ہی سے دینیات کی تعلیم لازم جس کا سلسلہ برابر بی اے تک قائم۔ باقاعدہ امتحانات، جس میں کامیابی کے بغیر سند نہیں مل سکتی، پھر اسکول سے لے کر کالج اور میٹرکولیشن سے لے کر ایم اے تک بلکہ بی ایچ ڈی تک علوم جدیدہ کے پہلو پہلو تفسیر و حدیث وغیرہ علوم دینیہ کا مستقل انتظام اور پورا شعبہ موجود، اساتذہ کی تنخواہیں بھی پیش قرار، اور قریب قریب وہی جو مغربی علوم و فنون کے اساتذہ کی، طلبہ کے لئے حکومت کے محکمہ، اور نوکریوں میں بھی وہی حقوق جو مغربیات کے طلبہ کے، وظائف کا دروازہ بھی یورپ تک کے لئے دینیات والوں کے حق میں بھی کھلا ہوا شعبہ دینیات کے اساتذہ بھی خصوصاً دور اول کے ماشار اللہ ایسے کہ اپنے لائق سے لائق مغربی تعلیم کے ہم چشموں یا اپنے شاگردوں کے سامنے کسی طرح شرمندہ نہیں تعطیل اتوار کی نہیں جمعہ کی، رمضان شریف میں روزہ داروں کی رعایت میں اوقات صبح کے بلکہ گرمیوں کے رمضان میں سہ سے تعطیل، پھر حکمران کے متعلق سب کو معلوم کہ دینی علوم و روایات کے برقرار رکھنے پر مہم۔

السا اثر

غرض مغربی علوم اور مغربیت کے دینی اثرات کے مقابلہ میں علوم دین کے لزوم و اہتمام اور اہل دین کی وقعت و عظمت وغیرہ کے بہت کچھ ظاہری اسباب مہیا ہونے پر بھی غلبہ طلباء و اساتذہ سب پر مغربیت اور لادینی اثرات ہی کا وہ بھی مغربی علوم و فنون ہی کی حد تک نہیں، شعبہ دینیات کے تفسیر و حدیث و فقہ و کلام، خالص دینی علوم و فنون کے پڑھنے والے جن کے لئے انگریزی محض زبان

کی حد تک لازم، ان تک کے عادات و اطوار، افکار و خیالات، صورت و شیر
ظاہر و باطن سب پر رنگ اپنے مغربی رفقاء ہی کا غالب ہے (الاماشاء اللہ)
طلباء تو طلباء اساتذہ میں بھی چند قدیم دینی درسگاہوں کی صورتیں رہ گئی ہیں جن
کے رخصت ہونے پر دینی علوم کے اساتذہ کو صورتہ بھی لادینی علوم کے اساتذہ
سے الگ کرنا دشوار ہو گا۔ رہا استثناء سو وہ استثناء ہی ہے۔ اور اب تو
لادینی یا سیکولر حکومت شعبہ دینیات کے نام کی ہی رودار نہیں۔

جامعہ ملیہ

یہی حال کم و بیش جامعہ ملیہ دہلی کا۔ جو ملیہ سے زیادہ اپنی تعلیم و
تربیت میں اسلامیہ ہونے کی مدعی ہے اور اس سے بڑھ کر حال نام نہاد مسلم
یونیورسٹی (علیگڑھ) کا ہے ان تجربات سے یہ حال حضرت جامع المجددین علیہ
الرحمۃ کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے کہ اس قسم کی انہادی تدابیر کے باوجود۔
موجودہ حالات میں اس کی امید بہت کم ہے کہ انگریزی تعلیم کی ان عام و اکثری
مضرتوں کا دفعہ ہو سکے، جن کی تفصیل اوپر گندی۔ خصوصاً لادینی کے ساتھ
ساتھ محض دینی تعلیم کا پیوند لگا دینا یہ تو تجربہ نے ثابت کر دیا کہ بالکل ہی ناکام
ہے بلکہ اس پیوند کاری کا خود دینی تعلیم والوں پر الٹا ہی اثر پڑتا ہے کہ
وہی نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض، وہی عقائد میں ضعف و
تشویش، وہی اخلاق میں تکبر و تصنع وہی کفار کی تقلید کا ذوق
و شوق۔ وہی مال و جاہ کی محبت کہ ان کی طلب میں دین کے ضائع
ہونے کا صدمہ نہ ہو، اور دن رات دماغ میں بس مالی ترقی اور جاہ
و منصب کی ہوس پکاتے رہنا، جس چیز سے مال و جاہ کی ترقی لیکن دین کا

تمنزل ہو تو مال و جاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پرواہ نہ کرنا

دین کی پرواہ

جس کو دین کی کچھ بھی پرواہ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ دین کا مطلوب دنیا نہیں ہے دنیا صرف راستہ ہے منزل نہیں۔ لہذا اگر ایسی صورت ہو کہ راستہ میں چند گھنٹوں یا ایک آدھ دن کی کھانے پینے کی تکلیف بھی ہو، سفر بھی محقرڈ کلاس میں، بلکہ آج کل کی طرح ریل کے پائڈان پر ٹنگ کر رہی (جس میں جان تک کا خطرہ ہے) طے کر لینا پڑے اور منزل پر پہنچ کر مستقل سکونت کے لئے باغ و بگلہ

لے بزرگانِ ندوہ نے نیک نیتی سے، اور لادینی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا نہیں بلکہ دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کا ذرا سا پیوند لگادیا تھا اس نے بھی بعض اور اسباب کے ساتھ مل کر دینی و اخلاقی اعتبار سے کچھ اسی طرح کے آثار و رجحانات پیدا کئے جو حضرت مجدد نے ان چار سطروں میں خالص انگریزی تعلیم کے جمع فرمادیئے ہیں۔ الحمد للہ کہ اب نسبت کچھ اصلاح ہے مگر نسبت ہی علاماتِ مرض کے ساتھ اسبابِ مرض کی طرف توجہ اب بھی نہیں۔

انگریزی اب بالکل نکال دی گئی ہے تمام طلبہ کے لئے اس کے لزوم کا ختم کر دینا یقیناً بڑا مستحسن اقدام ہے البتہ طلبہ میں ذہنی صلاحیت اور دینی استقامت کا تجربہ و اطمینان اور جن سے امید ہو کہ جدید علوم و فنون و افکار و تصورات کے مقابلہ میں دین کی حمایت و تبلیغ کی کوئی تحریری یا تقریری خدمت انجام دے سکیں گے صرف ان کے لئے اس انتظام کا برقرار رہنا ضروری ہے کہ فراغ کے بعد دو تین سال صرف انگریزی اور اس جدید علم و فن کی تعلیم دلائی جاتی جس سے طبیعت کو خاص مناسبت ہو۔

نوکر چاکر عیش و راحت کے سائے کو لازم مہیا ہوں تو اس سے بڑھ کر کون اتحق ہوگا جو اس عیش و راحت کو قربان کر کے چند گھنٹوں کے سفر میں فسط یا سیلون و اسپیشل کے پیچھے جان دیتا پھرے اور منزل پر پہنچ کر جھونپڑا بھی نصیب نہ ہو بلکہ دن رات نیچے تلپتی ہوئی صحرائے افریقہ کی ریت کا بستر ہو اور اوپر دماغ کھولانے والے خط استواء کے سورج کا سائبان ! ہاں اگر منزل کے کامل و دائم عیش و آرام میں کچھ خلل آئے بغیر سفر میں کچھ انٹر سیکنڈ کی راحت میسر آجائے تو مضائقہ نہیں نہ خواہ مخواہ سفر میں مصیبت اٹھانا فرض ہے۔

غرض جس شخص کو کچھ احساس ہے کہ مسلمان ہونے کے معنی اس حقیقت پر ایمان لانے کے ہیں کہ دنیا کی ساٹھ ستر سال کی عارضی زندگی (وہ بھی ایسی غیر یقینی کہ یقین ایک سانس کا بھی نہیں) کے سفر کے بعد ایک ابدی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی ہماری اصلی منزل ہے جہاں کے روحانی انعامات و درجات کا تصور ہی کون کر سکتا ہے، لباس و طعام، تزک و احتشام، عیش و آرام جس کے لئے ہم اس دنیا میں مرتے ہیں وہ بھی یہاں سے ہزار ہا ہزار درجہ بہتر ہوگا اور یہ تمام تر احکام شریعت کی متابعت اور خدا و رسول کی رضا و اطاعت پر موقوف ہے، تو وہاں کی جنت کے مقابلہ میں مہلا یہاں کی ہفت اقلیم کی سلطنت کو کون ہی ترجیح دے گا؟

غالباً حضرت ابراہیم ادہم کی حکایت ہے کہ ان سے کسی نے بہت تعجب سے کہا کہ آپ نے کمال ہی فرمایا کہ بادشاہی پر لات مار دی فرمایا میں نے کیا کمال کیا کمال اُن کا ہے جنہوں نے جنت پر لات مار دی جب تک دین و دنیا کے تعلق کا یہ دینی تصور دل و دماغ پر غالب نہ ہو اس وقت تک دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا خالی پیوند لگانے سے ہرگز دل و دماغ میں دنیا پر دینے

کی ترجیح و تفوق کا رنگ ورجان پیدا نہیں ہو سکتا یہ رنگ پورا تو جب ہی چڑھ سکتا ہے کہ موجودہ لادینی تعلیم و تہذیب جس کا نصب العین سراسر حیاتِ دنیا کی زینت ہے اور اس نصب العین کی پشت پناہی کرنے والے نظامِ حکومت و سیاست کا سرے سے تختہ الٹ جائے۔ اور اس کی جگہ تعلیم و تمدن، حکومت و سیاست سارے ماحول پر عملاً دینی تصورات کی حکومت ہو جائے۔

باقی خالص دنیا پرستی کے موجودہ تعلیمی و تمدنی نظامات کے رہتے ہوئے ان کے لادینی اثرات کے اندر اس کی تھوڑی بہت اگر کوئی صورت ہے تو باہمت اہل دین کے لئے تو یہ کہ اس تعلیم کے مقابلہ میں اپنی اولاد کو سرے سے جاہل رکھنا گوارا فرمائیں یا جو کچھ بری بھلی خالص دینی تعلیم دلا سکیں دلائیں خواہ اس کی بدولت دنیا میں اولاد کو کارخانوں کا مزدور ہی بننا پڑے لیکن اس مزدور کا اگر عمل نہیں تو انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ایمان سلامت رہ جائے گا۔

یا پھر دوسرے درجہ پر جن کو اتنی ہمت نہیں وہ اس موجودہ انگریزی تعلیم سے پہلے بقدر ضرورت دینی تعلیم اور اس کے ساتھ لیکن اس سے بڑھ کر دینی تربیت کا اہتمام کریں اور یہ اہتمام بالخصوص تربیت کا انگریزی تعلیم کے اختتام تک جاری رہے اور ولایت مآب (یورپ ریٹرن) بنانے کا نام تو کسی حال میں نہ لیں کیونکہ وہاں اپنے دین کو بس کوئی پیدائشی واقعی ولایت مآب ہی بچا لا سکتا ہے۔

دیوبند تعلیم سے پہلے بقدر ضرورت دینی تعلیم و تربیت کی عام صورت یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اور ختم قرآن (ترجمیاً حافظہ و ردہ ناظرہ) کے بعد حضرت علیہ الرحمۃ کا سالہ تلخیصات عشر و الادینی تعلیم کا نصاب اس دینی تربیت کے اہتمام کے ساتھ

پورا کرایا جائے جس کا نمونہ ہر دینی کا اشرف المدارس ہے اور اس نمونہ پر جہاں جہاں اور جتنے زائد سے زائد مدارس قائم کئے جاسکیں گے جائیں

اس لازمی دینی تعلیم اور تربیت کے معتد بہ رسوخ کے بعد اسکول و کالج میں اس شرط کے ساتھ داخل کیا جاسکتا ہے کہ قیام ہاسٹل میں ہرگز نہ ہو گھری پر ہو اور سرپرست اس تربیت کی پوری حفاظت کریں جو اشرف المدارس یا اس کے ہم رنگ مدارس میں بچوں نے حاصل کی ہے یا ایسے ہی اسلامی اقامت خانے (ہاسٹل) قائم کئے جائیں جن میں اشرف المدارس کے رنگ کی دینی تربیت کا پورا انتظام ہو اور دنیوی تعلیم کے اس سارے دوران میں حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں خصوصاً ملفوظات و معاظظ کا مطالعہ لازماً بلا تاخیر روزانہ کچھ نہ کچھ جاری ہے یا ایسے اقامت خانوں کا نگران روزانہ آدھ گھنٹہ لڑکوں کو جمع کر کے لازماً سنا دیا کرے، باوجود اس کے پھر بھی اگر اسکول یا کالج میں کسی لڑکے کا رنگ بگڑتا دیکھے تو اس کو فوراً ہٹالے اور اس کے لئے جدید تعلیم کا خیال بالکل ہی ترک کر کے کسی اور معاشی راہ پر ڈال دے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے، انشاء اللہ وہ بھی دنیا میں محتاج و مضطر نہ ہوگا۔ گو کلکٹر و کمشنر نہ ہو، مگر خدا اور رسول کے حضور میں مسلمان کی حیثیت سے تو حاضر ہوگا۔ باقی جن قلوب میں دین کی اتنی بھی قیمت و وقعت نہیں ان سے نہ خطاب ہے نہ ان کی خدمت میں عرض کرنے کا کچھ حاصل فسیَعَلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ، دنیا کی آنکھ بند ہوتے ہی دین کی آنکھ خود کھل جائے گی مگر اس وقت اس حسرت کے سو کیا حاصل ؟

۱۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس کا اصل امتیاز خالص دینی تربیت ہے ،،

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا نُرِيْكُمْ اٰیٰتِنَا وَلَٰكِنْ تَكْفُرُوْنَ
 بِآیٰاتِ وَ تَكُوْنُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
 پ اللعالم
 رب كى آيات كى مكذب پھر نہ كرس اور
 ضرر مومن هو جائیں ۔

انگریزی تعلیم اور اس كے اسکولوں كالجوں كى نسبت اوپر جو كچھ كہا گیا ہے
 انگریزی زبان و حكومت كے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو تعلیم بھی اسکولوں ، كالجوں كے
 رنگ میں ہوگی اس كا اثر یہی ہوگا جیسا كہ تركى اور مصر میں ہو رہا ہے اور اس اثر كے
 روك تھام كى ممكن تدابیر بھی وہی ہیں جو اوپر عرض كى گئیں ۔

اُردو كى شرعى حیثیت

آخر میں چند سطریں اردو كے متعلق بھی لائق توجہ ہیں اوپر تعلیم سے متعلق جن
 تجدیدات و اصلاحات كو پیش كیا گیا وہ كو كم و بیش سب ہی ایسی ہیں كہ ساری
 دنیا كے مسلمانوں كو ان كى طرف توجہ كى ضرورت ہے ۔ لیكن اردو زبان كا معاملہ صرف
 پاكستان و ہندوستان كے مسلمانوں سے تعلق ركھتا ہے اور یہی نہیں كہ یہاں كے
 مسلمانوں میں سب سے زیادہ اس زبان كو عموم و قبول حاصل ہے بلکہ اس نے اپنے
 اندر اسلامی و دینی علوم و فنون كا اتنا سرمایہ پیدا و منتقل كر لیا ہے جو نہ صرف مسلمانوں
 كى عام ضرورتی دینی تعلیم كے لئے كافى ہے بلکہ اسلامی تعلیمات كے وسیع تر
 مطالعہ كا شوق ركھنے والوں كى تشفی كے لئے بھی عقلی و نقلی دونوں اعتبار سے بہت
 كچھ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور راقم الحفر كے نزدیک تو اردو كى اہمیت و فضیلت
 كے لئے یہی كافى ہے كہ مجدد وقت كى خدمات و تجدیدات كے قریب قریب سارے

خزانوں کی کنجی یہی ہے۔

غالباً اردو ہی کے متعلق کسی کا نفرنس میں اشتہار اور خاص خط کے ذریعہ حضرت سے شرکت کی درخواست کی گئی تھی۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ اس خط و اشتہار کو پڑھ کر قلب میں ایک حرکت پیدا ہوئی کہ اس خدمت میں کس قسم کی خدمت کا حصہ لیا جائے، چونکہ متعارف خدمتوں کی نہ صلاحیت، نہ قوت اور غالباً ایک خاص خدمت کی طرف کسی توجہ بھی نہیں کی۔

ظاہر ہے کہ دینی اعتبار سے ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرف توجہ تو وقت کے محدود اور جامع المجددین ہی کی ہو سکتی ہے بہر حال وہ خاص خدمت اس کی تحقیق ہے کہ اس تحریک کا شرعی درجہ کیا ہے اس کی ضرورت بھی اس لئے محسوس ہوئی کہ اس وقت اس مسئلہ نے تمدن و قومیت سے آگے بڑھ کر مذہبیت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لئے خیال ہوا کہ اس کے متعلق ایک مختصر تحریر منضبط کر کے بھیج دی جاتے۔

اس تحریر میں پہلے چند آیات اور حدیث وفقہ کی روایات نقل فرمائی گئی ہیں اور پھر ان سے اردو کی دینی و شرعی حیثیت و درجہ کے متعلق نتائج اخذ فرمائے گئے ہیں جو تلخیص و تسہیل کے ساتھ درج ذیل ہیں

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زبانوں کے اختلاف و تنوع اور قدرت بیان کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و آیات و دلائل میں شمار فرمایا گیا ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلاف

اللسان والوانکم - الایۃ :-

اور قدرت بیان کی تعلیم کو بطور احسان و انعام جتلا یا گیا ہے کہ الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اس سے معلوم ہوا کہ تمام زبانوں کا استعمال بھاتے خود جائز و مباح ہے۔ لیکن اسباب و خصوصیات عادیہ کی بناء پر جو بمنزلہ لوازم کے ہو گئی ہیں بعض زبانوں کو بعض پر فوقیت و فضیلت حاصل ہے چنانچہ عربی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو تین وجہ سے محبوب رکھو ایک تو میں عربی ہوں، دوسرے قرآن عربی ہے اور تیسرے اہل جنت کی گفتگو عربی ہوگی،

احبوا العربية لثلاث لا فی عربی و القرآن عربیؕ

و کلام اهل الجنة عربیؕ

اسی طرح مثلاً اعراب (دیہاتیوں کے بعض محاوروں کے استعمال سے منع فرمایا گیا ہے) لَا تَغْلِبْكُمْ الْأَعْرَابُ عَلَى اسَدِ صَلَاتِكُمْ فَاَنْهَاهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ الْعَشَاءُ وَ انْتَهَمَ يَقِيمُونَ بِحِلَابِ الْأَمَلِ (ان دونوں روایتوں میں غور کرنے سے صاف معلوم و مفہوم ہوتا ہے کہ کسی زبان کی فضیلت یا مذمت یا مدح و قبح کی بنیاد اس زبان کا کسی فضیلت یا مذمت کی چیز سے تعلق و تلبس ہے خواہ وہ چیز کوئی عین ہو یا معنی

فارسی کی فضیلت

عربی کے بعد فارسی کو اسی تعلق و تلبس کی بناء پر چند وجہ سے فضیلت حاصل ہے ایک تو اس کا مقبولین کی جماعت سے تعلق، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ سورت جمعہ اور اس میں یہ آیت نازل ہوئی وَ الْآخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلِدُ حَقْوَاهُمْ

لوگوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ اس آیت میں کون لوگ مراد ہیں؟ اس وقت حضرت سلمان فارسی بھی حاضر تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ اگر ایمان نثریا میں ہوتا تو یہ لوگ اس کو ضرور حاصل کر لیتے۔ اس کی شرح لمعات میں ہے کہ مراد لہما بلحقوا بہم سے عجمی یا فارسی حضرات تابعین رضی اللہ عنہم ہیں کیونکہ وہ صحابہ سے لائق تھے اور اکثر تابعی اہل عجم میں سے ہی ہوتے ہیں اور علم واجتہاد جس درجہ کا ان عجمی تابعین میں ظاہر ہوا دوسروں میں نہیں ہوا۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ فارسی کی اسی فضیلت کی بنا پر امام صاحب نے ایک وقت میں فارسی میں نماز کی قرأت کو جائز فرمادیا تھا۔ گو بعد میں رجوع فرمایا لیکن رجوع فرمانے سے اصل بنا کا معدوم ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ یہ رجوع کسی اور قوی تر معارض کے سبب ہے نہ کہ اصل بنا کے ضعف کے سبب۔

اسی طرح بخاری وغیرہ کی بعض روایات نقل فرماتی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اہل صحابہ رضی اللہ عنہم کا فارسی الفاظ کا استعمال فرماتا ثابت ہے اور بعض روایا میں فارسی کے استعمال کی وجہ کراہت آئی ہے اس کی سند خود امام بخاریؒ نے داہی یا پوچ قرار دیا ہے اس کے علاوہ یہ کراہت جب ہے کہ کوئی فارسی کو عربی پر ترجیح دے اسی طرح درمختار وغیرہ فقہ کی کتابوں میں فارسی کو عربی سے اقرب اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اس کی فصاحت کی بنا پر اشراف قرار دیا ہے بخلاف بعض دوسری زبانوں کے جن میں ثقل و تنافر بکثرت ہے۔

ان تہیدی مقدمات سے حضرت علیہ الرحمۃ نے اردو کے متعلق بھی فرمائی ہے وہ کم و بیش بالفاظ ملاحظہ ہو۔

جس طرح فارسی کو عربی سے مناسبت ہونے کی بنا پر فضیلت حاصل ہے اور چونکہ اس فضیلت کا اثر احکام دینیہ میں بھی ہے اس لئے

وہ فضیلت دینیہ ہے اسی طرح بلاشبہ عربی و فارسی کے ساتھ ایسی ہی قوی مناسبت ہونے سے اردو کو بھی دینی فضیلت حاصل ہے بلکہ فارسی کو تو عربی سے صرف مشابہت ہی کی مناسبت ہے اور اردو کو فارسی و عربی سے جڑیت کی مناسبت ہے فارسی و عربی کے جس قدر کثرت سے مفرد الفاظ اردو میں ہیں کسی زبان میں بھی نہیں، مفرد الفاظ ہی کیا بہت سے جملے ایسے ہوتے ہیں کہ بجز کاکی وغیرہ روابط کے پورا مادہ فارسی و عربی میں ہوتا ہے یہ تو فضیلت والی زبانوں سے اردو کا تعلق و تلبس ہوا

دوسری فضیلت اردو کی یہ ہے کہ دینی علوم خصوصاً صحیح و مقبول تصوف کا اس میں غیر محدود و غیر محصور ذخیرہ ہے جس کو علماء و مشائخ نے صدیوں کی مشقت اور اہتمام سے جمع فرمایا ہے خدا نخواستہ اگر یہ زبان ضائع ہو گئی تو یہ تمام ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ بالخصوص عام مسلمانوں کے لئے تو علم دین کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے گا کیونکہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے ان کا استفادہ اردو ہی پر موقوف رہے اور کیا اس طرح ضائع ہوتے دیکھنا اور افساد نہ کرنا شرعاً جائز ہے ؟

ایک اور خصوصیت اردو کی اس کا سلیس و آسان ہونا ہے یہ بھی بڑی فضیلت ہے کیونکہ حصول دین کے لئے زبان کی آسانی اور تیسیر کو اللہ تعالیٰ نے بطور احسان ذکر فرمایا ہے جیسا کہ **فَاَتَمَّائِسْرُنَا ۙ فَاِیْلَسَا نِلَکَ لِیُبَشِّرَ بِهٖ الْمُتَّقِیْنَ** وقال تعالیٰ **فَاِیْلَسَا نِلَکَ لَعَلَّہُمْ یَتَدَکَّرُوْنَ** ہ

غیرہ آیات سے ظاہر ہے۔

غرض اس وقت اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے اس بنا پر

یہ حفاظت حسب استطاعت واجب و طاعت ہے اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت کرنا معصیت و موجب مواخذہ آخرت ہوگا۔

واللہ اعلم۔ (العقد رمضان ۱۳۵۸ھ)

آخر میں بلکہ اول و آخر زیادہ یاد رکھنے کے قابل باتیں دو ہیں ایک یہ کہ جن علوم و فنون کا تعلق انسان کی خالص دنیاوی و مادی و حیوانی زندگی کی حاجات یا آرائش و نمائش سے ہو وہ دین کی نگاہ میں سرے سے علم ہی نہیں علم وہی ہے جو انسان کے انسانی مقصد وجود اور اس کی تکمیل کی راہ دکھلائے۔ ثانیاً اس زمانہ میں پیچھے کے بتوں بڑھ کر جو نئے نئے بت تراش لئے گئے ہیں ان میں سے ایک علم برائے علم ہے یعنی علم و فن کو بذات خود ایک صتم اعظم بنالیا گیا ہے غیر ضروری سے غیر ضروری شے کی تحقیقات عالیہ (ریسرچ) بھی فی نفسہ مطلوب و معبود بن گئی ہے۔ اگر فردوسی کی قبر کا پتہ لگا کر اس پر بھی کوئی ایک مقالہ لکھ ڈالے تو وہ بھی ڈاکٹر یعنی علم کا مستند محقق و ماہر بن جا سکتا ہے۔

سو خوب معلوم رہنا چاہئے کہ توحید کامل کے دین (اسلام) میں خدا یا خدا کی رضا جوئی کے سوا کسی شے کو بھی مطلوب و مقصود بنانا اگر حلی نہیں تو خفیٰ شرک یقیناً ہے حتیٰ کہ خود علم دین بھی محض خدا شناسی اور خدا کی رضا طلبی ہی کے لئے مطلوب ہے نفس دینی معلومات کا جان لینا یا مسائل و اصطلاحات کا یاد کر لینا قطعاً مقصود بالذات نہیں۔ بالفاظ دیگر علم علم کے لئے نہیں بلکہ علم عمل کے لئے مطلوب ہے، خواہ یہ عمل قلب کا ہو یا قالب کا۔ ایمانیات و اعتقادات تک کا فقط جان لینا مطلق نافع نہیں ان کا بھی اصل مطلوب ماننا یعنی قبول و یقین کرنا ہے جو قلب کا عمل ہے علم بلا عمل یا علم غیر نافع ہے تو صراحتہً پناہ مانگی گئی ہے۔

ماننے کے دو درجے

ماننے کا بھی ایک نرا اعتقادی درجہ ہوتا ہے جیسا کہ عام مسلمانوں کا اور ایک عالی درجہ ہے جس میں قلب کا قبول و یقین پوری زندگی کا حال بن جاتا ہے اور زندگی کے سارے اعمال و افعال حرکات و سکنات میں ابھر آتا ہے کامل یا پورا علم پوری طرح کا ماننا ہے یعنی خدا کا تعلق یا اس کی رضا و نارضی، محبت و خشیت قلب کا ایسا حال بن جائے کہ داخل اختیار طاعت میں کمی ہو اور نہ دیدہ دستہ معصیت پر جرأت، العلم والخشیتہ نام کے دو علم میں ارشاد ہے کہ

علم کی دو قسمیں

اور یہی قسمیں خشیت میں بھی جاری ہیں ایک عقلی اور ایک حالی۔ عقلی کو کبھی اعتقادی اور حالی کو طبعی بھی کہتے ہیں پس جہاں علم اعتقادی ہے وہاں خشیت بھی اعتقادی ہے اور جہاں علم حالی ہے جس کو کہا ہے کہ

ع۔ علم کہ بردل زنی یا سے بود

وہاں خشیت بھی حالی ہوگی۔ مگر کمال دین کے لئے خشیت اعتقادی کافی نہیں بلکہ خشیت حالی کی ضرورت ہے اور اسی درجہ کمال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لا یزنی الذانی حین یزنی دھو مؤمنٹ یہاں محض ایمان (یا علم و تصدیق) اعتقادی مراد نہیں بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے۔ اب یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ ہم بہت مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں جو اب یہ کہہ کر یہاں مراد مومن اعتقادی نہیں مومن حالی ہے

کون علم میراث انبیاء ہے

ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں۔ صاحبوا علم کو میراث انبیاء کہا جاتا ہے تو اب دیکھو کہ انبیاء کی میراث کونسا علم ہے کیا انبیاء کا علم بھی نعوذ باللہ ایسا ہی تھا جس میں محض مسائل اور اصطلاحات کا تلفظ ہو۔ اور خشیت کا نام نہ ہو ہرگز نہیں، وہاں تو یہ حالت تھی کہ جتنا علم بڑھتا تھا اتنی ہی خشیت بڑھتی تھی، حدیث میں ہے کہ انا اعلمکم باللہ واخشاکم للہ ط میں تم سب سے زیادہ خدا کو جاننے والا اور تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اب ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں پھر پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں، تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ غیر مقصود کو مقصود بنا لینا مکروہ ہے۔ فقہانے اس راز کو خوب سمجھا فرماتے ہیں کہ ایک وضو سے جب تک نماز نہ پڑھ لی جاتے دوسرا وضو کرنا مکروہ ہے، ظاہر میں تو شبہ ہوتا ہے کہ فقہاء نے ایک عبادت کو منع کیا۔ مگر یہ لوگ حکمائے امت ہیں واقعی خوب سمجھے کہ جب اس نے غیر مقصود کو ادا کرتے مقصود سے پہلے مکر کیا تو غیر مقصود کو مقصود بنا لیا اور یہ حد سے تجاوز ہے۔ اسی طرح تعلیم و تعلم کو مقصود بالذات سمجھ لینا بھی حد تجاوز ہے۔ غرض دین کی نگاہ میں حقیقی و کامل علم وہی ہے جو عمل و اثر سے خالی نہ ہو، یعنی جو اطاعت کا باعث و موجب اور معصیت سے مانع و حاجب ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُولُ بِهِ بَيْنِي وَبَيْنَ
مَعَاصِيكَ۔ اس سے معلوم ہوا کہ خشیت مطلوبہ وہی ہے جو گناہ
سے حائل (مانع) ہو جائے پس جس کو یہ حیلولت حاصل نہیں ہے
اس کو خشیت مطلوبہ ہی حاصل نہیں اور جب خشیت ہی نہیں تو علم
حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں، گو کتابی علم حاصل ہو، مگر بے ثمریت
میں جو علم مطلوب ہے وہ محض کتابی نہیں بلکہ وہ علم مطلوب ہے جو دل میں
اثر جائے۔

غرض مطلوبِ شرعی وہی علم ہے جو اپنے اثر کے ساتھ ہو جیسے
تلاوہی مطلوب ہے جس میں کاٹ بھی ہو، ورنہ برائے نام تلاوہ ہوگی
لہذا جو علم اثر سے خالی ہو وہ مطلوب ہی نہ ہو گا خوب سمجھ لو اسی کو کہتے ہیں کہ
علم چہ بود آنکہ رہ نہایدت زنگِ گمراہی ز دل نیرد ایدت
ایں ہو سہا از سرت بیرون کند خوفِ خشیت در دلت فروں کند
تو ندانی جزہ جو ز دلا یجوز خود ندانی تو کہ حوری یا عجز
اور جب تمہارے علم کی یہ حالت ہے کہ سوائے یجوز و لایجوز (جائز و ناجائز)
کے کچھ خبر نہیں اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں تو پھر اس پر بے تکلف اس
خطاب کو مرتب کر سکتے ہیں، کہ

ایہا القوم الذی فی المدرسۃ

کل ما حصلتموه و سوسہ

علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

مگر ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ علم عاشقی سے کیا مراد ہے ؟

علم دیں فقر است قرآن و حدیث۔ ہر کہ خواند غیر ازین گرد و خبیث

یہ اس واسطے کہہ دیا ہے کہ تاکہ معلوم ہو جائے کہ علم عاشقی سے مراد علم دین ہے کیونکہ ایمان ہی عشق ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ
اور حب ایمان عشق ہے تو اسی کا علم عاشقی ہے۔

دین کے مدرسوں کا بھی ایسا علم جو عشق و اثر سے خالی اور صرف مسائل و اصطلاحات کا حفظ موجب وہ تک ”وسوسہ اور تلبیس الیسی“ کے سوا کچھ نہیں تو دنیا کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علوم و فنون اور تحقیقات عالیہ (ریسرچ) کو علم کا نام دینا حقیقی علم کی نظر میں زنجی کو کافور کا نام دینے کے سوا کیا ہے۔

لہٰذا یہ سب اقتباسات منہج العلم والخشیۃ ہی ملخصاً ماخوذ ہیں۔

تجدید تبلیغ

جس طرح تعلیم کے صحیح معنی انسان کو اس کے مقصد وجود اور اس مقصد کی تحصیل و تکمیل کا علم عطا کرنا ہے اسی طرح تبلیغ کے معنی اس علم کو حاصل کر کے دوسروں تک پہنچانا ہیں۔ حضرات انبیاء اور حضرت خاتم الانبیاء نبی الاسلام علیہ التیختہ والسلام کو انسان کے مقصد وجود اور اس کی تحصیل و تکمیل کے وسائل کا علم براہ راست اللہ تعالیٰ سے وحی و تنزیل کے ذریعہ عطا ہوا ہے، پھر تمام انبیاء اور بنی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم آخر دم تک اسکی کو دوسرے تک پہنچاتے رہے اور اہل رسول اللہ یا پیغمبر خدا کی لفظی و معنوی حقیقت اور نبوت کا بنیادی فریضہ و منصب تبلیغ ہونا ہی ہے یعنی وہ اللہ کے رسالہ یا پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔

آخری رسول نے اپنے آخری حج - حجۃ الوداع - کے موقع پر امت کو وداع (رضعت) فرماتے ہوئے رسالت و نبوت کے اسی منصب و فریضہ کی اہمیت بتلا کر اس کی کما حقہ ادائی پر اس طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم کو گواہ فرمایا کہ دیکھو کیا میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے نیز تم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں میری نسبت سوال ہوگا تو کیا جواب دو گے؟ سننے والوں نے گواہی دی کہ ہم عرض کریں گے کہ آپ (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا اور اپنا فرض پورا فرما دیا۔ بندوں کی اس گواہی پر آسمان کی طرف انگلی کر کے اشارہ فرما کر خود حق تعالیٰ کو تین بار گواہ فرمایا کہ اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں، اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں، اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں۔

امت کو یہ فریضہ سپرد فرماتے ہوئے حکم دیا کہ حاضر غائب کو پہنچانا ہے۔ یہی معنی ہیں
امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتیمم کے امت مبعوثہ ہونے کے کہ تبلیغ یا پہنچانے کی
جو خدمت حضرات انبیاء کے سپرد انفرادی طور پر ہوئی تھی وہ ختم نبوت کے بعد ساری
امت پر مجموعی حیثیت سے عائد فرمادی گئی ہے۔

اس بناء پر حضرت مجدد مہمناوی علیہ الرحمۃ کی نگاہ تجدید میں یہ پہنچانا یا تبلیغ نہ صرف
دین کی تمام دیگر علمی تعلیمی خدمات سے اہم و اقدم ہے بلکہ دیگر خدمات علم کی جو کچھ
مجھے قیمت و اہمیت ہے وہ تبلیغ ہی کے اسباب و وسائل ————— ہی کے
درجہ میں ہے — جا بجا فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت و تشریف
آوری کا اصل مقصد احکام دین کی تبلیغ تھی باقی جو کچھ ہے سب اسی کی تاکید
و اعانت کے لئے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء نہ در سے کھولنے تشریف
لائے اور نہ کتب خانے قائم فرمائے، بلکہ وہاں تو بالذات نفس نوشت و خواندہ تک
مامور و مطلوب نہ تھی نہ متعارف علوم و فنون یا نوشت و خواندہ کا، وحی یا انبیاء
علیہم السلام کی زبان میں علم نام ہے، نہ ان علوم و فنون کو حضرات انبیاء یا حضرات
صحابہ کے کمالات و درجات کی فہرست میں کوئی مقام حاصل ہے۔

تاہم درس و تدریس، تالیف و تصنیف وغیرہ سب چیزیں دراصل حسب
ضرورت جو کچھ تبلیغ ہی کے مقدمات و وسائل ہیں اس لئے یہ بھی واجبات تبلیغ
میں داخل ہیں اور اس لئے حقوق العلم کے عنوان سے مستقلاً اور مواظظ وغیرہ میں
متفرقاں کی اصلاح و تجدید کا تفصیل حق ادا فرمایا گیا ہے البتہ وسائل کو مقاصد

بنانے کی غلطی و غلو اس باب میں بھی اتنا ہوا کہ بالعموم مدارس و مدرسین، علماء و مصنفین کی نظر اصل مقصد سے ہٹ گئی۔ اس لئے ایک نہیں، آداب التبلیغ الدعوة الی اللہ، محاسن اسلام وغیرہ مواعظ میں براہ راست اور دیگر مواعظ و مضامین کے سلسلہ میں جا بجا بکثرت احکام دین کی تبلیغ و اشاعت اور دعوت الی الحق کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے اور خود حضرت علیہ الرحمۃ کی ساری تصنیفات و تالیفات سارے مواعظ و ملفوظات کا محور و کہنا چاہئے کہ احکام کی تبلیغ و اشاعت اور حق کی طرف دعوت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا خاص طریق بند و نصیحت یا وعظ و تذکرہ تھا اور یہی حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک تبلیغ و دعوت کا سب سے عام اور نفع طریق ہے اور جب تک حضرت کی قوت نے سفر کی اجازت دی کثرت سے اور زیادہ تر وعظی کے لئے سفر فرماتے رہے اور اس کو مقبولیت اور نفعیت ہر طبقہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس درجہ بخشی تھی کہ کسی کئی گھنٹوں کے وعظ میں بھی سیری نہ ہوتی تھی اور مشکل سے کوئی متنفس اپنی جگہ چھوڑتا۔ چھرتنی کثیر تعداد میں قلم بند ہو کر ان مواعظ کی حق تعالیٰ نے حفاظت فرمادی اس کی نظیر امت کی ساری تاریخ میں نظر نہیں آتی اور نفع کا تجربہ تو آج بھی ان کو پڑھ کر جس طبقہ کے جس فرد کا جی چاہے کر سکتا ہے مسلمان ہی نہیں غیر متعصب غیر مسلم بھی اگر کچھ بھی طلب صادق اور ذوق سلیم ہے تو انشاء اللہ نہ صرف یہ کہ بے ختم کئے چھوڑنے کو جی نہ چاہے گا۔ بلکہ چند وعظ ہی پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے تعلق و طاعت کی ایک نئی حیات و حرکت محسوس کرے گا۔ راقم ہذا یہ محض خوش اعتقاد ہی کی بناء پر نہیں بلکہ بارہا کے تجربات اور وہ بھی زیادہ تر نئی تعلیم کے آزاد طبائع پر تجربات کے بعد عرض کر رہا ہے۔

یہ مواعظ دراصل دستِ تبلیغ ہی کا علمی و عملی ذخیرہ ہیں

حضرت کی قریباً ساری اصلاحی و تجدیدی خدمات کی زبان اُردو ہے اگر اردو کی حقارت یا معاشرت کا حجاب مانع نہ ہو تو سب سے زیادہ حضرات اہل علم کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ حضرت کے مواعظ کو معمولی قصہ گو و اعطوں کا وعظ یا محض کسی لفاظِ خوش بیان کی تقریر ہرگز نہ تصور کریں۔ وہ دراصل پورے دین اور اس کے سارے ابواب و احکام کی تبلیغ و دعوت کا نہایت ہی محققانہ حکیمانہ و عالمانہ اور مجتہدانہ و مجددانہ ذخیرہ ہیں اور اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط میں جس حکمت و موعظتِ حسنہ اور عبدالاحسن کے عنوان سے تبلیغ و دعوت کے جن تین طریقوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ان سب کا نہایت جامع اور دین کے مبلغ و داعی کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ اس لئے جہاں تک دعوت و تبلیغ کا تعلق ہے حضرت نے صرف اس کے اصول و حدود کی اصلاح و تجدید ہی نہیں فرمائی بلکہ مواعظ کی شکل میں اس اصلاح و تجدید کا کامل و مکمل عملی سرمایہ امت کے ہاتھ میں رکھ دیا ہے حتیٰ کہ احقر کے نزدیک تو موقع و محل کے اعتبار سے اجمال و تفصیل اور جزئی تغیر و تبدل کے ساتھ انہی کا اعادہ نہ صرف انشاء اللہ دین کے ہر شعبہ میں امت کی اصلاح کے لئے کافی و وافی ہے بلکہ غیروں کو بھی سبیلِ رب کی طرف بلانے اور مانگ کر ان میں نہایت کارگر اور نافع ہے امتحان و تجربہ شرط ہے انشاء اللہ خود ہی اطمینان ہو جائے گا۔

تبلیغی حکمت کی ایک عجیب مثال

سینکڑوں ہزاروں تبلیغی و دعوتی مواعظ کے علاوہ متعارف تبلیغ یا تبلیغ کی

وقتی ضرورتوں سے بھی صرف نظر نہیں فرمایا گیا، فتنہ ارتداد کے زمانہ میں بنفس نفیس ایسے مقامات کا دورہ فرمایا جہاں اس کا اندیشہ قوی تھا اور وہاں بھی جیسے مجتہدانہ و مجددانہ طرز سے کام لیا اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ و مثال سے ہو سکتا ہے جس کا یقین بھی اُس جماعت و مسلک کے کسی فرد کی جانب سے نہیں کیا جاسکتا ہے جس کی طرف حضرت کی نسبت ہے اور جو اپنے مخالفوں میں اپنی بدعات دشمنی ہی کی بدولت زیادہ مبغوض و بدنام ہے بھلا اس کا کون یقین کر سکتا ہے کہ جماعت دیوبند کے ایک مسلم دستند عالم بلکہ امام نے کسی موقع پر کسی شخص کو تعزیر داری کی تاکید فرمائی ہوگی کہ ”دیکھو تعزیر بنایا کرو“

گجنیر نام مقام کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ آریوں کے اثر سے وہاں کچھ لوگ مرتد ہو جانے والے ہیں وہاں پہنچ کر حضرت نے اول ان کے سرداروں سے گفتگو کو مناسب تصور فرمایا۔ معلوم ہوا کہ نھو سنگھ اور ادھار سنگھ دو بڑے سردار ہیں ان دونوں سے حضرت نے الگ الگ ملاقات فرمائی تاکہ آزادی سے ہر ایک کے خیالات معلوم ہو سکیں اور گرمی کا زمانہ تھا تو ان کو شربت بھی پلانا چاہا مگر انہوں نے عذر کر دیا کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھ کا کھایا پیا نہیں کرتے اور بھی ایسی ہی بالکل اسلام کے خلاف باتیں ان لوگوں میں رائج تھیں مثلاً سر پہ چوٹی وغیرہ، ختنہ صرف اس کے یہاں ہوتا تھا جو برادری کو کھانا دے سکے۔

اور جبل کا یہ حال کہ پوچھا تم ہندو ہو؟ تو کہا نہیں، مسلمان ہو؟

سہ سرکاری کاغذات میں تو ان کا نام نھو خان اور ادھار خان تھا مگر عام طور سے ان کو کافرانہ نام نھو سنگھ اور ادھار سنگھ ہی سے پکارا جاتا تھا۔

جواب دیا نہیں۔ پھر آخر کیا ہو؟ بتلایا تو مسلم گفتگو کرنے پر سختو خاں نے تو کہا کہ آریہ مذہب میں ٹیوگ کا ایسا گندہ حکم ہے کوئی بھلا مانس اس مذہب میں جانا گوارا نہیں کر سکتا۔ اور ادھار سنگھ نے کہا کہ ہم تو تعزیر بناتے ہیں ہم ہندو کیوں بننے لگے۔

اب حضرت مجدد کا حکیمانہ و مجتہدانہ جواب ملاحظہ ہو فرمایا: دیکھیو تعزیر

ضرور بنایا کرو، "بعض ہمراہیوں کو اس پر اشکال بھی ہوا تو فرمایا کہ ان کے

لئے یہ بدعت کفر کا وقایہ ہے (اشرف السواخ جلد سوم ص ۳۳)

یعنی کم از کم باقاعدہ کافر یا آریہ ہونے سے بچے رہیں گے، اور اصلاح ہو سکے گی۔

بستی نظام الدین کی تبلیغی بنیاد میں حضرت کی شرکت بابرکت

اس تبلیغی خدمت کی بنیاد میوات کے علاقہ میں پڑی حضرت علیہ الرحمۃ کے حکم و ہدایت کے تحت بھی بعض خدام وہاں اس پر مامور تھے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار اور بڑے بھائی سے اس علاقہ کے لوگ پہلے سے ارادت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے مولانا موصوف کا قدرۃ خاص اثر تھا جن کے ہاتھوں آگے چل کر توفیق اللہ بڑا کام ہوا۔ اشرف السواخ میں حضرت اقدس مولانا مفتاحی علیہ الرحمۃ کے متعدد مکتوبات منقول ہیں جن میں اس خدمت کے خادموں کو بہ شہادت قلب کامیابی کی بشارت دی گئی ہے ایک عرفیہ کے جواب میں لکھا

کہ :- حالات سے مجھ کو بہت کچھ امیدیں ہوئیں اور مجھ کو اس سے پہلے بھی

صرف آپ جیسے مخلصین کا جانا اور پھر مولوی محمد الیاس صاحب کا ساتھ

ہو جانا یقین کامیابی کا دلالتا تھا۔ علم غیب توحی تعالیٰ کو ہے مگر میرا قلب

شہادت دیتا ہے کہ انشاء اللہ سب وفود سے زیادہ نفع آپ صاحبوں

سے ہوگا، خدمت مولوی الیاس صاحب سلام مسنون لہ

مکتوب الیہ نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ
ان ارشادات کا مقصد صرف یہ خیال میں آتا تھا کہ حوصلہ افزائی فرمائی جا رہی
ہے۔ لیکن جب تقریباً دو پڑھ سال بعد ایک جماعت نے تمام تبلیغی علاقہ کا
مفصل حال شائع کیا اور اس روئداد میں اس کی بھی تصریح تھی کہ تحصیل
پلوآں جہاں افتخار مولوی عبد المجید صاحب حسب حکم و ہدایت حضرت والا
کا تبلیغ انجام دے رہے تھے اول نمبر کا میاب رہی تب معلوم ہوا کہ یہ
بشارت و پیشین گوئی تھی جو بالکل صحیح ہوئی۔

اب اشرف السوانح میں ان چیزوں کو پڑھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ خود راقم ہذا سے ایک
موقع پر خود حضرت مولانا الیاس صاحب نے جو یہ فرمایا تھا کہ حضرت ہی کی دعاؤں کی یہ کثرت
ہے اس کا کیا مطلب تھا۔ موقع یہ تھا کہ احقر لبتی نظام الدین حضرت موصوف کی
خدمت میں حاضر ہوا۔ غالباً دوسروں ہی قصہ نوح میں اس تبلیغی سلسلہ کا بڑا سالانہ
اجتماع تھا جس میں بامرار ساتھ چلنے کا حکم ہوا دو تین دن مسلسل حضرت کی معیت میں
تبلیغی خدمات کے معائنہ و مشاہدہ کی سعادت حاصل رہی۔ دہلی سے سیدھے تھانہ
مہبون حاضری تھی۔ جب رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ حضرت مولانا تھانوی کی
خدمت میں سلام عرض کرنا۔ یہاں کے کام کا ذکر کرنا اور جو کچھ فرامیٹ مجھ کو ضرور لکھنا
چنانچہ سلام رسائی کے بعد راقم احقر نے لبتی نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد سے لیکر قصہ
نوح تک کے جو تاثرات تھے مختصراً عرض کئے فرمایا اصل کام تو یہی ہے۔

کچھ مودبانہ معروضات

نگاہ تجدید میں کام کی اس درجہ اہمیت و عظمت کے باوجود کام کا طریق حضرت
کے مذاق و معیار سے مختلف تھا۔ حضرت کا خاص مذاق ہر چھوٹے بڑے کام میں

قدم قدم پر توازن و توسط حدود اور اعتدال کا غایت اہتمام تھا۔ حضرت مولانا محمد ایلیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ بڑا عاشقانہ تھا۔ احقر کو جب زیارت ہوئی اسی کا تجربہ ہوا لیکن بڑوں کی ہریات نقل و اتباع کی نہیں ہوتی، عشاق میں جو چیز جو شش عشق است وئے ترک ادب، ہوتی ہے اس کی نقالی بار بار در زشت باشد روئے نازیبا و ناز، ہو جاتی ہے

مثلاً تبلیغی گشت کے بعض مواقع پر دیکھا کہ لوگوں کو زبردستی کچھ کچھ کہہ کر مسجد کی طرف گھسیٹا جا رہا ہے کسی کی کمر میں ہاتھ ڈالا جا رہا ہے کسی کے گلے میں کہ بجائی چلو بس اسی وقت سے نماز شروع کر دو کسی نے نہانے کا غدر کر دیا تو زبردستی کمزوں پر لے جا کر نہلایا جا رہا ہے۔ بعضے اس سے بچنے کے لئے بھاگتے اور منہ چھپاتے ہیں بعضوں کی زبان سے سخت کلمات نکل جاتے ہیں یہ سب وہی فاما من استغنی والوں کے ساتھ فائت لہ تصدائی والی نازیبا صورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے لئے ناپسند فرمائیں حالانکہ حضورؐ کے ہاں کسی نازیبا غلو کا نام بھی تھا غلو اور حدود نا شناسی کی ایسی مثالوں کو بعض اکابر جماعت سے کبھی کبھی راقم ہذا عرض بھی کرتا رہا اور ان کی توجیہ سے الحمد للہ کہ اب بہت کچھ ان میں اصلاح ہے البتہ ایک دوسری نوع کی بالکل تازہ مثال عین ان سطور کی تحریر کے دوران میں علم میں آئی ایک اچھے طالب صادق لیکن ان پڑھ عامی جو مہینوں سے اس جماعت سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں جموالت کے شبانہ اجتماعات میں حاضر ہوتے ہیں ایک ضرورت کے اتفاقاً میرے پاس آگئے، تجربہ ہے کہ ایسے عامیوں کی نماز میں بالعموم بہت کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کو معلوم کر کے درستی کی طرف متوجہ کرنے کی عادت ہے ان سے بھی کہا کہ میاں الحمد اور ایک دوسور تیں یاد ہوں ذرا سادہ، الحمد پڑھا تو مالک یوم

الدین کے بعد کنعبد یعنی ایتا سرے سے ندارد اور سورت کے متعلق کہا کہ
انا نیتنا دانا اعطینا، یاد ہے۔

اناللہ! نماز دین کی ساری عمارت کا ستون ہے۔ اس کا معاملہ تو ایسا ہے
کہ جو عامی آدمی ایک مرتبہ بھی اس جماعت یا اس کے کسی خادم کے قریب آجاتا تو
کلمہ کی تعلیم و تصحیح کے بعد ہی سب سے مقدم کام اس کی نماز کی خامیوں کا امتحان لے
کر اس کی درستی و تائید کا اہتمام تھا۔

یقیناً ایسی مثال استثنائی اور اتفاقی مہول چوک ہی کی ہوگی اور گوہے یہ بڑی ہی
روٹھکے ٹکڑے کر دینے والی مہول تاہم اس کے مقابل یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ ایک
دو نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں الحمد للہ ایسی مثالیں ملیں گی جن کو سجدہ نصیب ہوتا تھا
وہ اس جماعت کی برکت سے پانچوں وقت مسجد و جماعت کے پابند ہیں اور بہت سے
شب بیداری کے بخت بیدار سے ہمکنار۔

اصل یہ ہے کہ طول و عرض کے ساتھ کام کے عمق و رسوخ یا گہرائی اور خشکی
پر مزید توجہ کی ضرورت ہے، گشت کی صورت بھی ایک آندھی کی سی ہوتی ہے کہ
آتی اور ٹکل گئی۔ جب تک مسلسل و مستقل انتظام و سعی سے خود گشت کے مقام
پر مقامی جماعت ایسی تیار نہ ہو جائے جس میں اس کام کی لگن اور سنبھالنے کی صلاحیت
ہو اس وقت تک ایسے سرسری گشتوں کی خالی محکمار سے کوئی پائدار نفع نہیں ہوتا
البتہ خود گشت کرنے والوں یا مبلغین کے حق میں ایسے گشتوں کو جو متحرک
خالقہ خیال کیا جاتا ہے درست ہے اور دینی شعور کو بیدار کرنے کا کارگر ذریعہ ہے
بشرطیکہ اس شعور و بیداری سے کام لینے کے لئے ان کی اصلاح کی ضروری تدابیر بھی
ساتھ ساتھ جاری رہیں لیکن یہ تو بہر حال عقلاً و نقلاً کسی طرح درست نہیں کہ خود
مبلغین کے اس نفع کے ساتھ دوسروں کے اس نفع و اصلاح کی ممکن صورتیں

اختیار نہ کی جائیں۔

نفس طول و عرض کی افادیت میں بھی کلام نہیں، حق بات کا ایک بار بھی کانوں میں پڑنا بڑی بات ہے لیکن نثرات تو گہرائی اور سختگی ہی سے پیدا ہوتے ہیں، خود اس تبلیغی نظام کے بڑے رکن رکن بلکہ مقدمہ الجیش نے ایک موقع پر بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا تھا کہ صحابہ گنتی کے تھے اور تمام دنیا پر بھاری تھے اور ہم لاتعداد ہیں اور زمین پر بھاری ہو رہے ہیں، یہ زمین و آسمان کا فرق وہی رسوخ و عمق کے فرق کے سوا کیا ہے

عرض کیفیت و رسوخ اور حدود اعتدال کی رعایات کے ساتھ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی جو تبلیغی تجاویز و اصلاحات پیش کش کتاب میں پیش کی گئی ہیں اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو انشاء اللہ سونے میں سہاگہ ہو گا۔ اور اس تبلیغی خدمت کا کمی کے ساتھ کیفی فیض خصوصاً بہت بڑھ جائیگا۔ جماعت کے بعض اچھے اہل اعتدال حضرت کی خدمت میں یوں بھی جب کبھی عرض کرنے کا موقع آیا تو مسرت ہوئی کہ وہ بھی بعض ایسی باتوں کو محسوس اور اصلاح کی سعی فرما رہے ہیں۔

ورنہ فہم احقر میں تو ان باتوں کے باوجود اس وقت دین کی جتنی متعدی و جماعتی خدمات ہو رہی ہیں شاید ہی کوئی اس سے اہم و اقدم ہو، خصوصاً ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں ہم نام کے مسلمانوں کے نام کے بھی بدل جانے کے جو حالات درپیش ہیں ان کی روک تھام کے لئے اس تبلیغی نظام سے بڑھ کر ہمارے حق میں حق تعالیٰ کی کوئی رحمت نظر نہیں آتی، پھر بھی اس سے انتفاع میں اپنی غفلت دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ آخری مہلت اور اتمام حجت نہ ہو۔ اعاذنا اللہ

آج کی دنیا میں دین کے لئے سب سے بڑا فتنہ سیاست ہے اچھے اچھے اہل علم و اخلاص افراد اور جماعتوں کو دیکھا جاتا ہے کہ رسالت و نبوت کی ساری تبلیغی حقیقت

و معنویت کو سیاست و حکومت کے آشوب و طغیان میں اس طرح کھویا جا رہا ہے کہ گویا پیامبر اسلام کا اصل پیام کوئی خاص سیاسی نظام اور اس کی حکومت کا قیام ہی تھا۔ نیت کچھ ہو نتیجہ یہی ہو رہا ہے کہ اپنے پرانے سب کی نظر میں اسلام اور مسلمان بھی اسی دنیا کی سیاست و حکومت کے لئے لڑنے مرنے والی کوئی آئیڈیالوجی اور اسی کی حامل جماعت ہے یہ نتیجہ و اثر بالکل نفسیاتی ہے جو دین کی روح کے ساتھ نادان دوستوں کی بڑی دشمنی ہے۔

آخر کچھ تو بات تھی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کی بھی دعوت میں قیام حکومت یا حکومت وقت سے مقابلہ کو براہ راست شریک نہیں فرمایا گیا، مراۃ امر ہوا تو صرف قتال و جہاد فی سبیل اللہ کا یعنی اللہ کی راہ پر چلنے چلانے میں اگر ظلم و زیادتی کے ساتھ کوئی مزاحمت کرے تو اس کو دور کرنے کے لئے تن من و حن سب کی بازی لگادو، وہ بھی جہاد کے خاص شرائط کے اجتماع اور خاص حدود کی پابندیوں کے ساتھ، پھر اللہ تعالیٰ کی نظر میں اگر ہمارا "ایمان و عمل صالح" اس درجہ کا ہو کہ زمین پر اپنی جانشینی (خلافت) کی سعادت و عزت سے نوازا جائے تو غیبی نصرت اس کے شہادت دہی اسباب بھی فراہم فرما دیگی۔ اسی بناء پر احقر اسلامی یا الہی حکومت کے داعیوں کو عرض کیا کرتا ہے کہ حصول حکومت کا دعویٰ و دعوت مقصود بالذات بالکل نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح کے عند اللہ معلوم و مقرر درجہ پر موعود ہے وہ بھی حکومت نہیں خلافت۔

كما قال الله تعالى - وعد الله الذين آمنوا و عملوا الصالحات ليس تخلفتم في الارض (الآیہ) - بالذات مامور ہم صرف ایمان و عمل صالح کے تمام ابواب و احکام کے موافق اپنے ظاہر و باطن کو آراستہ کرنے اور دوسروں کو حال و قال سے اس کی طرف بلانے کے ہیں

جوت و رسالت کی اصل دعوت ایمان و عمل صالح کے ساتھ حکومت و سیاست

کی دعوت کو غلط ملط کرنے کے مفاسد کو دیکھ دیکھ کر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی اس عہد میں سب سے بڑی حکمت و دانائی اور نبوت و رسالت کی منصب شناسی یہی ہے کہ اپنی دعوت اور طریق دعوت کو حکومت و سیاست کی آلودگی سے بالکل بچائے رکھا۔

ان اصول کے ساتھ اگر طریق کار کے فروغ میں حدود کا اہتمام اور غلو سے احتیاط ہو تو سبحان اللہ ”نور علی نور“ یا رما آل دار و ایں نیز ہم ”یوفقتنا اللہ لما یحب دیرضی“۔

ورنہ نفس تبلیغ عام کی جس درجہ اہمیت خود حضرت جامع المجیدین علیہ الرحمۃ کی نظر میں تھی اس کا اندازہ اس مختصر سے مضمون سے کیا جاسکتا ہے جس میں تفہیم المسلمین کے عنوان سے حضرت نے اس کی ضرورت و اہمیت کی طرف عموماً سائے مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے اور اپنے کفش برداروں کو خصوصاً تاکید فرمائی ہے البتہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے حضرت علیہ الرحمۃ

۱۔ اس غلط ملط سے اہوں شکل تو لطیف ایک سیاسی آئیڈیالوجی کے خالص خلافت کی دعوت ہوگی۔

۲۔ اپنے نفس پر بالکل اعتماد نہیں خدا نہ کرے ان معروضات میں کوئی نفسانیت شریک ہوئی تو الدین النصیحة کے اجر کی جگہ الٹے منافع للخیروں کے وزر کا مستوجب ٹھہروں گا اسی تقدم و تاخر میں کئی بے غتے گذر گئے اور تین تین مسودوں کی کانٹ چھانٹ اور جماعت کے اندر اور باہر کے چار چار ثقہ و اہل علم کے مشورہ کے بعد اب بھی ڈرتے ڈرتے ان معروضات کو پیش کیا جا رہا ہے۔ افراط و تفریط کے بعض بعض تجربات و مشاہدات پر سب متفق ہیں۔ البتہ ان کے اظہار اور عنوان اظہار میں کچھ اختلاف ٹھکانیں اس آخری مسودہ پر الحمد للہ سب کا کم و بیش اتفاق ہے خود جماعت کے اندر کے ایک بڑے معتمد علیہ ذی علم کہ اندیشہ تھا کہ جماعت کا نام ظاہر کر دینے سے خود اس حضرات کا انتفاع و استفادہ محدود ہو جائے گا لیکن راقم احقر کو ان حضرات کے اخلاص و انصاف سے یہ بدگمانی بھی نہیں۔

کے پیش نظر کامل دین کی کامل اصلاح و تجدید تھی اس لئے اس تبلیغ عام میں بھی خالی کلمہ طیبہ اور نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہی کی نہیں بلکہ دیگر احکام کی تبلیغ کو بھی شریک فرمایا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

”علماء اور ان کے معظموں کے علاوہ اس وقت فضاء زمانہ کا مقتضی یہ ہے کہ احکام الہیہ کے پہنچانے کا کام ہر مسلمان اپنے ذمہ لازم سمجھے اور ہر شخص اسی دھن میں لگ جائے جیسا اسلاف کا طریقہ تھا کہ علماء و صوفیہ، امراء و غریاء، خواندہ و ناخواندہ سب کو یہی دھن تھی کہ جس کو جو احکام معلوم ہوں دوسروں تک پہنچایا جائے، علماء و عطا تذکیر کرتے تھے صوفیہ اپنی مجلسوں میں نورباطن اور پاکیزہ باتوں سے بندگان خدا کو خدا کی طرف متوجہ کرتے تھے تاجر و غیرہ اپنے معاملات میں ملاقات میں اللہ کو نہ بھولتے تھے اگر یہ کام تنہا علماء کے ذمہ ڈال دیا جاتا تو حق کی روشنی ان مقامات میں نہ پہنچ سکتی، جہاں کسی عالم یا فاتح کا قدم نہیں پہنچا۔ لہذا تمام مسلمان عموماً اور میرے ساتھ تعلق رکھنے والے خصوصاً آج ہی سے اس دھن میں لگ جائیں کہ جتنا جس کو اسلام کے متعلق علم ہے اس کو دوسروں تک پہنچائے اور غیبی نصرت کا امیدوار ہے اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَ اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ۔“

دستور العمل

اس کے متعلق دستور العمل اور نظام العمل یہ مقرر فرمایا گیا ہے کہ

(۱) ہر شخص اولاً دین میں خود نچتہ و مضبوط ہو، احکام پر عمل کرنے اور دوسروں کو سکھانے میں نہ کسی سے مرعوب ہو نہ کسی کی مروت و تعلق کی پرواہ کرے اللہ تعالیٰ سے

پڑھ کر کون ہے جس کے لئے احکام الہیہ کو ترک کیا جائے۔
 (۲) ہر شخص کو چاہئے کہ کسی جلسہ و مجلس کو احکام الہیہ پہنچانے سے خالی نہ رکھے
 مگر باریک و اختلافی مسائل میں دخل نہ دے کہ یہ علماء کا کام ہے۔ سختی کا
 جواب سختی سے نہ دے۔ صبر و تحمل سے کام لے۔

جب کسی دنیاوی غرض تجارت یا ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں بھی
 کسی سے ملنا ہو تو حسب موقع باتوں باتوں میں کلمہ حق ضرور پہنچا دیا جائے
 (۳) رات دن میں کوئی وقت اس کام کے لئے بھی نکالا جائے جس میں بندگان
 خدا (مسلم غیر مسلم) کو احکام اسلام پہنچائے جائیں اور بُرے کاموں سے
 روکا جائے۔

(۴) احکام کے پہنچانے میں ہمیشہ نرم ہونا چاہئے البتہ جن پر اپنی حکومت ہے
 جیسے بیوی بچے، نوکر، شاگرد وغیرہ ان کو اول نرمی سے نصیحت کی جائے پھر
 تدریج سختی سے سمجھایا جائے

تبلیغ احکام کی ترتیب یہ ہو

(ا) جن کو کلمہ نہ معلوم ہو ان کو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ
 سکھایا اور اس کے معنی سمجھائے جائیں۔

(ب) جن کو کلمہ معلوم ہو ان کو اس کے معنی سمجھائے جائیں اور کہا جائے کہ رات
 دن میں کم از کم سو مرتبہ لا الہ الا اللہ اور اس کے ساتھ کبھی کبھی مُحَمَّدٌ
 رَسُولُ اللَّهِ ضرور پڑھ لیا کریں۔ حدیث میں ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہہ کر
 اپنا ایمان تازہ کرتے رہا کرو۔

(ج) جو لوگ نماز نہیں پڑھتے ہیں ان کو پابندی نماز کی اور مردوں کو مسجد میں باجماعت نماز کی تاکید کی جائے۔ جن کو نماز کا طریقہ نہ معلوم ہو ان کو سکھایا جائے اور ممکن ہو تو پوری نماز کا ترجمہ بھی یاد کرا دیا جائے (یعنی سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ سے لے کر التَّحِيَّات اور درود شریف تک) اور وضو و پاکی و ناپاکی کے مسائل سے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا جائے

(د) جن پر زکوٰۃ فرض ہے ان کو زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی جائے جن پر قربانی واجب ہے ان کو قربانی کی ترغیب دیں۔

(۵) رمضان شریف کے روزے کی تاکید کی جائے

(و) جن پر حج ہے ان کو حج کی تاکید کی جائے

(۶) ہر بستی میں تعلیم قرآن کے مکاتب ضرور ہونا چاہئیں جن میں تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ اردو رسائل بہشتی زیور، بہشتی گوہر و راہ نجات وغیرہ بھی پڑھائی جائیں تاکہ بچوں کو ضروری احکام کی اطلاع ہو۔

(ح) سب مسلمانوں کو باہم اتفاق و اتحاد سے رہنے اور گالی گلوچ، لڑائی جھگڑا بند کرنے کی تاکید کی جائے

(ط) بستی کے کسی باشندے کو یا چند باشندوں کی جماعت کو اپنا برا بنایا جائے حین کام یہ ہو کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں اور امور مذکورہ بالا کو رواج دیں اور جب کسی معاملہ میں نزاع ہو اس کا تشریعت کے موافق حل مارے پوچھ کر فیصلہ کریں اور سب اس فیصلہ کی تائید کریں۔

(ی) جھوٹ، غیبت، حسد و کینہ، دشمنی، کسی کی بیجا طرفداری، جعل خوری کرنا، بدنگاہی، بے پردگی، شراب نوشی، لڑکوں سے ناجائز تعلقات، سودی لین دین۔ بیکاری آوارہ گردی کا انسداد کریں۔

سچ بولنے، یا ہم تو واضح و محبت کا پتہ دکھانے، انصاف و عدل پر مضبوطی کے ساتھ جیسے رہنے اور جائز ذرائع سے معاش میں لگے رہنے، کفایت شعاری اور آمدنی سے زیادہ خرچ نہ کرنے کی بہت تاکید کریں۔ تنگی برداشت کریں۔ مگر حتی المقدور زیادہ خرچ نہ کریں۔

تقریبات اور روزمرہ کے خرچ میں کفایت کرنے والے پر طعن و تشنیع نہ کریں بلکہ اس کی ترغیب دیتے اور حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ کسی جائز پیشہ کو عار نہ سمجھیں، بیماری اور سوال کی ذلت (خواہ قرض ہی کا سوال ہو) کے مقابلہ میں گھاس کھودنے کو ترجیح دیں۔ اور نیک عمل اختیار کرنے کی خود بھی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی تاکید کرتے رہیں۔

(۶) حیات المسلمین، تبلیغ دین، تعلیم الدین، محاسن اسلام، بہشتی زیورہ کو مطالعہ میں رکھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے مضامین دوستوں، ملنے والوں اور سب بندگانِ خدا کو پہنچاتے رہیں۔

(۷) جو علماء کسی دینی خدمت، درس و تدریس، تالیف و تصنیف وغیرہ میں مشغول ہیں وہ بھی اپنے ملنے جلنے میں بندگانِ خدا کو احکام پہنچانے میں سستی نہ کریں اور فرصت کے اوقات جیسے جمعہ کی تعطیل، طویل رخصت کا زمانہ ہے اس میں وعظ و نصیحت کے ذریعہ بندگانِ خدا کو احکام اسلام پہنچانا اپنا فریضہ جانتیں۔

میں اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو خاص طور پر مکرر تاکید کرتا ہوں کہ امور مذکورہ بالا کی پوری پابندی کریں اور اس میں کوتاہی ہرگز نہ کریں۔ اور تمام اہل اسلام سے بھی یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس دستور العمل کو حرز جان بنا کر ہر شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے تو مصائب و پریشانیوں کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اور نصرت الہی ان کے ساتھ ہوگی، اور اس دستور

العمل کو چند روز تک نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ قائم و جاری رکھیں،
 رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَمَانًا
 وَأَلْصِقْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

تبلیغ کے اس دستور العمل کی بڑی خصوصیت وہ ہے کہ کلمہ اور ارکان اسلام کی اقدمیت و اہمیت کے باوجود حضرت جامع المجددین کے پیش نظر جامع و کامل دین کی جامع و کامل تجدید و اصلاح ہے اور اس کی تفصیل میں ایمان و عمل، معاش و معاملت، اخلاق و معاشرت کی موٹی موٹی باتوں کا ایک سہل اور قابل عمل نظام العمل تجویز فرما دیا گیا ہے جس میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ جو کچھ مضبوط و مؤثر بنیادوں پر ہو، اگر اس کو مسلمان اب بھی مضبوطی کے ساتھ متحام لیں تو انشاء اللہ کسی مقابلہ و مقابلہ کے بغیر ہندوستان و پاکستان بلکہ سارے اسلامی ممالک کی دس سال کے اندر کا یا پلٹ جانا یقینی ہے۔

باقی غیروں کی نقالی اور سیاسی ہڑبازی اور ہنگاموں کے سوا دین کی صحیح راہ سے اگر کچھ کرنا ہی نہیں تو اس کے جو نتائج اب تک رہے وہ بھی سامنے ہیں اور آئندہ ان سے بڑتر کا اندیشہ ہے، اللہ کی نصرت تو اللہ ہی کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہوگی۔ اور راہ دہی ہے جس کی طرف حضرت نے اس دستور العمل کے خاتمہ کی آیت میں ارشاد فرمایا ہے جس میں دعا کی صورت میں یہ تعلیم ہے کہ سب سے پہلے اپنے گناہوں اور دین و دنیا کے معاملات میں اپنی زیادتیاں یا حدود ناشناسیوں سے تائب و معذرت خواہ ہو کر (رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا) اللہ کے لئے دین کے راستہ پر قدموں کو جالیا جائے (وَتَثَبِّتْ أَمَانًا) تو کفار کے مقابلہ میں نصرت یقینی ہے (وَأَلْصِقْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ) یہ سنت اللہ کی منطق اور اس کے

مقامات ہیں جن سے گریز کر کے مسلمانوں کے لئے کسی کامیابی کی توقع قطعاً کتاب و سنت کے محکمات و نصوص کے خلاف اور نری خام خیالی ہے قرون اولیٰ کی تاریخ نے کوئی سبق ہمارے لئے چھوڑا نہیں۔ حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کا ایک مہینہ محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور فتح نہیں ہو رہا ہے ایک مہینہ کی مدت کسی ملک کی فتح کے لئے کیا تھی۔ پھر بھی امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اتنے دن محاصرہ کو ہو گئے اور اب تک کامیابی نہیں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ لشکریوں میں تقویٰ و تقویٰ کی کمی ہو گئی ہے اس لئے سب اپنے معاصی سے توبہ اور اپنی اصلاح کریں۔ چنانچہ سب نے مل کر توبہ کی، پھر جو حملہ کیا تو ایک ہی دن میں شہر فتح ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس ناکامی کو ظاہری اسباب و تدابیر کی کمی و بے سرو سامانی پر محمول نہیں فرمایا بلکہ دین کی سستی و غفلت پر لے

بہر حال اب تک جس راہ پر ہم دوسروں کے پیچھے چل رہے ہیں یہ تو نفس حکومت و جاہ طلبی کی وہی فرعونی و شدادی راہ ہے اور مسلمان جب تک اسلام کا نام برائے نام لے کہ خود فروعی اور فرائضی میں گرفتار ہیں اس وقت تک ناکامی اور رسوائی کے سوا کسی دوسرے نتیجہ کی امید رکھنا اسلام کی حقیقی تعلیم اور اصلی تاریخ دونوں سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔

وقت ہے کہ اب بھی آنکھیں کھل جائیں ورنہ حکومت کا غیر اسلامی یا لادینی جبری نظام تعلیم دس سال کے لئے بھی اگر ہماری اس غفلت میں چل گیا، کہ ہم نے خود

یا حکومت پر زور ڈال کر مسلمان بچوں کے لئے حضرت کی تجدید و تاکید کے مطابق اسلامی مکتب و مدارس گاؤں گاؤں و قصبہ قصبہ میں نہ قائم کر دیئے تو ایک نسل کے بعد ہی اسلام کا خالی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ذرا غور فرمائیے کہ اقلیت کے حق میں اس کا نقشہ کیا ہوگا ایک طرف تو پڑھانے والے شاذ ہی کسی مدرسہ میں مسلمان ہوں گے یا دس یا پنج میں ایک آدھ، دوسری طرف دن رات میں ساتھ لکھنے پڑھنے والوں کا تناسب کم و بیش یہ ہوگا کہ اگر ۵۰-۷۰ مسلمان بچے ہیں تو ۵۰/۶۰ غیر مسلمان کتابوں کے مضامین قریباً تمام غیر اسلامی روایات و رجال سے پُر۔ زبان تک مسلمان بچوں کی مادری یعنی اردو نہیں بلکہ ہندی ہے وہ بھی سنسکرت سے لدی ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے جبری نظام میں جو بڑے ہوتے بچے بطور خود بھی اگر جائیں تو اردو سے ناواقف ہونے کی بدولت اپنے دینی معلومات و روایات نہ جان سکیں گے، حکومت بدینیت نہ بھی ہو اور غیر مسلم استاد دیدہ و دانستہ مسلمان بچوں کو ان کے دین و ایمان سے برگشتہ نہ بھی کرنا چاہیں تو بھی اس ماحول و تربیت میں بسر کرنے والے وہ مسلمان بچے کتنے مسلمان رہ جائیں گے۔ جو زیادہ تر اب بھی صرف اتنے مسلمان ہیں کہ نام کے مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں، آج بھی بولی بے رنگ ہے جس میں غیر مسلم پڑھتے پڑھانے والوں کا غلبہ ہے خود کا انگریزی حکومت کے ایک مسلمان کا انگریزی عہدہ دار کی معنی شہادت ہے کہ ایسے مدرسہ کے مسلمان بچے سلام کے بجائے ہاتھ جوڑ کر منسکارتے ہیں۔

حکومت کی مددک چارہ کار صرف یہ ہے کہ مختلف سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے مسلمان بالائینفاق کھل کر واضح کر دیں کہ جبری تعلیم کے لئے ہم بخوشی طیارہ ہیں لیکن ناسمجہ اثر پذیر بچوں کی کسی ایسے ماحول میں تعلیم پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتے..... جس میں ان کے دین و ایمان پر کسی ناموافق اثر کا ادنیٰ احتمال بھی ہو، حکومت اگر ٹیک نیت ہے تو متھوڑے بہت مصارف کی زیادتی سے آسانی مسلمان بچوں کی جبری تعلیم کا ان کی خاص تہذیبی و دینی روایات کی حفاظت کے ساتھ انتظام کر سکتی ہے ساتھ ہی مسلمان بچے خود اپنے کو دیانات، معاملات، معاشرت اور اخلاق غرض زندگی کے تمام شعبوں میں پورا (بقیہ پڑ صفحہ آئندہ)

نام لینے والے بھی ہندوستان میں خدای جانشاہ سے کہ کتنے رہ جائیں گے۔

تعلیم المسلمین

تعلیم المسلمین کے مسند ترجمہ بالا و معتبر النزل پہلے تعلیم المسلمین کے عنوان سے اسی مقصد کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ وعظ اور دعاظوں کے لئے بھی ایک دستنویز العمل ضروری اصلاحات و تجدیدات کے ساتھ تجویز فرمایا گیا ہے اس کی تمہید میں بھی ارشاد ہے کہ:-

نصوص کثیرہ میں صلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی تاکید بھی وارد ہے اور سورۃ العصر تو بلا شرکت خاص اسی موضوع کے لئے نازل ہوئی اس میں جہاں تصحیح عقائد و اصلاح اعمال کو نجات کی شرط فرمایا ہے جو حاصل ہے خسران سے بچنے کا وہیں **وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ** میں دوسروں کی تعلیم عقائد و اعمال کو بھی شرط نجات میں داخل فرمایا ہے اس کے علاوہ قرآن و حدیث میں اسی مضمون کے اور بیشمار نصوص و امثال معروف و نہی عن المنکر اور وعظ و تذکر کے عنوان سے نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ مذکور ہیں اور اس میں سستی و ترک پر وعیدیں بھی وارد ہیں نیز انبیاء علیہم السلام کا خاص فریضہ یہی رہا ہے

(بقیہ ماثیہ از صفحہ گذشتہ) مسلمان بنانے کے لئے اپنی دینی صلاح و اصلاح اور اہل المعروف و نہی عن المنکر کے واجبات کا ذمہ اہتمام کریں جو خود ان کے دین ہی نے مقرر کر رکھا ہے اور جس کی جہد و قوت نے تمام و کمال تجہیز فرمادی ہے یہ ماثیہ احقر کے مضمون نئی شکل کا پُرانا حل سے ماخوذ ہے جو مرقع مطبوعہ ۲۱ و ۲۸ فروری ۱۹۴۴ء شائع ہوا ہے پوری تفصیل قابل ملاحظہ ہے۔

باقی دین کے جتنے شعبے ہیں مثلاً افتاء، درس و تصنیف وغیرہ
 سب اسی کے آلات و مقدمات ہیں خود تنظیم (یا حکومت) جس کی ضرورت
 سب کو تسلیم ہے بلکہ آج کل ساری دنیا آزادی و خود مختاری کے نام
 سے اسی پر جان ڈے رہی ہے، اسلام میں وہ بھی (اسی مقصد اصلاح
 ایمان و عمل کے تابع اور اس کا مقدمہ ہے چنانچہ اس آیت اَلَّذِیْنَ
 اٰتٰی تَمَکَّنًا هُمْ فِی الدِّیْنِ فِیْ مِیْاں تَمَکَّنِیْنَ کے مقاصد ذکر فرمائے
 ہیں ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بھی جزء مقصود فرمایا گیا ہے
 غرض صحیح اسلامی حکومت یا تمکین فی الارض کی اصلی غرض بھی خود مختاری قطعاً نہیں
 بلکہ خدا مختاری ہے یعنی حکومت و سیاست سب خدا کی زمین پر خدا کی مرضیات و احکام
 پر چلنے چلانے کے لئے اور انہیں مرضیات و احکام کی مخالفت یعنی
 ارتکاب معاصی کو قرآن و حدیث میں صراحتاً دینا و آخرت کے سائے
 مصائب کا سبب قرار دیا گیا ہے اور خادمانِ ملت نے اس باب میں
 مستقل تصانیف بھی لکھی ہیں اور ایک مختصر رسالہ جزء الاعمال احقر
 کا بھی شائع ہو چکا ہے اور حیوۃ المسلمین کے خطبہ میں بھی دہشتیں عنوان
 سے اس کی تقریر کی گئی ہے

لہذا اس کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضروری ہونے
 میں کیا شبہ رہا جس کے ذرائع میں سب سے سہل اور شیع کے اعتبار
 سے عام و تمام و غلط کا ذریعہ ہے

وعظ اور واعظوں کا انتظام و اصلاح

اس کے بعد وعظ اور واعظوں کے متعلق جو اصلاحی ہدایات تجویز فرمائی گئی ہیں وہ

منقلاً یہ ہیں :-

مدہ اسلامی مدرسہ وانجمن کم از کم ایک واعظ بھی مقرر کرے اور یہ سمجھے کہ ضرورت تعلیم کے لئے ایک مدرس کا اضافہ کیا کیونکہ جس طرح مدرسہ کے معلمین طلبہ کے مدرس ہیں واعظین عوام کے مدرس ہیں اور اہل انجمن یہ سمجھیں کہ یہ تعلیم عوام کے لئے ان کی انجمن کی ایک شاخ ہے۔

جہاں مدرسہ وانجمن نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کا انتظام نہ کر سکے وہاں رؤساء افراد یا اشتراکاً اپنے پاس سے خواہ دے کہ الیاد واعظ مقرر کریں مگر اس کا انتخاب علماء سے کرانیں جہاں الیاد کوئی باہمت رئیس نہ ہو وہاں اہل بستی باہمی چندہ سے کریں مگر چندہ میں کسی پر جبر نہ کریں یہ واعظ خواہ متحرک عالم نہ ہو مگر دینیات پر کافی نظر ہو کہ تقریر میں یا کسی کے سوال کے جواب میں غلط روایت یا غلط مسئلہ بیان نہ کرے۔

واعظ کا انتخاب تو جیسا کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے ہدایت فرائی متدین علماء سے ضرور کرنا چاہئے باقی جہاں تک نفس واعظ کوئی کی تعلیم کا تعلق ہے اگر کچھ بھی صلاحیت ہو تو خود حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے مواعظ جو دین کے تمام ابواب کو جامع و محیط ہیں ہر اعتبار سے ایسے کافی و وافی اور اتنے کثیر ہیں کہ کسی واعظ کو عمر بھر بھی ان سے باہر جانے کی ضرورت انشاء اللہ پیش نہیں آئے گی۔ حسب موقع و حسب ضرورت انہیں کے اجمال و تفصیل سے یہ خدمت باحسن و جرائد انجام دیا جاسکتی ہے۔

۱۔ بجائے موجودہ جن ملاقوں میں یا دیہاتوں میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہو ان میں اور بھی خصوصاً ایسے واعظوں کا انتظام خود مسلمانوں کی طرف سے ضروری ہے جو ان مقامات کا برابر دورہ کرتے رہیں اور مسلمانوں کو جمع کر کے احکام کی تبلیغ اور اپنے دین کی حفاظت کی تاکید کرتے رہیں۔

بلا ضرورت اختلافی مسائل نہ بیان کرے اور اگر ضرورت ہی پڑ جائے
تو عنوان نرم و سہل ہوگا اگر کسی شخص کا نام لینا پڑے تو اس کی نسبت کوئی
سخت کلمہ نہ کہے بس متانت سے سببہ حل کر دے خواہ کوئی مانے یا نہ
مانے ۷

عام طور پر دو اعظ کسی کی دعوت قبول نہ کرے البتہ اگر داعی پہلے سے
شنا سا اور مخلص ہو تو کوئی مضائقہ نہیں یا شناسا نہ ہو مگر قرآن سے مخلص
ہونا دل کو لگتا ہو تو بھی مضائقہ نہیں مگر از قسم ہدیہ نقد وغیرہ نقد ہرگز نہ
قبول نہ کرے ۸

کسی مدرسہ یا انجمن یا اسی مد و عظم کے لئے چندہ کی ترغیب ہرگز نہ
دے، بلا ترغیب کوئی دے بھی تب بھی انکار کر دے پھر بھی نہ مانے
تو کہہ دے کہ براہ راست مرکز میں بھیج دو میں نہیں لیتا۔ (غرض جہاں
تک تبلیغ احکام کا تعلق ہے لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا کے انبیائی
اسوہ و معیار کو زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھے)

”سیاسی امور یا کسی کے ذاتی معاملات کے فیصلہ میں داعظ دخل نہ
دے اگر اس کی درخواست بھی کی جائے تو صاف انکار کر دے۔

کسی کو تعویذ گنڈے دینے یا بیعت لینے سے داعظ کو قطعاً منع
کر دیا جائے اگرچہ وہ اس کا اہل بھی ہو۔

داعظ صرف و عظم ہی پر اکتفا نہ کرے کیونکہ وعظ میں وہی لوگ آتے
ہیں جو پہلے سے کچھ دیندار ہیں اور ضرورت سب کو دیندار بنانے کی ہے
اس لئے حسب ذیل طریقہ اختیار کرنا چاہئے

الف) جو مسلمان نماز نہیں پڑھتے مسجد میں نہیں آتے ان کے مکان پر

چند واقف مخلص اسباب کو ساتھ لے کر جائے اور نرمی کے ساتھ اول
مذہب غایہ کلمہ پتہ پتہ پھر اسی کے واسطے سے گھر والوں کا کلمہ مطہر
کیا جائے پھر سب کو نماز کی تاکید کی جائے اسی طرح سب بے نمازیوں
کے مکان پر جایا جائے اور ہر پستی کے اندر ایک یا متعدد جماعتیں غلص
و مستعد دینداروں کی ماتحتی میں قائم کر دی جائیں جو برابر اسی طرح لوگوں کے
مکان پر جا کر کلمہ سکھائے اور بے نمازیوں کو نمازی بنانے کا کوشش
کرتے رہیں اور اس خطاب خاص میں بحر کلمہ کی تلقین اور تہذیب اکید کے
اور کچھ نہ کہا جائے باقی احکام کے لئے عام و خط کو کافی سمجھ سکتے

مجلس دعوة الحق

حضرت علیہ الرحمۃ نے خود اپنے ہاں اسی نظام العمل کے مطابق کام بھی شروع
فرمادیا تھا اور بعد میں دعوة الحق کے نام سے خاص دعوت تبلیغ کی خدمات ہی کی تکمیل
و انجام دہی کے لئے ایک مستقل مجلس کی بھی بنیاد ڈالی تھی جس کی مختصر تفصیل دعوة
الداعی نام کے مضمون میں فرمائی گئی ہے۔ آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا
كَآفَّةً فَلَوْلَا لَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ
وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ کے ذیل میں
تمہید ارشاد ہے کہ

در اس آیت سے معلوم ہوا کہ تعلیم احکام اور اس کی ضرورت سے تعلیم احکام
ایسا اہم فریضہ ہے کہ عین جہاد حقیقی میں ہوا عظیم العبادات ہے مشغول ہونے
کے وقت بھی واجب ہے کہ ایک جماعت بجائے جہاد کے اس فریضہ کی خدمت
انجام دے۔ تو اور کسی وقت اس کا اہتمام کیوں نہ واجب ہوگا!

درج ظاہر ہے کہ کوئی طاعت کیسی ہی عظیم اور نوری ہو وہ معتبر اور مقبول اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ شرعی قوانین کے موافق ہو اور ان قوانین کے موافق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے ان کا علم ہو جس کی دو صورتیں ہیں یا خاص طور پر ان کا درس و تدریس یا عام طور پر تعلیم و تبلیغ پہلا طریقہ یہی اسباب کی بناء پر عام نہیں ہو سکتا۔ لہذا دوسرا طریقہ ہی رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی طریقہ اختیار فرمایا گیا اور اکابر امت بھی بہت سے زیادہ اس کا اہتمام فرمایا۔ باقی درس و تدریس تصنیف و تالیف وغیرہ کو اسی کا مقدمہ قرار دیا۔

”مگر ایک طویل زمانہ سے اس کی طرف سے بہت بے اتفاقی ہو گئی ہے جس کا لاؤمی نتیجہ جبل کا غلبہ ہے اور غلبہ جبل سے فسادِ عمل اور فسادِ عمل سے مسلمانوں کا ہر قسم کا ظاہری و باطنی تنزل اور گوناگوں مصائب میں ابتلا اس درجہ رونما ہو گیا ہے کہ اگر جلد اس کا تدارک نہ کیا گیا تو قوی اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم من حیث الاسلام فنا ہو جاتے“

الحمد للہ کہ اس نادرِ وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دستگیری فرمائی کہ بعض بے سروسامان بندوں کو اس کا احساس اور احساس کے ساتھ اس کی توفیق عطا فرمائی کہ وہ اللہ ہی کے بھروسہ پر کھڑے ہو گئے اور اس خدمت کی تکمیل کے لئے دعوتِ الحق کے نام سے ایک مجلس بنا کر کام شروع کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک دشمن کا کام نہیں اس میں ایک بڑی جماعت کی ضرورت ہے جس کی دو صورتیں ہیں “

ایک یہ کہ بہت سے تبلیغ کا کام کرنے والے تنخواہ پر رکھے جائیں اور تنخواہ کے لئے بڑے پیمانہ پر چندہ کی تحریک کی جائے مگر موجودہ فضا پر نظر

کر کے اس میں یقیناً لوگوں کو تنگی ہوگی جس میں ناکامی کے ظن غالب کے علاوہ اس کے شرعی جواز میں بھی شرح صدر نہیں ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تنخواہ دار تو کم ہوں امدان کی تنخواہ کے کفیل وہ خاص حضرات ہوں جو بلا تحریک اپنی رغبت سے اس کو برداشت فرمائیں۔

باقی زیادہ کام کرنے والے غیر تنخواہ دار ہوں جس کی شکل یہ تجویز کی گئی ہے کہ جواہل علم حضرات اس خدمت میں حصہ لینا چاہیں وہ حسبۂ لہذا اس لئے کچھ ماہانہ، سہ ماہی، یا سالانہ، دو چار دن، ہفتہ، دو ہفتہ، یا مہینہ سوا مہینہ مثلاً کمال کرناظم مجلس دعوت الحق (خانقاہ امدادیہ متھان بھون ضلع مظفرنگر) کو اطلاع فرمائیں۔ امدیہ ان حضرات کی طرف سے گویا چندہ ہوگا، جو روپیہ پیسہ کے چندہ سے زیادہ عزیز و مفید ہوگا۔

مہر جہاں اور جہاں اس خدمت کے لئے ان کو تکلیف دینے کی ضرورت ہوگی ان سے عرض کیا جائے گا کہ وہاں مجلس کے حسب اہت تبلیغ کا کام انجام دیں۔ آمدورفت کا کرایہ اور مصارف خود دہنوش اعتدال کے ساتھ پیش ہوں گے۔ اور جن بزرگ کو خادم کی عادت ہوگی ان کی خدمت میں خادم کے مصارف پیش کئے جائیں گے یہ عرض تو عام اہل علم حضرات کی خدمت میں بطور مشورہ ہے۔

لیکن اپنے خادموں کو بصورت درخواست محکم ہے کہ جن حضرات کو احقر کے ساتھ خاص تعلق ہے ان سے مشورہ کے آگے اس کی درخواست ہے اور اس مشورہ اور درخواست کے بعد چھینی سے منتظر ہوں کہ اب جسٹس کب تیار ہو جائیگا اور امید رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ ویر نہ لگے گی۔“

تیز عموماً اہل علم کی ساری جماعتوں سے یہ بھی عرض ہے کہ ان معین اوقات کے علاوہ دوسرے عام اوقات میں بھی اپنی اپنی جگہ خاص و عام تبلیغ سے غافل نہ رہیں، جس کے ضروری قواعد آسانی کے لئے تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین میں بطور نمونہ منبسط بھی کر دیئے گئے ہیں (جن کا خلاصہ وحوالہ اوپر گزرجچکا)

اگر پابندی و اخلاص کے ساتھ اس دستور العمل پر عمل کر لیا گیا تو انشاء اللہ اس کے ثمرات فلاح و صلاح اور نجات بہت جلد مشاہدہ میں آجائیں گے۔ اور آخرت کے ثمرات کا تو پوچھنا ہی کیا۔

خود حضرت کے ہاں تو حضرت کی ہدایت اور مذاق کے مطابق حضرت کی حیات ہی میں اس کام کا آغاز ہو گیا تھا اور بعد میں بھی کچھ جاری رہا۔ لیکن حضرت کا اور حضرت کے اثر سے حضرت کے خادموں کا مذاق چوکھ اعلان و اشتہار کا بالکل مد تھا اس لئے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں کہاں اور کیا کیا ہو رہا ہوگا، لیکن جن پر حضرت کی صحبت کا کچھ رنگ چڑھا ہے امید ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ حسب توفیق غافل نہ ہوں گے باقی عام مسلمانوں میں پابندی و اخلاص کی جو قید و شرط حضرت نے بالکل بجا طور سے لگائی ہے اگر وہی ہوتی تو آج یہ نوبت ہی کیوں آتی، تاہم اب بھی اگر حضرت کی اس تنبیہ سے چونک پیدا ہوا اور کمر ہمت کس لی جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے

بہر حال اس مجلس دعوت الحق کا اصلی مقصد تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین کی علی ترویج کے ذریعہ مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنا اور کامیابی کا راستہ بتلانا ہے جو مسلمانوں کے لئے تعلق مع اللہ میں منحصر ہے اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی پوری پابندی کی جاتے تا بہ اسکان کوئی بات

خلاف شرع نہ ہونے پاوے یہی عبیدیت کی روح اور اسلام کی زندگی کا اصل اصول ہے۔

نظام العمل

اس مقصد کے بعد نظام العمل مختصراً یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ
 (۱) تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین کی تمام دفعات کی نہایت خلوص
 و استقلال کے ساتھ ہمیشہ پابندی کرتے رہیں اور ہر امر میں اصلی مطمح
 نظر رضائے حق ہو اور اس استقلال و ہمت کے ساتھ ہی دعا و اتہال
 کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں۔

(۲) جہاں تک ہو سکے قرآن شریف کا ترجمہ سننے کا اہتمام بھی کریں
 (۳) مسلمان کا فرض ہے کہ ہر موقع پر جذبات کو شریعت کے تابع رکھے
 (۴) اخلاق اسلامی کو اپنا شعار بنائے، وضع و معاشرت کو بالکل شریعت
 مقدمہ کے موافق رکھے، نہ انگریزوں کی تقلید کرے نہ ہندوؤں کی نہ کسی
 اور کی۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کا مسنون طریقہ متحا کہ ہاتھ میں لاٹھی رکھتے تھے اس
 واسطے سب مسلمانوں کو اس سنت پر کاربند رہنا چاہئے۔

(۶) خدمت خلق کا خیال رکھیں، محنت و جفاکشی کی عادت کے لئے
 ورزش بھی کیا کریں نیز لکڑی وغیرہ چلانا بھی سیکھیں اور سادہ و سپاہیانہ
 زندگی بسر کریں یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ کسی سے لڑیں بلکہ مطلب یہ ہے
 کہ اگر آپ طلبی میں نہ پڑیں، مخدوم نہ بنیں، خادم بننے کی کوشش کریں
 اگر کسی انسان خصوصاً مسلمان کی مدد کرنے کی ضرورت ہو تو مظلوم کی

امداد کو لازم جانیں۔

۴۔ ہر مسلمان روزمرہ نماز عشاء کے بعد سونے سے پیشتر اپنے گناہوں کو سوچ کر یاد کرے۔ اور پھر ان نعمتوں کو یاد کرے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر ہیں اور ان دونوں کو یاد کر کے اپنے کو ملامت کرے کہ جس مالک کی نعمتیں اس قدر ہیں اس کی ایک دن میں مجھ سے اس قدر نافرمانیاں ہوئیں۔ اس کے بعد دل سے ان سب گناہوں سے توبہ و استغفار کر کے سوئے۔ روزانہ بلانا غریہ عمل کرے: "اخیر میں بزرگوں کی ایک نافع نصیحت درج فرمائی ہے کہ

کارِ کم کارِ بگذر از گفتار کا ندریں راہ کار باید کار
لیکن اس کو کیا کیجئے کہ آج کل گفتار ہی کو سب سے بڑا "کار" مے لیا گیا ہے
تاہم مسلمان اپنے کو دوسروں پر قیاس نہ کریں ان کا کام آج کل کی بجائے اس سے ہرگز
نہ چلے گا ان کا کام تو کام ہی سے چلے گا اور وہ کام ہر کام میں حق و شریعت کا اتباع ہے
بعض جامع دعائیں بھی درج فرمائی ہیں جن کو بالخصوص نمازوں کے بعد پڑھتے
سننے کی ہدایت فرماتی ہے۔

اول: اَللّٰهُمَّ اَدِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَاذْرُقْنَا اِتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا

الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَاذْرُقْنَا اجْتِنَابَهُ

ثانی: اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ دِیْنِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاَخِذْ لَنَا مِنْ خَدَائِ

دِیْنِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا

مِنْهُمْ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

ترجمہ دعا نمبر ۱۱ اے اللہ ہم پر حق کا حق ہونا ظاہر فرما دیجئے اور اس پر طعن کی

توفیق بخشے، اور باطل کا باطل ہونا ظاہر فرمادیجئے
ترجمہ (عائبر ۲) اے اللہ آپ اس کی مدد فرمائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین
کی مدد کرے اور ہم کو ان مدد کرنے والوں میں بنادیں اور چھوڑ دیں اس کو جس نے چھوڑا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو اور ہم کو ان چھوڑنے والوں میں نہ بنائیں۔

آج کل کے نئے زمانہ کی انجمن بازی و مجلس سازی جس کی حقیقت تھوڑا کام
بہت نام۔ اس کا مذاق حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو بالکل نہ تھا تاہم کسی نئی چیز میں اگر کوئی
معتد بہ نفع معلوم ہوا اور کوئی شرعی قباحت نہ ہوئی تو محض نئے ہونے کے بناء پر ضد بھی نہ
تھی اس لئے غالباً بعض خادموں کے مشورہ سے آخر عمر میں خدمت تبلیغ کے لئے دعوۃ الحق
کے نام سے مذکورہ بالا مجلس بھی قائم فرمادی تھی۔ ورنہ نفس تبلیغ کی خدمت و اہمیت
تو ساری عمر اس درجہ پیش نظر رہی کہ نہ صرف سیکڑوں ہزاروں وعظ و سفر اسی خدمت کے لئے
فرمائے بلکہ کثرت سے مواعظ و ملفوظات میں تبلیغ کے اہم و اقدم فریضہ دینی کے لئے
مسلمانوں کو طرح طرح سے متنبہ و متوجہ فرماتے رہے، آداب تبلیغ، محاسن اسلام،
الدعوۃ الی اللہ، اصلاح و اصلاح وغیرہ بہت سے مطول و عطفوں کا تو مستقل موضوع
ہی فریضہ تبلیغ کی اہمیت و اقدیمیت اور اس کے آداب و احکام کی تفصیل ہے

دعوت و تبلیغ کی دو قسمیں

اصولی طور پر دعوت و تبلیغ کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں، عام (م) خاص
عام سے مراد وہ ہے جس میں کسی شخص یا اشخاص کو نہیں بلکہ عام مسلمانوں کو خطاب کیا
جاتے جو فرض کفایہ ہے اور جس کا امر و نہی لکھتے **مَنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ**
إِلَى الْخَيْرِ الْخَيْرِ اور **فَلَوْلَا لَقَدْ مِّنْ خَلٍّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ**

وغیرہ نصوص میں فرمایا گیا ہے اور تبلیغ خاص سے مراد وہ دعوت یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے جس کا خطاب کسی خاص شخص یا اشخاص خصوصاً اپنے تواضع یا ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جن پر کسی طرح کے امر و حکم کی قوت و اثر حاصل ہے یا جن سے حکم راجع و کلکہ مسئول عن رعیت کے تحت راعی و رعیت یعنی مکران و زیر نگرانی کا کوئی علاقہ ہے جیسے بی بی، بچے، نوکر چاکر، شاگرد و مرید وغیرہ جو کسی طرح ہمارے ماتحت ہوں اور جن کی صلاح و فلاح کی ہم پر کچھ ذمہ داری ہے اور جن کے حق میں اگر ترغیب سے کام نہ چلے تو تہمید بھی کام لے سکیں جس کو ایک دوسری مشہور حدیث میں "تغییر بالید" سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی جہاں کسی منکر یا برائی کے مٹانے میں ہم کو قوت و طاقت حاصل ہو وہاں بالید قوت سے مٹانا ہمارے ذمہ ہے، تبلیغ خاص راعی و رعیت کے تعلق و مسئولیت و مواخذہ کے اعتبار سے فرض میں ہے یعنی ہر شخص پر فرض ہے بلکہ حکم مدایع کی کلیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے کسی نہ کسی کاراعی یعنی مکران ہوتا ہے۔ شیخ مرید کا۔ استاد، شاگرد کا، اقا، غلام کا، افسر ماتحت کا، شوہر بیوی کا والد و لادکا۔ ولی زیر ولایت کا متولی وقف کے حقوق کا حتیٰ کہ ایک ادنیٰ چیرا سی بھی کچھ نہ کچھ اثر رکھتا ہے اور سینکڑوں معاملہ و مقدمہ والوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے۔

تبلیغ عام کا تو سب اعم و اعظم ذبیحہ جیسا کہ حضرت نے جابجا تفصیل فرمائی ہے و عظم ہے اندیہ کام علماء دین یا ایسے لوگوں کا ہے جو احکام دین سے کافی و وافی واقفیت رکھتے ہوں، یہ عام تبلیغ اب بھی کچھ نہ کچھ بری بھلی طرح مختلف مواقع کے وعظوں یا بہت سے علماء اب وعظ کے نام کو چونکہ اپنی حقارت تصور فرمانے لگے ہیں تو تقریروں کے نام سے بری بھلی طرح ہو جاتی ہیں۔ لیکن تبلیغ خاص اس اعتبار سے زیادہ عام ہے کہ ہر شخص کسی کسی کاراعی و مکران ہونے کی بناء پر کسی نہ کسی درجہ میں اس کا مامور ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ نافع و کارگر بھی ہے کہ اس میں ترغیب کے ساتھ تہمید کی قوت بھی

کچھ شریک ہوتی ہے ساتھ ہی اگر اس تبلیغ کا احساس و اہتمام عام ہو جاتے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کم از کم ہر شہر ہر اور باب اپنے بال بچوں کی اصلاح میں تو لگ ہی جائیگا اسی طرح جب ہر گھر کی اصلاح کا انتظام ہو گیا تو پھر بے گھرے رہ ہی سکتے جائیں گے اور وہ اپنے ماحول کی گرفت و اثر سے آسانی کے ساتھ کیسے نکل سکیں گے ؟

راقم ہذا کے نزدیک اگر مسلمانوں کو اس تبلیغ خاص یا اپنے اپنے توابع اندر دستوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف متوجہ کرنے کا خدا منظم طریقہ سے انتظام ہو تو یہ طریقہ قابل کا بھی زیادہ ہے اور پائدار بھی ، پس اس کی تنظیم ہو کہ ہر گاؤں یا قصبہ و شہر کے ہر محلہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر فرمودہ نظام کے ذریعہ ہر گھر کے راعی کی انفراداً یا اجتماعاً اصلاح پر زیادہ زور دیا جائے جس کے بعد پورے گھر کی اصلاح خود راعی کی ترقیبی و تربیتی تدابیر سے از خود بسہولت ہو جائے گی۔

لیکن کہاں تک افسوس کیا جاتے کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ غفلت و کوتاہی اسی تبلیغ خاص میں ہے بلکہ قطعاً اس کا فقدان ہے (والسادس کا معدوم) عوام تو عوام خواص تک کو اس تبلیغ خاص یا اپنی رعیانہ و ماکانہ مسئولیت و مواخذہ کا ذاتی ہر احساس نہیں معلوم ہوتا پر انے طرز کا وعظ کہنے والے اور نئے طرز کی تقریر کرنے والے علماء دونوں تمام دنیا کے مسلمانوں کی تنہا و تنہا کامرتبہ تو وعظ و تقریر میں نہایت در دو غم کے ساتھ سنا دیں گے لیکن خود اپنے اہل و عیال کے دین حتیٰ کہ نماز روزہ تک کی اتنی بھی فکر نہیں جتنی صاحبزائے بلکہ اب نہ صاحبزادی کے کسی اسکول یا کالج کے امتحان میں پاس ہونے کی ، نہ بی بی کی نماز کی اتنی باز پرس جتنی کھانے میں نمک کی نہ یاد دہانی کی ۔ حضرت علیہ الرحمۃ نے اس غفلت و بے حسی کا بکثرت خصوصاً مواعظ میں جا بجا ذکر فرمایا ہے مثلاً دعوت الی اللہ میں فرماتے ہیں کہ

مسلمانوں میں اولاً تو دعوت الی اللہ کا باب ہی گم ہو گیا ہے حتیٰ کہ جہاں

قدرت ہے وہاں بھی نہیں۔ اور جہاں قدرت نہیں وہاں کا تو پوچھنا ہی کیا
ہمارے بزرگ وہ تھے کہ جہاں قدرت نہ تھی وہاں بھی دعوت الی الخی سے
باز نہ سہتے اور ہم ہیں کہ قدرت کی جگہ بھی نہیں کرتے، بچوں کو، لوگوں کو،
باد و قدرت کے کبھی امر بالمعروف نہیں کرتے۔ مگر یہ برتاؤ صرف خدا کے علا
میں ہے اپنے معاملات میں ہرگز نہیں، گھر میں اگر یہ تو پوچھیں گے کہ کھانا
تیار ہوا یا نہیں مگر یہ کبھی نہ پوچھیں گے کہ بیوی نے نماز پڑھی ہے یا نہیں،
بہتر ہے کہیں گے کہ کہا تو تھا مگر وہ نہ پڑھے تو کیا کریں۔ بھائی کہنے کے
دو طریقے ہیں ایک مشورہ، ایک حکم ہے، ایک تو کہنا کہ نماز پڑھا کرو نماز نہ پڑھا
ہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو مشورہ ہوا کہ اس کی مخالفت سے بیوی کو
ناراضگی کا ڈھ نہیں اور ایک یہ کہنا کہ جیسے بیوی کھانے میں نمک تیز کر دے
تو ایک دن تو نرمی سے کہیں گے دوسرے دن سختی سے اور تیسرے دن جو
ذرا اکڑیں ڈنڈے سے کہیں گے تو یہ حکم ہے جس کی مخالفت سے بیوی
کو ڈر ہے کہ میاں سخت ناراض ہوں گے، ذرا اتنا ہی کہہ کر دیکھو کہ اگر
نماز نہ پڑھو گی تو ہم تمہارے ہاتھ کی روٹی نہ کھائیں گے اور ایسا ہی کر دو بھی
اور ڈر و مت کہ روٹی نہ کھائیں گے۔ بہت سے بہت ایک دن ایسا کرنا
پڑے گا۔ پھر تو وہ پابندی ہو جائے گی۔ اور ایک دور روز کھانے کا انتظام
کیا مشکل، شہر میں تو بازار موجود، دیہات میں کسی دوسرے کے گھر میں پکوا لیا
جاسکتا ہے اور اگر کہو کہ ساری ہی عورتیں بے نمازی ہوں تو کیا کریں۔ کس سے
پکوائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا بھر تمہاری محکوم نہیں متہیں صرف
اپنے گھر کے لئے کہا جا رہا ہے اور اگر بہت ہو تو سب کے ہی ساتھ
یہ معاملہ کرو، انشاء اللہ بہت کی برکت سے ساری کی ساری نمازی

بن جائیں گی لے

شوہر تو خیر اسلامی نظام حیات میں گھر کا حاکم ہی ہے، بیوی اگر اخلاص و ہمت سے آمادہ ہو جائے تو خود شوہر صاحب کی اصلاح ہو جاتی ہے۔
 حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کا جب نکاح ہوا تو ان کے شوہر کو بالائی آمدنی میں احتیاط نہ تھی صاحبزادی صاحبہ نے پہلے ہی دن صاف کہہ دیا تھا کہ تمہارے گھر اس وقت تک کھانا نہ کھاؤں گی جب تک بالائی آمدنی سے توبہ نہ کرو گے، آغزاں کو توبہ کرنا ہی پڑی۔

(وعظ مسمیٰ براسباب الغفلة)

احقر کی دو بہنوں کی سبق آموز ہمت و دینداری کا نتیجہ اس قسم کا خود اپنا مشاہدہ ہے کہ ایک کے شوہر نمانہ وزہ کے پابند تھے مگر ڈاڑھی منڈاتے تھے انہوں نے روٹھ کر مناکر کسی نہ کسی طرح آخر ڈاڑھی رکھوا چھوڑی۔

اسی طرح دوسرے بہنوں کی جماعت کے پابند نہیں تھے نہ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اہتمام تھا ان کو دوسری بہن نے نرمی گرمی سے کہتے کہتے آخر کار دونوں چیزوں کا ہی پابند کر لیا۔ اسی طرح اپنی اولاد سے صرف اتنا کہہ دیا کہ جو مسجد نہ جائے گا اس کے کھانے کے برتن الگ کر دوں گی، باقی نہ کرنے والوں کے یہاں نہ ہر راز ہیں۔

”یہ توبہ بیوی کو نماز کا حکم نہ کرنے کا ذکر تھا۔ اسی طرح اولاد کو نہ نماز پر کچھ کہتے ہیں نہ احکام پر، اگرچہ اسکول میں قیل ہو جائے تو اس کو بیحد ملامت

لے کیا اور کس طرح عرض کیا جاتے کہ دعوت عام کے اچھے اچھے اہل علم و اخلاص کو دیکھا کہ اہل و عیال فقیر تک کے منکرات میں مبتلا ہیں مگر تغیر بالید کا کیا ذکر باللسان و بالقلب کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ بلکہ بعض تو اسکو حکیمانہ تبلیغ کے اس زمانہ میں خصوصاً منافی جانتے ہیں۔

کرتے ہیں جس کے خیال سے بچے بھی خوب محنت کرتے ہیں اور ملامت
 بھی اس درجہ کہ بعض بچے اس کا تحمل نہ کر کے ندامت میں جان تک بیٹھتے
 ہیں۔ کانپوری کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکا فیل ہو گیا تھا ریل کی پٹری پر چالیشا
 اور کٹ گیا۔ اسی طرح اٹا وہ میں ایک نے افیون کھا کر جان دیدی لیکن
 اگر صاحبزادے نماز قضا کرتے چلے جائیں تو اباجان مائے محبت کے کبھی
 کچھ نہیں کہتے الغرض دعوت الی اللہ کا اہتمام ہی مطلوب ہے مکمل گیا ہے
 اس کے بعد دعوت کے مختلف درجات بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ جو جس درجہ کا اہل
 ہو ویسا ہی اہتمام کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص سب درجوں کا اہتمام کرے، یہ
 درجات وہی ہیں جن کا ابھی اوپر ذکر آچکا ہے لیکن خود حضرت کی زبان مبارک سے سن
 لینا چاہئے۔

دعوت عام و خاص

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ
 بِالْعَدْلِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ كَذَلِكَ هِيَ آيَاتُ الْحُكْمِ الَّتِي
 تَهْتَدُونَ ۚ اُنْدَا ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خیر کی طرف بلائے، بھلائی
 کا حکم کرے اور برائی سے روکے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ کام ایک خاص
 جماعت کا ہے ساری امت کا نہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ
 هَذِهِ سَبِيلِي اِذْ دَعَا إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ اَنْ اَدَّ مَنِ اتَّبَعَنِي
 وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ کہ یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں
 میں اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ میں بھی اور جتنے میرے متبع ہیں
 وہ بھی اور حق تعالیٰ تمام برائیوں سے پاک ہے اور میں مشرکین میں سے

ہیں ہوں۔ تو یہاں مطلقاً مَنِ اتَّبَعَنِي ہے یعنی جتنے میرے متبع
یا پیرو ہیں سب اللہ کی طرف بلا تے ہیں۔ اس میں عموم ہے لہذا اس
عموم و مخصوص سے معلوم ہوا کہ دعوت کے مختلف درجات و مراتب
ہیں ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک دوسری میں۔

دعوت حقیقی و حکمی

ایک دعوت عامہ ہے اور ایک دعوت خاصہ، پھر خاصہ کی دو قسمیں ہیں
حقیقی و حکمی۔ حکمی سے مراد وہ ہے جو حقیقی میں معین ہو تو اس طرح کل
تین قسمیں ہیں اور ہر شخص کے متعلق اس کے لحاظ سے ایک ایک قسم
ہوگی۔ چنانچہ دعوت خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ وہ ہے کہ
جس میں اپنے اہل و عیال کو، دوست احباب کو، خود اپنے نفس اور
جن جن پر قدرت ہو خطاب خاص کے ساتھ دعوت ہو۔ جیسا کہ حدیث میں
ہے۔ **كَلِمَةُ رَاْعٍ وَ كَلِمَةُ مَسْئُولٍ عَنْ رِعْيَتِهِ** یعنی تم میں
سے ہر ایک راعی (نگران) ہے اور ہر ایک سے باندہ پرس ہوگی کہ اپنے
رعیت کے ساتھ (جن کی نگرانی سپرد تھی) کیا کیا۔

قرآن میں بھی اس دعوت خاصہ کا ذکر ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا** طے یعنی اے ایمان
والو! اپنے کہ اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ لہذا یہ دعوت خاصہ
تو ہر شخص پر فرض ہے اور ہر شخص کو اپنے گھر اور تعلقات والوں کے
ساتھ حسب تعلق اہتمام کرنا چاہیے۔

عوالم کیا ذکر خواص اہل دین اور علماء سے سوال ہے کہ وہ دعوت

خاصہ کے فرض کو کہاں تک ادا فرماتے ہیں، احقر نے تو حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے علاوہ مشکل ہی سے کہیں دیکھا ہوگا کہ یہ خواص بھی اپنے محکومین وزیر مقرر انی لوگوں، اہل و عیال وغیرہ کو نرمی یا سختی سے جس طرح بھی بن پڑے، اتباع احکام پر آمادہ یا مجبور کرتے ہوں۔

اور ایک دعوت عام ہے۔

جس میں عام خطاب ہوتا ہے یہ کام صرف مقتداؤں کا ہے جیسا کہ دَلَّتْکُمْ مِثْلُکُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ سے معلوم ہو رہا ہے اور اس میں ایک راز ہے کہ دعوت عام یعنی وعظ کا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ مخاطب کے دل میں دعوت دینے والے کی وقعت ہو۔ بلکہ مطلق دعوت میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ مؤثر نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ بجز مقتدا کے اور کسی کا اثر عام لوگوں کے دل پر نہیں ہوتا اور باقی ایسے کتنے ہوتے ہیں جو قائل کو نہیں صرف قول کو دیکھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ حدیث میں امامت کبریٰ کے لئے الاثمة من قریش سے کی خصوصیت کی گئی کہ چونکہ قریشی خاندانی ہیں ان کی مانتحتی سے عار نہ ہوگی، دوسرے اس لئے بھی مقتدا اور عالم ہونے کی ضرورت ہے کہ خطاب عام کرتا یا وعظ کہتا ہو اور دیکھ کر لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ دین کے مقتدا و عالم ہیں جن سے شرعی و فقہی مسائل دریافت کریں گے اور یہاں مسائل کے نام صفر ہوگا اور اتنی ہمت نہ ہوگی کہ کہہ دیں کہ ہم کو معلوم نہیں اور ہر وقت ایسی ترکیب سمجھیں کہ نہیں آتی کہ ٹال دیا کریں تو لا محالہ اس حدیث کا مضمون ہوگا کہ فافتوا بغیر علم فضلوا

وَأَصْلُوا، یعنی بغیر علم کے جو جی میں آئے گا فتویٰ دیدیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔
 وہی تیسری قسم دعوتِ حکمی کی تو وہ یہ ہے کہ عام دعوتِ تبلیغ کرنے والوں کی اعانت کی جائے تاکہ وہ اپنی ضرورت و حاجت سے مستغنی و بے فکر ہو کر اس خدمت کو انجام دے سکیں

داعی کی دو قسمیں

اب باعتبار نوع دعوت، داعی کی اور دو قسمیں بھی ہیں ایک وہ جو تحقیقی جواب ہے دعوت کر سکتا ہے اور ایک وہ ہوالزامی جواب ہے تحقیقی جواب کے معنی ہیں کہ کسی نے جو کچھ پوچھا جواب میں اس کی اصل حقیقت واضح کر دی اور الزامی جواب کے یہ معنی ہیں کہ جو اعتراض کسی نے ہم پر کیا دیا ہی اس کے مذہب پر ہم نے کر دیا کہ جو جواب اب تم دو گے وہی ہمارا ہوگا پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کے کچھ لوازم و شرائط ہیں، تحقیقی جواب کے لئے تو اپنے مذہب پر پورا عبور ہونے کی ضرورت ہے دوسرے مذہب پر پوری نظر ہونے کی ضرورت نہیں اور الزامی جواب کے لئے اپنے مذہب کے ساتھ دوسرے کے مذہب پر بھی پوری نظر ہونے کی ضرورت ہے

خواہ یہ مذہب نقل ہو یا عقلی (یعنی سائنس و فلسفہ وغیرہ) کا کوئی نظریہ و مسلک ہوں غرض مخالفین میں دعوت و تبلیغ کا کام وہی کرے جس کی نظر ان کے مذہب اور خیالات پر ہو اور جو اپنے ہی مذہب پر نظر رکھتے ہوں وہ اپنے ہی مذہب والوں کو و عطف و تلقین کریں۔ تحقیقی جواب سے مسلمانوں کو زیادہ نفع ہوگا اور الزامی سے غیر مذہب والوں کو یا جو اس غیر مذہب کی طرف مائل ہوں۔ خلاصہ یہ کہ خطاب خاص (یا تبلیغ خاص)

سارے مسلمانوں کو اپنے گھر (یا اپنے تعلق والوں) میں کرنا چاہئے۔ اور خطاب عام میں ایک تو ایسے لوگ ہوں جو مسلمانوں کے لئے مناسب و عطف کہا کریں تاکہ ان کی اصلاح ہو اور ایک وہ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر کچھ شبہ ہو گیا ہو یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو جیسے انگریزی نواں مسلمان (یا سرے سے غیر مسلم ہوں) اور ایک آخری جماعت ایسی ہو جو ان عام تبلیغ کرنے والوں کی بشری ضرورتوں کا سامنا مہیا کرے تاکہ وہ اپنے فرض منصبی میں بے فکری سے مشغول ہو سکیں باقی جن کے پاس نہ علم ہے کہ عطف و تبلیغ کر سکیں دمال حسین سے واعظین و مبلغین کی مدد کر سکیں وہ بھی محروم نہیں وہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو خاص تبلیغ کے علاوہ عام تبلیغ میں دعا سے حصہ لیں۔ کہ لے اللہ اسلام کو عزت دے جسے اے اللہ اسلام کی نصرت کیجئے، اے اللہ مسلمانوں کے دین کی حفاظت کیجئے، اے اللہ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے اور دین کی برکتوں کو عام و تمام کر دیجئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سب اپنی اپنی خدمت میں لگیں گے تب کہیں ٹمرہ مرتب ہوگا۔ اور ٹمرہ نہ بھی مرتب ہو تو تم تو اپنے کام میں لگو جو تمہارا کام ہے باقی ٹمرہ دینا دینا اللہ کا کام ہے

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر ہمارا اسلام واقعی اسلام ہوتا، اخلاق و عادات معاشرت و معاملات ہر چیز اور ہر بات میں ہماری صورت و سیرت سے اسلام ظاہر ہوتا۔ تو ہم مجسم دعوت و تبلیغ ہوتے اور کفار ہماری صورت دیکھ کر مسلمان ہو کر تے، اس سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خود ان کی خلافت کے عہد کا واقعہ ہے نقل فرمایا ہے کہ:-

کسی یہودی کے ہاتھ میں اپنی مسروقہ (چرائی ہوئی) زرہ دیکھی، طلب فرمایا تو اس نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ میری ہے، قاضی شریح کے ہاں دعویٰ دائر فرمایا۔ قاضی صاحب کے نزدیک شہادت کافی نہ تھی،

انہوں نے دعویٰ خارج کر دیا، پھر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ اور نہایت ہمتاں لبثاں اشلاس سے باہر چلے آئے، یہودی نے جو یہ رنگ دیکھا تو بڑا اتر ہوا کہ اول تو یہ بادشاہ چاہتے تو زہریوں ہی چھین لینے اور جوتیاں الگ لگاتے مگر نہیں، ضابطہ کے موافق قاضی کے ہاں جاتے ہیں ہران کا محکوم ہے اور پھر وہ آپ کی شہادت سے رد کر کے مقدمہ خارج کر دیتا ہے اور یہ ذرا بھی چیں بہ جبیں تک نہیں ہو ضرور ایسا مذہب حق ہے اس طرح فوراً زہری کا اقرار کر کے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ ایسا مسلمان کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور جنگ مصفین میں شریک ہو کر شہادت حاصل کی

ایک یہی واقعہ کیا، اسلام کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے البتہ ہم مسلمان ایسے ہیں کہ ہم کو لوگ دیکھ کر اٹھے اسلام ہی کو دور سے سلام کہتے ہیں۔ ایک سفر میں راقم بذاتہ سے ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اسلام کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا اور سر کھول کر دکھلایا کہ دیکھتے چوٹی بھی ٹکادی ہے لیکن کیا کروں کہ اسلام مذہب تو اچھا ہے لیکن آج اس کے نمائندے اچھے نہیں ان میں شریک ہونے کا جی نہیں چاہتا۔

اشاعت و حفاظت دین کا اصل کارگر طریقہ

ایک زمانہ میں ارتداد کی کچھ ہوائیں ہو گئی تھیں اس زمانہ ۱۳۲۲ھ کے ایک وعظ میں اسی حقیقت کی زیادہ دل نشین پیرایہ میں تفہیم فرمائی ہے کہ اسلام کو اشاعت و حفاظت دونوں کا اصل و کارگر طریقہ خود اپنے اسلام کو ہر اعتبار سے مضبوط و محفوظ اور مکمل بنانا ہے فرماتے ہیں کہ

دین کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے ایک بیرونی حملوں کو روکنا، دوسرے خود اندرونی استحکام یعنی خود اپنی دینی حالت کو مکمل کرنا زیادہ ضروری ہے اگر کوئی بادشاہ ساری فوج برخواست کر دے لڑائی کے سائے ساندو سامان کو برباد کر دے سارا خزانہ لٹا دے اب اگر کوئی غنیمت حملہ کر دے اقد بادشاہ لڑائی کے لئے آمادہ بھی ہو جائے تو یکساں خطرہ ہیاب ہو سکتا ہے؛ پس وہی حالت ہوگی کہ عجب

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

حضرات! کہہ سکتا ہوں کہ اندرونی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے خود اپنے اندر اسلام کو راسخ کرنا شریعت کا اتباع کرنا یہی اندرونی حفاظت ہے کامل مسلمان بن جاؤ احکام شریعت کی پورے طور سے پابندی کرو خواہ مخواہ لڑومت، صاحبو! ہر شے کا ایک اثر ہوتا ہے اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا وہ داخلی سے ہو جاتا ہے، پہلے زمانہ میں ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر ان کے اعمال، ان کی معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں لوگ داخل ہو جاتے تھے زور زبردستی سے نہیں ہوتے تھے مگر اب ہمارے اعمال خراب اخلاق خراب، معاشرت گھڑی، معاملات خراب۔ اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو کیا دیکھ کر ہو۔ (لمخصاً ص ۱۱)

اس موقع پر ایک اور غلطی اور کید نفس پر تنبیہ فرمائی گئی ہے، آج کل تقریروں

تحریروں میں عام طور سے اسلام کے ضعف و زوال کا رونا ہے زوال اسلام کے نام سے کتابیں اور مضامین لکھے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر دشمنوں یا نادان دوستوں کی تعبیر ہے جس کو جہل کی وجہ سے ہمارے نام نہاد پڑھے لکھوں نے بھی اختیار کر لیا

حالات ۱۔

اسلام اپنی ذات میں کامل و مکمل ہے اس میں کبھی ضعف نہیں آسکتا
اسلام اسی وقت ضعیف ہو سکتا ہے جبکہ نعوذ باللہ خدا ضعیف
ہو جائے، اسلام خدا کا قانون ہے وہ کیسے ضعیف ہو سکتا ہے یہ محاورہ
بالکل غلط اور قابل اصلاح ہے کہ اسلام ضعیف ہو گیا۔ البتہ اگر یہ معنی
ہیں کہ وہ اسلام جو ہماری ایک صفت ہے وہ ضعیف ہو گیا ہے
یعنی ہم جس صفت کے ساتھ متصف ہیں اس اتصاف میں کمی ہے تو یہ
مسلم ہے مگر بھڑکی بات کیوں نہ کہہ کر آج کل ہم کمزور ہیں یوں کیوں
کہتے ہو کہ اسلام کمزور ہو گیا اس میں تو دھبہ آتا ہے خود اسلام پر
ہماری بعینہ وہی مثال ہے جیسے میرے ایک عزیز بیان کرتے ہیں کہ
ایک عورت اپنے بچے کو پاخانہ پھرا کر اور کپڑے سے پوشیدہ کر چاند دیکھنے
کھڑی ہو گئی چاند رات کا دن تھا وہ بھی ناک پر انگلی رکھ کر دیکھنے لگی
تو پاخانہ کی بو آئی کیونکہ جلدی میں پاخانہ انگلی میں لگ گیا تھا تو کیا کہتی
ہے کہ ادنیٰ ایسی چاند ٹرا ہو کیوں نکلا۔ حالانکہ سٹری وہ خود تھی اسی طرح
ہم چاند پر خاک ڈالنا چاہتے ہیں کہ اپنے ضعف کو اسلام پر لگانے میں اور
اس میں نفس کا ایک کید ہے کہ اگر ضعف کو اپنی طرف منسوب کریں تو اس
کا تذکرہ کرنا پڑے گا یعنی اپنے اسلام کو پختہ و کامل کرنا پڑے یعنی بہت
کچھ خود کو نا پڑے اور اب تو خدمت اسلام کے لئے ایسے لوگ کھڑے ہو جاتے
ہیں جن کے عقائد تک درست نہیں

مگر یہ اصل میں خدمت اسلام کے لئے کھڑے ہی کب ہوتے ہیں تو کھڑے
ہوتے ہیں تو نسل کی ممبری، کینڈٹ کی سٹری یا اور کسی گھٹیا بڑھیا لیڈری کیلئے

ایک ایسا ہی چاند سرٹے ہونے کا ماجرا اپنا یاد آگیا۔ ایک بڑے نامی گرامی پرانے وکیل جو راقم ہذا کے مقابلے میں بزرگی کا مرتبہ رکھتے ہیں، جب کبھی ملاقات و زیارت ہوتی ہے آج کل کے رواج کے موافق کچھ نہ کچھ اسلام، مسلمانوں اور قوم کی تباہی و تنزل کی مرثیہ خوانی ضرور فرماتے ہیں

ایک دفعہ احقر نے باادب عرض کیا کہ حضرت مسلمانوں میں جو قومی خرابیاں ہیں وہ کچھ آپ یا آپ کے گھر میں بھی ہیں، آخر پرانے تجربہ کار ذہین وکیل تھے جبرستہ فرمایا کہ بھائی اب اس بحث کا ہمیشہ کے جواب مل گیا۔

غرض تبلیغ بھی تبلیغ جب ہی ہوگی جب کہ ہم اور خصوصاً ہمارے مبلغین یا خدمت اسلام کے دوسرے مدعی خود سراپا اسلام ہوں لیکن اس تفریط کے ساتھ افراط کی دوسری غلطی میں دبڑ جاویں کہ جب خود ہی پورے مسلمان نہیں ہیں تو دوسروں کو اسلام کی کیماد دعوت دیں یہ ایسا ہی جیسے کوئی کہے کہ جب تم خود کسی بد پرہیزی کی بدولت بیمار ہو تو اول و عیال، متعلقین و احباب کو بھی اسی بد پرہیزی سے زد و کنا چاہتے یہ بڑی غلطی و غلط فہمی ہے دعوت و تبلیغ بجائے خود ایک مستقل فرض ہے ایک فرض میں کوتاہی سے دوسرا فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ کہ اگر روزہ نہیں رکھتے تو نماز کیوں پڑھیں اور کسی عجیب بات ہے کہ

بعض تو یہاں تک اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ اپنے وعظ کہنے کو شرعاً منع سمجھتے ہیں اور قرآن سے اس کی سند کھینچتے ہیں کہ لَمْ تَقُولُوا مَالًا تَفْعَلُونَ
كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ اَنْ تَقُولُوا مَالًا تَفْعَلُونَ ایک دوسری آیت میں ہے اَنَا مَوْءُونَ النَّاسِ بِالْبَرِّ وَتَنْسَوْنَ
اَنْفُسَكُمْ تو پہلی آیت کا تو وہ مطلب ہی نہیں جو بطاشر ترجمہ سے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہیں، مطلب یہ ہے کہ ایسا

قول و اقرار یا دعویٰ دعوہ کیوں کرتے ہو جو پورا نہیں کرتے جیسا کہ شان نزول سے بھی ظاہر ہے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو کوئی ایسا عمل معلوم ہو جس سے جو اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ و افضل ہو تو اس کے لئے ہم ایسی ایسی کوشش کریں پھر قال و جہاد کا حکم ہونے پر جان بچانے لگے اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ اور دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا لوگوں کو مہلائی کا حکم کرتے ہو اور خود اپنے کو بھولے ہو جس کے معنی یہ نہیں کہ اپنے کو مہلانے والے یا بدعل کو و غلط کہنے کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ و غلط کہنے والے کو خود اپنے کو مہلانے یا بدعلی کی ممانعت فرمائی گئی ہے جیسا ہم اسے خاص محاورہ میں بھی کہتے ہیں کہ دوسروں کو تو فلاں کام کیلئے کہتے ہو اور خود نہیں کرتے یعنی خود تو بدبرہ اولیٰ اور ضرور ہی ایسی صورت میں کرنا چاہئے جب کہ دوسروں سے کہتا ہو۔

بہر حال بلا عمل و غلط کہنے کی ممانعت نہیں بلکہ جو شخص و غلط کہتا ہو اس کو خصوصاً عمل کی بھی زیادہ کوشش کرنی چاہئے نہ یہ کہ و غلط بھی ترک کر دے البتہ ایسے شخص کا و غلط جو کہ بدعل ہو نور و برکت سے ضرور خالی ہوتا ہے لیکن بدعل و بدکار کی نماز میں بھی نورانیت نہیں رہتی تو کیا اس سے نماز کی فرضیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔

ہاں اگر کسی موقع پر تبلیغ یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ایسی اذیت کا اندیشہ ہو جو برداشت نہ ہو سکے تو معاف ہے گو اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ایسی اذیت کا اندیشہ کیا، واقعہ بھی پیش آجائے تو بھی باز نہیں آتے، ایک جامع مسجد میں بیچا پے ایک عطر فروش نے جماعت کے بعد کسی کو سنتیں پڑھتے ہوئے دیکھا کہ رسمی اٹھک بیٹھک کر رہے ہیں اور ہتھ کوئی بڑے عہدیدار، اس عزیز عطر فروش نے سلام کر کے عرض کیا

کہ حضور آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوتی پھر سے پڑھ لیں، بس آگ بگولا ہو گئے کہ نالائق بیہودہ تری یہ جرات و گستاخی؟ اس نے کہا کہ صاحب گستاخی نہیں خیر خواہی ہے یہاں تک بات بڑھی کہ وہ عہدہ دار اس غریب کو مانے لگے اس نے کہا کہ آپ اور مالیں مگر میں آپ کو مسجد تکلے نہ دوں گا جب تک کہ آپ نماز نہ دہرائیں لوگ جمع ہو گئے اور عہدیدار صاحب سے کہا کہ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے پھر سے کیوں نہیں پڑھ لیتے آخر پڑھنا ہی پڑی اور چھوٹسی تعدیل ارکان کے ساتھ پڑھ ہی کہ عمر پھر نہ پڑھ ہی ہوگی ۛ (الدعوت الی اللہ)

تبلیغ سے بے پروائی اور حیلہ جوئی
کا سبب دنیاوی اغراض
 بلاشبہ یہ اُن عطر فروش کی غیر معمولی ہمت و عزیمت کی بات تھی جو واجب و فرض بہر حال نہیں لیکن جو کچھ اتنی ہمت و عزیمت کے بغیر بھی باسانی ممکن ہے اس سے بھی اغراض دے بے پروائی کا سبب محض دنیاوی اغراض کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟
 حتیٰ کہ اگر اپنی آنکھوں سے بھی دیکھیں اور دیکھتے ہی سہتے ہیں کہ اگر کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی تو یہ بھی ہمت نہیں ہوتی کہ اتنا تو کہہ دیں کہ بھائی پھر سے پڑھ لو، نماز نہیں ہوتی (صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تَصَلِّ) و جب فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتی ہیں کہ اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو دوستی نہ ہے گی میل ملاپ نہ ہے گا آپس میں ہنسی خوشی نہ ہے گی۔

حیلوں کی حقیقت

اس سے بھی بڑھ کر غضب یہ کہ آج کل درویش یا بزرگ کے معنی سمجھتے ہیں جو نہ کسی کو کچھ کہے نہ سنے نہ روکے نہ ٹوکے بس سب کے ساتھ صلح کن ہو کر رہے اور اس کے لئے ایک شعر گڑھا ہے جس میں مدحاً قفا، دیکھ کر یا لگا کر اس کو خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کر دیا ہے

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

بامسماں افتد اللہ بابر جن رام رام

حالانکہ حافظ شیرازی شاید رام رام بھی جانتے ہی نہ ہوں گے، پھر دیوان حافظ میں تحریفوں کے باوجود مزایہ کہ دیوان میں اس شعر کا پتہ نہیں ہاں کسی دیوانے حافظ کا ہو گا۔ ہاں البتہ ایک اور شعر بھی ہے جس سے آج کل کے صوفی اپنے صلح کل مسلک پر استدلال کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے

مباش و پستہ آزار و ہر چہ خواہی کس

کہ در شریعت ما غیر از بی گناہے نیست

تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آزار کے قصد سے کسی کو آزار نہ دوا دہی درحقیقت آزار کے پستے ہونا ہے باقی جو شخص اصلاح کی غرض سے آزار دے جیسے طبیب و ڈاکٹر پر لٹین کرتا ہے یا باپ و استاد وادیباچے کو مارتا ہے اسی طرح اگر امر بالمعروف کرنے والے سے کسی کو آزار پہنچے

بھی تو یہ پستے آزار ہونا نہیں ہے۔ (آداب تبلیغ)

اور اگر درپے آزار ہونے کے معنی ایسے ہی عام ہیں تو پھر مرزا بیگل کی جو حکایت حضرت نے نقل فرمائی ہے وہ اس کا ایسا جواب ہے کہ جس دل

میں ذرہ بھر بھی ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو وہ لرز جاتا ہے۔

”مرزا کے اشعار میں تصوف کا رنگ ہوتا تھا کوئی ایرانی ان کو پڑھ کر اور مرزا کو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ ڈاڑھی منڈا ہے ہیں یہ دیکھ کر غصہ آگیا اور جھلا کر پوچھا ”آغا ریش می تراشی“ شاعر نے جواب دیا۔ ”بلے ریش می تراشم“ دل کے نبی خراشم“ وہ بپارہ مخلص تھا جواب دیا۔ ارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، می خراشی، ظالم! تو تو سب سے بڑے دل کو پھیل رہا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ ”دل کھسے نبی خراشم“ تم یہ ڈاڑھی پر استرا نہیں پھر اے ہو بلکہ حضور کے دل پر ٹھہری چلا ہے ہو، حضور کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میری امت کا فلاں شخص یہ حرکت کر رہا ہے تو کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات ہے آپ کا قلب تو سید اقلوب ہے جب تم سید اقلوب کو تکلیف دیتے ہو تو چھپرہ دعویٰ کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھانے آغا مرزا کے دل میں ایمان تھا یہ جواب سن کر آنکھ کھل گئی اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے ہوش آیا تو توبہ کی اور زبان حال یا قال کہا کہ :-

جزاک اللہ کہ چشم باز کر دی

مرا با جان جاں ہمسرا نہ کر دی

راقم احقر بھی اسی رنگ کی ایک بات کبھی کبھی بعض حضرات کی خدمت میں عرض کر دیتا ہے کہ بھائی آدمی شکل و صورت، وضع قطع فطرۃً اسی کی اختیار کرتا ہے جس کی اس کے دل میں محبت یا غطت ہوتی ہے تو بس ایسی حرکات کے وقت اتنا تو سوچ

لیا کرو کہ جو صورت تم بنا ہے ہو یہ کرزن کی ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور تمہارا یہ
چہرہ تمہارے دل کے اندر کس کی محبت و عظمت کی گواہی دے رہا ہے؟ محمد رسول اللہؐ
کی جن پر ایمان اور جن کی محبت کا دعویٰ ہے یا ان کے دشمنوں کی؟ اگر کفار یا فتناء
کی وضع قطع اختیار کرنے کی تائید میں فقہی قیل و قال یا تجدی دلائل کا بہانہ تلاش
کرنے کے بجائے احقر کا پیش کردہ مراقبہ، یہ بھی نہ سہی تو مرزا بیدل ہی کی حکایت کو
سامنے رکھا جائے تو کون مومن دل ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو دکھانا
گوارا کرے گا! اور جس کے اندر وہی ٹیس نہ اٹھے جو غریب ایرانی کے ٹوک دینے سے
بیدل کے اندر اٹھی تھی۔ ایک مومن کہ تو اس حکایت کے بعد بس اس پر غور کرنا چاہیے
کہ۔ ”جب ہم سے کوئی خلاف شرع بات سرزد ہوگی تو حضور کو اس سے آزار
ہوگا یا نہیں۔ اس لئے ترک احکام شریعہ کے لئے ایسی ایسی باتوں کو
آڑ بنانا مباحش دینے آزار ہر چہ خواہی کن“ بالکل واہیات ہے۔“
پھر سیدھا جواب یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں ایسی واہیات باتیں
یا اشعار سب بیچ ہیں بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خدا و رسولؐ کا یہ حکم ہے
اور نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور اس کے نہ کرنے پر
نکیر ہے، بس اس کو کرو۔“
البتہ شرائط و احکام کے ساتھ کرو اندھا دھند مت کرو فقہاء نے
اس کے قوانین و ضوابط مدون کر دیئے ہیں ان کو دیکھو، علماء سے پوچھو
وہ تم کو راستہ بتا دیں گے۔ باقی اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ
مت کرو۔“

امر بالمعروف کے بعض حدود و شرائط

بہت سی اصولی باتیں ان احکام و شرائط کی بھی حضرت نے اپنی کتابوں اور مواظمت میں بیان فرمادی ہیں، مثلاً خطاب عام یا وعظ صرف علماء کا کام ہے عوام پر صرف خطاب خاص، وہ بھی زیادہ تر اپنے اہل و عیال و اتباع کے حق میں واجب ہے یا کوئی بات جو ہم کو معلوم ہے اور دوسرا اس میں لاعلمی کی وجہ غلطی یا کوتاہی کر رہا ہے تو اس کو بتادینا واجب ہے اور اگر لاعلمی نہیں بلکہ سستی یا کج فہمی جہالت یا بدعت وغیرہ میں ابتلاء اس کا سبب ہے تو اگر تمہارا اتنا اثر ہو اور کسی وجہ سے قرآن سے گمان غالب ہو کہ تمہارا کہنا مان لے گا تو بھی واجب ہے ورنہ مستحب اور اگر قرآن سے گمان غالب ہو کہ ماننا تو کیا اٹھے فتنہ و فساد، لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جائے گا جس کا تم مقابلہ یا تحمل نہیں کر سکتے یا تمہاری کم علمی یا مغلوب الغضب ہونے کی بناء پر حدود سے نکل جانے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورتوں میں تبلیغ مستحب بھی نہیں بلکہ ممنوع ہے اس لئے کہ جس طرح ہر چیز کے حدود میں تبلیغ کے بھی حدود ہیں الا مرون بالمعروف والنہی عن المنکر کے بعد ساتھ ہی والحافظون لحدود اللہ لگائے گئے لہذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر تو سر سے پیر تک حدود و ضوابط سے مقید ہے جس کے جاننے کے لئے نصاب الاحساب کافی ہے۔ جاہل کو امر بالمعروف جائز نہیں کیونکہ وہ اصلاح سے زیادہ افساد کرتے گا۔

اس سلسلہ میں خود حضرت نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ مکہ میں مجھے ایک جاہل نے امر بالمعروف کیا کہ تم عمامہ کیوں نہیں باندھتے یہ سنت ہے میں نے کہا کہ تم لنگی کیوں نہیں باندھتے یہ بھی سنت ہے

سوچ کر کہنے لگے میں بوڑھا ہوں تنگی میرے جسم پر پھرتی نہیں میں نے کہا میں جوان ہوں عمار سے گرمی لگتی ہے اس پر بہت جھلائے، کہنے لگے کہ خدا کرے تمہارے دماغ میں اور گرمی بڑھ جائے۔

جھلا ایسے جاہلوں کو جو امر بالمعروف سے پہلے مخاطب کی حالت بھی نہ دریافت کریں اور ایک سنت زائدہ کے لئے اس سختی سے امر بالمعروف کریں کیونکہ امر بالمعروف جائز ہو سکتا ہے ” (الحدود والقیود ص ۳۵) اسی طرح داعین یا خطاب عام والوں کے لئے ضروری علم کے علاوہ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ کسی قسم کی طمع و حرص پر گزند رکھیں، کسی کی دعوت وغیرہ تک بلا سابق و خاص تعلق کے قبول نہ کریں۔ اگر پیر ہوں تو وعظ و تبلیغ کی جگہوں میں کسی کو مرید بھی نہ کریں نہ کسی سیاسی جھگڑے میں پڑیں نہ خاموشی زراعتوں میں۔ وَحِثْ عَلٰی هٰذَا

ایک آیت سے استنباطات

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ ذٰلِكَ آيَةٌ كَيْ تَعْلَمَ حَقُّهُ
تَبْلِيغِ دَعْوَتِ كَيْ تَعْلَمَ حَقُّهُ وَتَوَاقُفَ مُسْتَنْبَطِ فَمَا تَعْلَمُ مِنْهُ
رُكْنِ كَيْ قَابِلِ مَبْنِي اِرْشَادِ كَيْ كَرَمِ

اس آیت میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے جس کے تین طریقے اللہ تعالیٰ نے بتلائے ہیں ایک حکمت کا طریقہ، دوسرا موعظہ رحمتہ، تیسرا مجادلہ کا۔ اس کا جو مطلب میری سمجھ میں آیا ہے عرض کرتا ہوں جب کسی کو سبیل رب یا اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف دعوت دیجائے گی تو اس میں ایک

تو داعی کا خاص مطلوب دعویٰ ہوگا اور ایک دعویٰ اس کی نقیض یا منافی صورت ہوگی جو داعی کے مذہب مخالف کا دعویٰ ہوگا اس لئے گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک اپنے دعوے کا اثبات اور دوسرے مخالف کے دعوے کا ابطال۔ لہذا حکمت تو یہ ہے کہ اپنے دعوے پر علمی و عقلی دلائل قائم کئے جائیں اور جہاد یہ ہے کہ مخالف کے دعوے کو باطل کیا جائے۔ اصل مقصود تو یہی دونوں ہیں

باقی تیسری چیز ایک اور موقعہ حسنہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لئے موقعہ حسنہ کا بھی ایک طریقہ بتلادیا جس کی حقیقت یہ ہے کہ نامح دقسم کے ہوتے ہیں ایک تو محض ضابطہ کا پابند، جو محض ضابطہ کی خانہ پری کر کے بے فکر ہو جاتا ہے اور دوسرا جس کو سامعین پر خاص شفقت بھی ہوتی ہے مثلاً منادی کا کام ضابطہ کے ساتھ صرف حکم پہنچا دینا ہے اس سے اس کو بحث نہیں کہ تم مانو یا نہ مانو، اور مثلاً باپ وہ شخص سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا جہاں تک ہو سکے مان ہی لے اب ظاہر ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق ہے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی خیر خواہ، لہذا اولاً حضور اور پھر حضور کے واسطے سے امت کو فرمایا کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو، بلکہ ساتھ ساتھ موقعہ حسنہ سے کام لو!

جس کی حقیقت خود حکمت کے تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ جب حکمت سے علمی دلائل مراد ہیں تو موقعہ حسنہ سے ان کے سوا کچھ اور مراد ہوگی اور وہ ایسی مؤثر باتیں ہیں جن سے مخاطب میں نرمی اور قبول کا میلان پیدا

ہو، اس کا دل کچھل جائے اس کو قبول کی رغبت اور انکار سے خوف پیدا ہو، مثلاً دوزخ و جنت کی ترغیب و ترہیب کے مضامین کہ فلاں کام کرو گے تو ایسی ایسی جنت ملیگی جس میں فلاں فلاں آسائشیں ہوں گی یا نہ کرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے جس میں فلاں فلاں مصیبتیں ہوں گی گو یہ بھی احکام ہی ہیں مگر جب دوزخ و جنت کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو بلکہ صرف ترقیق قلب مقصود ہو تو وہاں ان کی حیثیت ترغیب و ترہیب کی ہے باپ اگر بیٹے کو کسی چیز سے روکتا ہے تو گو کہ اتنا کہہ دینا کہ فلاں چیز نہ کھانا حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے مگر باپ تو اتنا ہی نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے دست آور ہے پیٹ میں درد پیدا کر دے گی، اس کے کھانے سے دانے نکل آئیں گے اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لو گے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا۔ غرض جو حکم ایسے آدمی کم نکلیں گے جو محض مثال امر کے لئے کسی کام کو کہہ لیں۔ اس لئے ترغیب و ترہیب کی بھی ضرورت ہے۔ پھر آگے مجادلہ میں ”احسن“ کی قید بھی لگائی اس لئے کہ حکمت کی صورت یعنی اپنے دلائل بیان کرنے میں تو کسی کو ناگواری نہیں ہوتی البتہ دوسرے کا دعویٰ رد کرنے میں کبھی انقباض بھی ہوتا ہے تو یہاں قید لگا دی کہ رد اگر ہو تو بطریق احسن ہو جس سے مخالف کو رنج و کلفت نہ ہو۔ سبحان اللہ مخالف کی بھی اتنی رعایت کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہو جائے مگر اس کو بڑا بہلا نہ کہا جائے البتہ رد یا جواب گولی مول نہ ہو جیسا کہ بعضوں کا ہوتا ہے جس سے حقیقت بھی پوری طرح واضح نہیں ہوتی یہ جس مجادلہ کے خلاف ہے چنانچہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ

کا بھی مطلب ہے کہ کھول کر صاف بیان کرو، ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی
جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر
مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف
ہو مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

تبلیغ میں افراط کی غلطی کی اصلاح

ہماری سب سے بڑی کوتاہی تو یہی تھی کہ تبلیغ خاص ہو یا عام، علماء ہوں یا عوام
کسی کو کسی طرح اپنے فریضہ دعوت کی کوئی پرواہ ہی نہیں یا اگر پرواہ ہے تو بوجھ کی طرح
آٹا دیا اور نفع و ثمرہ کے لئے حکمت و موعظہ خستہ و مجادلہ حسد کی پوری تدبیر نہیں اختیار
کرتے (والشاذ کالمعدوم) لہذا زیادہ تر نفس اس فریضہ کی اہمیت اور ضرورت
اور اس کے نافع و مثمر آداب و شرائط ہی کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں اس
باب میں افراط کی غلطی بھی ہوتی ہے اس لئے کچھ اس پر بھی متنبہ فرمایا گیا ہے کہ۔
ایک باریک نکتہ آداب تبلیغ کا اور رہ گیا..... جَادِ لْهُدًى تَمُک
تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت سے ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کا حق
تبلیغ کے بعد بھی شفقت کی وجہ سے ثمرہ و نتیجہ کی فکر میں لگے رہو، یہ ایک
غافلہ ہے جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص، وہ یہ کہ
جب شفقت اعتدال سے زیادہ ہوتی ہے تو نتیجہ عاجلہ پر نظر ہوتی
ہے اور اس کو پہلے ہی سے سوچ لیتے ہیں کہ یہ آخر ہو گا حالانکہ اصل
نیچر منائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکور پر فوراً مرتب ہو جائے اور
ثمرہ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے تو اسی کی برکت سے مگر ہمارے اندر عجلت
زیادہ ہے چاہتے ہیں کہ بس جلدی اثر ظاہر ہو جائے گو اس میں نیت دین

ہی کی ہو،

پھر اگر ان ثمرات کا ترتیب نہیں ہوتا تو حزن و ملال ہوتا ہے بعض وقت
 یاس تک نوبت آجاتی ہے۔ اور مخاطب پر غیظ و غضب ہوتا ہے
 یا حاضرو غائب برا بھلا کہتے ہیں کہ جانا لائق تھے اس قدر سمجھایا اتنی کوشش
 کی مگر نہ سمجھا، ساری محنت ضائع کی اور اگر اس پر قدرت ہوتی ہے تو
 کبھی اس کو سزا دیتے ہیں وہ بھی اعتدال سے زیادہ اور بعض اوقات
 تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا بھاڑ میں پڑ، غرض یہ اثر ہے ظاہری اثر آپ
 نظر کا اسی طرح جب مبلغ کو محزون و غمگین دیکھا جاتا ہے تو بڑا کمال سمجھا
 جاتا ہے کہ مہر تن اسی طرف متوجہ ہے اور دوسروں بھی کہہ رہے ہیں کہ
 بھائی اس کے لئے دعا کرو کہ اصلاح ہو جائے مثلاً بیٹا نماز نہیں پڑھتا
 تو اس کو سمجھاتے ہیں کڑھتے ہیں دل سے دعا کرتے ہیں دوسروں سے
 تعویذ لکھاتے ہیں۔

گو یہ سب باتیں محمود اور اچھی ہیں مگر ان میں غلو بھی نہ چاہئے
 ورنہ یہ غیر معتدل شفقت کمال کے پچلے نقص بن جاتی ہے کیونکہ
 اس کا انجام یاس و تعطل ہوتا ہے اور بالآخر آدمی سرے سے تبلیغ سے
 ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لہذا اس ادب تبلیغ کا حاصل یہ ہوا کہ ثمرات کے
 مرتب نہ ہونے پر زیادہ محزون نہ ہو سوچ سوچ کر غم نہ کرے ہاں طبعی
 حزن کا مصائقہ نہیں اس میں ثواب ہے لیکن اتنا غلو نہ روتے روتے
 آنکھیں پھوڑے اور ہمت ہی ٹوٹ جائے برا ہے نصوص سے اتنے
 حزن و ملال کی اجازت نہیں جیسے کہ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا
 تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ اور لَعَلَّكَ بِاِنْحِ

فَنَسَلَكْ عَلَيْهِمُ ۖ وَغَيْرَ آيَاتٍ سَے معلوم ہوتا ہے
 اسی لئے وَجَّادٌ لَّهُمْ کے بعد ہی اس ضرر کا تدارک کیا عجیب
 فرماتے ہیں کہ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ
 وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں
 زیادہ نہ پڑو۔ یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے ماحصل
 یہ ہے کہ ان آیات میں تفریط و افراط دونوں سے تعرض کیا گیا ہے تفریط
 اُذْخُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ الْآيَةُ میں اور افراط کی مخالفت اِنَّ
 رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ
 بِالْمُهْتَدِيْنَ سے فرمائی گئی۔

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ آج دین کے معاملات میں اتنی غیر معمولی شفقت اور
 اتنا غلو و افراط کتنوں کو ہوتا ہے اور اصل کوتاہی و غفلت ہر طبقہ سے تبلیغ کے
 معاملہ میں تفریط ہی کی ہے تاہم حضرت مجدد وقت علیہ الرحمۃ کچھ تجدیدی نظر نے جس
 طرح ہر امر میں افراط و تفریط دونوں کی اصلاح فرمائی ہے اس میں کیسے مراعات مستقیم کو
 نظر انداز فرماتے لہذا دونوں باتوں کے جمع کا طریقہ یہ فرمایا کہ سعی و تدبیر تو ہدایت و
 اصلاح کی پوری ہو

مگر اس میں نیت فقط رضاءِ حق کی ہو یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہو ہی
 جائے ہاں دعا کرتے رہیں کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے، اس کے دل
 میں اپنا خوف پیدا کر دیجئے، دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کہ کام میں صرف
 رضاءِ حق کو مد نظر رکھے۔ (آداب التبلیغ ص ۳)

دینی طلبہ کو خصوصی تنبیہ

اسی سلسلہ میں عربی و دینی مدارس کے طلبہ کو جو مقتدا بننے والے ہیں خصوصاً

متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح دین کے تمام شعبوں میں ان کے لئے کمال و جامعیت کا اہتمام ضروری ہے اسی طرح تبلیغ میں بھی افراط و تفریط سے بچ کر تمام آداب کا لحاظ لازم ہے۔ آپ لوگ مقتدا بننے والے ہیں اس لئے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہئیں، حسین وہ ہے جس کے ناک کان، آنکھ سب ہی حسین ہوں سب چیزیں موزوں یا متناسب ہوں اگر سب چیزیں اچھی ہوں مگر آنکھوں سے اندھا یا ناک کٹی ہو تو وہ حسین نہیں اسی طرح دیندار وہ ہے کہ جو دین کے تمام شعبوں کا جامع ہو (یہ نہیں کہ جس کو ادراد و نواقل میں زیادہ مشغول دیکھا کہ یہ دیا کہ بڑا دیندار ہے خواہ معاملات و معاشرت کا کچھ ہی حال ہو۔ راقم متوفل) علیٰ ہذا عالم وہ ہے جو علوم کے تمام شعبوں کا عالم ہو ان شعبوں میں امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو ادراد پر تلبائے گئے ان سب کو بھی جمع کرنا چاہئے۔

اہل اصلاح کی دوسروں کی اصلاح سے بیفکری

اصلاح کے ساتھ اصلاح و تبلیغ یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی جس درجہ کا دینی فرض ہے اور جس طرح اس کی طرف سے غفلت و بے فکری عام ہے اس کی بناء پر وعظوں میں کثرت سے اور بار بار متوجہ و متنبہ فرمایا ہے۔ ”الاصلاح والاصلاح“ کے نام سے ایک اور وعظ میں ارشاد ہے کہ :-

”جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں ان کو بھی دوسروں کی اصلاح کی فکر نہیں حتیٰ کہ اپنے نوکروں چاکروں، متعلقین، بلکہ اپنے بچوں تک کو مثلاً نماز پر مجبور نہیں کرتے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا باب آج کل بالکل ہی مفقود ہے یا در کھو جیسے طاعت خود واجب ہے ایسے ہی دوسروں

کی طاعت کی سعی بھی واجب ہے مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے جہاں زبان کی استطاعت ہو زبان سے کہے جہاں ہاتھ پاؤں سے کہے کہے ہاتھ پاؤں سے کہے روپیہ پیسہ سے کہے اس سے کہے، خلاصہ یہ کہ محض اپنا عمل درست کر لینا کافی نہیں۔

گو فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح پر مقدم ہے مگر اس تقدیم کے معنی یہ نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسروں کی بھی واجب نہیں رہتی بلکہ یہ محض علی ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح ہو پھر دوسرے کی نہ یہ کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر بھی نہ کرے دراصل دونوں کام الگ الگ ہیں ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو ترک کرے گا تو ایک کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا

اسی لئے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُوْمِنُونَ بِاللّٰهِ کی آیت میں اصلاح غیر کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر فرمایا کہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بے فکر نہ ہو جائیں، البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں چنانچہ ایک درجہ یہ ہے قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا یعنی اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ جن کا حاصل اپنے متعلقین کی اصلاح ہے لیکن اس کا یہ حال ہے کہ اگر خود نماز پڑھ بھی لیتے ہیں مگر بی بی بچوں نوکروں وغیرہ اپنے متعلقین کو نہیں کہتے، بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے لیکن نماز نہ پڑھیں یا قصداً نہ دیں تو پرواہ بھی نہیں ہوتی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ وَ لَنْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ

إِلَى الْخَيْرِ وَيَا مُدُونٍ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
 کرتے ہیں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے کہ تمام کام چھوڑ کر صرف امر
 بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرے جس کا حاصل تبلیغ عام ہے اسی طرح
 وَتَوَّأَصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّأَصُوا بِالصَّبْرِ میں اہل دعیال کی
 تخصیص نہیں اگرچہ ہم ساری دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں پھر بھی جہاں
 تک ہو سکے کوشش تو کریں کیونکہ اس کی باز پرس ہوگی۔

اس کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں ایک تو یہ کہ سرے
 سے کوشش ہی نہ کرے ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے کہ اگر ناکامی ہو تو
 گھل گھل کر جان دیدے۔ دونوں درجے غیر محمود و ناپسندیدہ ہیں اور تیسرا
 محمود و مطلوب درجہ ہے کہ اپنی والی سعی و تدبیر میں کمی نہ کی جائے اور اس
 سعی و تدبیر کا مقصود رضائے حق و حصول اجر ہو باقی کامیابی و ناکامی کو
 خدا کے سپرد کر دیا جائے۔

اصول اور فروع سب میں تبلیغ فرض ہے

ایک اور عظیم و اوصی بالحق کے کچھ اقتباسات بھی مزید تنبیہ کے لئے درج ذیل ہیں
 تبلیغ ہمارے اوپر اصول و فروع تمام احکام میں فرض ہے اس زمانہ
 کی یہ بھی ایک نادانی ہے کہ فروع سے چشم پوشی بڑی دانائی جانی جاتی ہے
 مؤلف، جس طرح اَمُّوْا وِعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ میں ایمان و عمل صالح
 کا امر فرمایا ہے اسی طرح وَتَوَّأَصُوا بِالْحَقِّ میں تواصی بالحق کا اور
 اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ خَسِرٌ کے خسارہ سے بچنا ان دونوں ہی پر موقوف ہے
 اب اپنی غفلت کا حال دیکھئے کہ چوبیس گھنٹہ میں کتنا وقت اس فریضہ

کی ادائی میں صرف کرتے ہیں، جن پر زہ نہیں ان کو تو پہنے دوجن پر زہ ہے ان کے ساتھ بھی تو اسی بالحق کا معاملہ نہیں کیا جاتا.....
 زیادہ شکایت دینداروں سے ہے کہ وہ بھی گھر والوں کو تنبیہ نہیں فرماتے نہ اس کی خبر رکھتے ہیں کہ آج بیوی بچوں نے نماز پڑھی ہے یا نہیں پڑھی اور کوئی کام خلاف شرع تو نہیں کیا۔ بس یہ سمجھ لیا کہ اپنی اصلاح کر لیتا جاؤ تاکہ ہم خود جنت میں چلے جائیں حالانکہ اس کا بھی مواخذہ ہو گا کہ اپنے گھر والوں کو بھی دین کے راستہ پر کیوں نہیں چلایا صاف ارشاد ہے کہ:-
 قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا - وکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

اگر کبھی اپنی نماز قضا ہو جائے تو اس پر تو ندامت ہوتی ہے مگر ترک تو اسی و ترک تبلیغ پر ذرا ندامت نہیں ہوتی۔ انصاف سے کہنے کہ کبھی بیوی کو نصیحت نہ کرے یا کسی دوست کی خلاف شرع وضع پر نصیحت نہ کرنے پر ندامت بھی ہوتی؟

علماء اور عوام کے فريضہ تبلیغ میں فرق

اور یہ تبلیغ یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف علماء ہی کا کام نہیں ہے البتہ اس کی دو قسمیں ہیں !

ایک خطاب عام دوسرے خطاب خاص، دوسری تقسیم یہ ہے کہ ایک خطاب منصوصات و قطعیات میں ہوتا ہے اور ایک اجتہادیت میں پس خطاب عام بصورت و غلط اور اسی طرح امور اجتہادیہ میں خطاب یہ تو علماء ہی کا کام ہے مگر انفرادی طور پر ہر مسلمان دوسرے

مسلمان کو نصیحت کر سکتا ہے اسی طرح جو مسائل منصوص اور قطعی ہیں ان میں ہر شخص با د از بلند کہہ سکتا ہے کہ مثلاً ایمان لانا فرض ہے، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ فرض ہے۔

لیکن عالم و عامی سب ہی کو اس معاملہ میں اپنے اپنے فرائض سے اتنی بے پردائی ہے کہ اولاً ان کی طرف توجہ ہی نہیں اور کوئی توجہ دلائے تو طرح طرح کے عذر اور بہانے تلاش کرنے لگتے ہیں۔

”صاحب آپ کو چاہتے تھا کہ پہلے امر بالمعروف شروع کر دیتے پھر مثلاً کسی باوجاہت آدمی کو خلاف شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کسی کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹھتی اس وقت مولوی صاحب پوچھتے کہ صاحب کیا کروں یہ کیا کہ نہ حاکم کو امر بالمعروف نہ محکوم کو نہ مسلم کو نہ کافر کو نہ بیوی کو نہ اولاد کو پہلے ہی عذر دریافت کرنے لگے یہ ایسا ہی ہے جیسے روزہ شروع کرنے سے پہلے کوئی یہ تحقیق کرنے لگے کہ روزہ کن کن عذروں سے ساقط ہو جاتا ہے پھر مثلاً اپنے گھروالوں کو امر بالمعروف کرنے سے کونسا عذر مانع ہے بیوی یا لڑکے نے نماز نہیں پڑھی تو ان کو نصیحت کرنے یا سزا دینے میں کیا خوات ہیں کیا وہ مار ڈالیں گے یہ سب بہانے لغو ہیں“

”اصل بات وہی ہے کہ آپ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے بھلا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے نہ کھانے لگے تو کیا آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر نہ کھائیں گے ہاتھ سے نہ لے لیں گے اگر تہا قادر نہ ہوں گے دوسروں کو امداد کے واسطے بلا لیں گے پھر کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مضر ہیں ان سے روکنے کے لئے اس اہتمام سے کام نہیں لیا جاتا معلوم ہوا کہ آپ نے بن کے ضرر کو ضرر ہی نہیں سمجھتے اور یہ سخت

مرض ہے جس کا علاج بالصدق ہے مگر اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی
پناہ کسی کو اس علاج کی طرف توجہ نہیں۔ الا ماشاء اللہ
البتہ یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں جہاں تک ہو سکے نرمی و تالیف سے
کام لو اور انتہا میں صفائی سے مگر آج کل کی حالت یہ ہے کہ اگر مصالح کی
رعایت ہے تو عمر بھر مصالح ہی مصالح چلے جائیں گے اور اگر صفائی اختیار
کرتے ہیں تو شروع ہی سے لٹھ ساملا دیتے ہیں۔

بعض مواقع پر اہل اللہ کے بظاہر ترک امر بالمعروف کی وجہ

بلاشبہ بعض بڑے بڑے بزرگانِ دین اور اہل اللہ کے خاص خاص استثنائی صورتوں
میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امر بالمعروف
ترک کر دیا لیکن وہ دراصل ظاہر میں ترک اور باطن میں امر ہی ہوتا ہے جن میں ان کی
خاص فراست و برکت کو دخل ہوتا ہے ایسی بعض مثالیں احقر کے علم میں خود حضرت کے
ہاں بھی آئیں لیکن ان بزرگوں کا معاملہ الگ ہے۔

ان کے حال کو اپنے حال پر قیاس مت کر دیتا ہے لئے وہی طریقہ لازم
ہے کہ زبان سے نصیحت کرو اور اہل باطن کبھی قال سے نصیحت کرتے
ہیں کبھی حال سے اور کبھی بال یعنی دل سے کیونکہ ان کی توجہ قلبی میں بڑا
اثر ہے جو تمہاری زبان میں نہیں۔

گرچہ تفسیر زبان روشن گماست
لیکن عشق بے زبان روشن تراست

مگر یہ دقائق ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اس لئے عوام کے لئے اصل طریقہ وہی ہے جو عام
ہے کہ زبان سے نصیحت کرو۔

”اہل اللہ کو اللہ کی طرح مخلوق کے ساتھ شفقت بہت ہوتی ہے وہ بالعموم ایسے طرز سے نصیحت کرتے ہیں کہ مخاطب کو نفع ہی ہوتا ہے اگر اس میں کچھ ارادہ و طلب ہے ورنہ اگر وہ خود نہ چاہے تو ایسے شخص کا علاج تو انبیاء علیہم السلام بھی نہیں کر سکتے۔“

لیکن ایسے اہل اللہ کتنے ہیں؟

در آج کل تو عموماً ہر قسم کی تبلیغ اس لئے متروک ہے کہ مخاطب کو اس ناگواری ہوتی ہے اور خلائق کی ناگواری کو اپنے ذمہ کون لے۔ یاد رکھو کہ محض ناگواری مخاطب کوئی عذر نہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَفْتَضِبْ عَنْكَ الذِّكْرَ صَفْحًا اِنَّ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ہ امر بالمعروف کے ترک کا عذر صرف یہ ہے کہ ضرر کا اندیشہ ہو اور ضرر بھی جسمانی محض کسی منفعت کے فوت ہونے کا ضرر نہیں اب غور کیجئے کہ ایسے ضرر کے مواقع کتنے ہوتے ہیں زیادہ تو محض مخاطب کی ناگواری کا خیال مافیع ہوتا ہے تو اس کی ناگواری کی پردہ کیوں کی جلتے آپ کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

ہزار خولیش کہ بیگانہ از خدا باشد

خدا سے یک تن بے گانہ کا شننا باشد

جو شخص خدا سے بیگانہ ہے اگر اس کو احکام الہی کی تبلیغ ناگوار ہے تو ہماری جوتی سے۔ بس ہم کو خدا پر نظر رکھنا اور صرف اس کی رضا کا طالب ہونا چاہئے خواہ تمام دنیا ناراض ہو جائے۔“

ایک سبق آموز مثال

اس کی حضرت نے ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ سے

ایک عجیب مثال دی ہے کہ

میں آپ کو ایک عبرتناک کثیرالوقوع واقعہ سناتا ہوں ایک چودہ سال کی لڑکی جس نے ماں باپ کی گود میں پرورش پائی ان کے گھر کو اپنا گھر اُن کے دوست کو اپنا دوست ان کے دشمن کو اپنا دشمن جانا اس کی حالت نکاح کے دو لفظوں سے یہ ہو جاتی ہے کہ جہاں اس کے منہ پر سے ہاتھ اترتا اب شوہر کا گھر اس کا گھر ہے اس کا دوست اس کا دوست، اس کا دشمن اس کا دشمن گو شوہر کا دوست باپ کا دشمن اور شوہر کا دشمن باپ کا دوست ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اگر کسی وقت باپ بھی شوہر کا دشمن ہو جائے تو عموماً عورتیں شوہر کا ساتھ دیتی ہیں۔

افسوس اس لڑکی نے تو عقد کے ایجاب و قبول میں ایسی مردانگی دکھائی اور ہم باوجود مرد ہونے کے اور لا الہ الا اللہ محمد رَسُوْلُ اللہ کا عہد باندھنے کے خدا کے دوست کو اپنا دوست اور خدا کے دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے، آپ کا تو یہ حال ہونا چاہئے کہ سہ دل آراے کہ داری دل در دہندہ

دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

بس تمام عالم سے کہہ دو کہ ہم نے ایک ذات سے علاقہ جوڑ لیا جو اس ملے ہمارا دوست جو اس سے الگ ہو وہ ہم سے الگ۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو دعوت دی جب وہ راہ پر نہ آئے تو صاف فرما دیا سَلَامٌ عَلَیْكَ سَا مُتَعَفِّضُ لَكَ رَیِّیْ اِنَّہٗ حَانَ بَنِی حَفِیَّتَہٗ کہ بس میرا سلام لو، اب تم سے کچھ واسطہ نہیں اپنے خدا سے دعا کروں گا۔ صاحبو ابراہیم علیہ السلام کا طرز اختیار کرو

یہی اسلام کا مقتضی ہے۔

جیسا کہ دوسری جگہ حکم ہے کہ تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور تمہارے ان معبودوں سے بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو ہم تم سے الگ ہیں اور تمہارے اور تمہارے درمیان بغض و عداوت ہمیشہ کے لئے قائم ہو چکے جیت تک کہ تم اللہ وحدہ پرایمان نہ لاؤ،

لقد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه
اذ قالوا للقوم هذا انا براءؤامنكم ومما تعبدون من
دون الله كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة
والبغضاء ابدًا حتى تؤمنوا بالله وحده۔

پس نہ ہم کو مخاطب کی کسی ناگواری کی پرواہ کرنی چاہئے اور نہ اس ناگواری کی وجہ سے تبلیغ میں کوتاہی کی جائے۔

بعض دقیق باتیں

اسی تو اسی بالحق و تو اسی بالصبر کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا کہ۔

یہ ناگواری محال ہے کہ کو تبلیغ عقائد میں زیادہ ہوتی ہے مگر جب وہ ایک مرتبہ اپنے عقائد سابقہ کی غلطی سمجھ کر عقائد حقہ کو قبول کر لیتا ہے تو اس کے لئے بار بار تبلیغ کی ضرورت نہیں رہتی بخلاف اعمال کے کہ ان کی تبلیغ ابتدا میں تو دشوار نہیں نہ مخاطب کو اس میں زیادہ ناگواری ہوتی ہے مگر اس میں بار بار تبلیغ کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ انسان اپنے اعمال نامہ کو ایک بار چھوڑ کر بھی لذت نفسانی کی وجہ سے پھر اختیار کر لیتا ہے تو اس

میں ابتدائی تبلیغ کافی نہیں ہوتی بلکہ بقلائے تبلیغ کی بھی حاجت رہتی ہے
خلاصہ یہ کہ تبلیغ عقائد کی ابتدا دشوار مگر بقا سہل اور تبلیغ اعمال میں ابتدا
آسان مگر بقاء دشوار۔ اس لئے وقوا صوابا بالصبر میں ایسا عنوان
اختیار فرمایا گیا جس میں مبلغ کو بھی صبر و استقلال کی تعلیم ہے واللہ اعلم
باسرار کلامہ

ایک اور دقیق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح
اور تواریح بالحق کے ساتھ تواریح بالصبر کیوں بڑھایا، وجہ یہی ہے کہ اعمال
صالحہ جو ہر ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن
ہیں جو شخص خود گناہ کرتا یا کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت
نہیں کرتا رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی پھر زائل
ہو جاتی ہے اور گناہ کو ہلکی معمولی بات سمجھنے لگتا ہے اور یہی کفر ہے
ایک اور بڑی غلطی یہ ہے کہ علماء کا اصل کام تبلیغ تھا نہ کہ چندہ جمع کرنا خواہ وہ تبلیغ ہی
کے لئے ہو۔ اس میں بڑے مفاسد ہیں جن کا بیان اوپر ہو چکا۔

یہ کام دنیا والوں کا ہے اور اس کا انتظام سب مسلمانوں کے ذمہ ہے
ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کام بھی کریں اور بھیک بھی مانگیں، شرم نہیں
آتی کہ جن علماء کو مقتدا سمجھے ہو انہیں سے بھیک بھی منگوانا چاہتے
ہو میں نے اپنے مبلغین سے کہہ دیا ہے کہ جب تمہارے پاس اتنی رقم
رہ جائے کہ جس سے اپنے گھر پہنچ سکو اس وقت مجھ کو اطلاع کر دیا کرو
اگر اور رقم ہوگی تو بھیج دوں گا ورنہ بلا لوں گا۔ کیونکہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ
رقم نہ ہے تو لوگوں سے مانگتے پھر یہ ہم سے جتنا ہو سکتا ہے اس کے
لئے ہم حاضر ہیں اور جس کام میں روپے کی ضرورت ہے اگر بدوں مانگے

مسلمان ہمارے پابندی بھیج دیں گے تو اس سے کام چلاتے رہیں گے اور نہ بھیجیں گے تو خدا تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ :-

اس کام کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی مسلمانوں نے مالی اعانت پر توجہ نہ کی اور ہم نے بھیک مانگنے میں دین کی ذلت سمجھی اس لئے یہ کام نہ ہو سکا۔ اس کے بعد عام مسلمانوں سے مواخذہ ہو گا کہ تم نے تبلیغ میں مالی اعانت کیوں نہیں کی اور اگر تم کو کسی پر اعتماد نہ تھا تو تم نے رقم کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے ضلع کے لئے مبلغ کا انتظام کیوں نہیں کیا۔

میں نے کام کی جتنی صورتیں تھیں سب آپ کو بتلا دیں اب جو چاہو اختیار کر لو اس کے بعد آپ کو کسی عذر کا موقع نہیں

تبلیغ اعمال بھی ضروری ہے

اوپر تو اوصی بالحق کے حصہ میں تو زیادہ تر تبلیغ عقائد کا ذکر تھا دوسرے حصہ تو اوصی بالنہر میں تبلیغ اعمال کی طرف بالخصوص توجہ دلائی گئی ہے کہ فساد عقائد کی طرح آپ فساد اعمال کو کیوں متکرم نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپ کا دل کیونکر ملتا ہے جو فروع ایمان میں ناقص رہے اس سے بلا تکلف دوستی کس طرح کی جاتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی تم میں امر منکر دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹائے یا زبان سے یاد دل سے، پھر یہ کیا غضب ہے کہ ہم لوگ منکر کو دیکھ کر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں نہ زبان سے، نہ دل سے نفرت کی جاتی ہے بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ وہی ایشاشت ہے وہی دوستی ہے جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہو۔ گویا آپ خدا تعالیٰ کی طرف سے وکیل و مختار ہیں

کہ جس چیز کو چاہیں معاف کر دیں اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کر لیں۔
 وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً
 کی یہی تفسیر آئی ہے کہ ایک شخص کسی بستی میں گناہ کرتا رہتا ہے لوگ اس
 کو دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس سے کنارہ کشی نہیں کرتے نہ
 اس پر کچھ تشدد کرتے ہیں تو اس شخص کی وجہ سے سینکڑوں بے گناہ عذاب
 میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جبریل علیہ
 السلام کو کسی بستی کے الٹ دینے کا حکم دیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض
 کیا کہ خداوند! اس بستی میں ایک شخص ایسا ہے کہ جس نے عمر بھر میں کبھی
 آپ کی نافرمانی نہیں کی کیا اس سمیت الٹ دوں فرمایا کہ ہاں اس سمیت
 الٹ دو کیونکہ اس نے بظاہر کوئی گناہ نہیں کیا مگر گھٹکاروں کو دیکھ کہ
 اس کے چہرہ پر بل نہیں پڑا۔ وہ ہمارے دشمنوں سے ویسی ہی دوستی و محبت کے
 ساتھ ملتا رہا جیسا دوستوں سے تو یہ کیسی محبت ہے کہ ہمارے دشمنوں پر غصہ
 بھی نہ آتے اس لئے وہ بھی انہیں کی مثل ہے۔

جن کو سب سے زیادہ ہم پر تبلیغ کرنا واجب ہے

سب سے زیادہ اور بار بار جن لوگوں کو تبلیغ پر حضرت نے متوجہ اور متنبہ فرمایا ہے
 وہ وہ ہیں جن پر ہم کو کسی نہ کسی قسم کی قدرت حاصل ہے مثلاً بی بی بچے، تو کو چاکر
 مرید، شاگرد وغیرہ۔ پھر ان کی بھی دو قسمیں فرمائی ہیں

ایک وہ جنہوں نے اطاعت کا ہم سے صریح معاہدہ نہیں کیا جیسے بی بی
 بچے کہ گوشہ خان پر ہماری اطاعت واجب ہے مگر انہوں نے صراحتاً اس کا
 کوئی التزام و معاہدہ نہیں کیا کہ تم ہم کو تعلیم و تبلیغ کرو ہم تمہاری تعلیم پر

عمل کریں گے ؟

مگر ایک تعلق ایسا ہے کہ جس میں دوسرا شخص ہماری اطاعت کے مرتج التزام کا عہد کرتا ہے یعنی یہ پیری و مریدی کا تعلق کیونکہ پیری و مریدی نام ہی ہے مرید کی جانب سے معاہدہ اطاعت کا اور پیر یا شیخ کی جانب سے معاہدہ تعلیم و اصلاح کا۔ صرف ہاتھ میں ہاتھ لئے کر سبق سا پڑھ دینے کا نام پیری و مریدی نہیں ہے جیسا کہ آج کل عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے بس ایک مرتبہ یہ سبق پڑھ لیا اور مرید ہو گئے اب نہ پیر کے نزدیک تعلیم ضروری نہ مرید کے نزدیک اتباع مجھے اس میں کلام ہے کہ اس طرح کسی طالبِ بیعت کو چپکے سے بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں ؟ کیونکہ اس صورت میں مرید کی اس غلطی کی گویا توثیق ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے ؟

اصل یہ ہے کہ مریدوں سے زیادہ اس بارہ میں خطایا غفلت پیروں ہی کی ہے نہ مرید کرنے سے پہلے بیعت کی حقیقت واضح کرتے ہیں اور نہ مرید کرنے کے بعد اصلاح و تربیت کو ضروری جانتے ہیں حالانکہ یہ مرتج حیانت و معصیت ہے جس میں ترک تبلیغ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ حقیقت بیعت کی رو سے جس طرح مرید کی طرف سے اطاعت کا وعدہ ہوتا ہے اسی طرح شیخ کی طرف سے اصلاح کا حیرت ہے کہ مقتضی موجود اور موانع سب مرتفع، پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں کچھ ردک ٹوک نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوخ یا تو پیری و مریدی کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر پہلو ہتی کرتے ہیں۔

ایک عجیب رائے

کیا عرض کیا جاتے کہ بعض لوگوں کی رائے تو یہاں تک سنی کہ روک ٹوک، مواخذہ و احتساب ترہیب و تحریف کا زمانہ ہی اب سرے سے نہیں رہا۔ صرف ترغیب اور تالیف قلب ہی سے کام لینا چاہئے حتیٰ کہ اپنے توابع بلکہ اپنی اولاد بھی مثلاً تارک نماز ہو تو بس ترغیب یا خوشامد سے اُنکے قدم نہ اٹھانا چاہئے گویا قرآن و حدیث کا ترہیبی و تادیبی حصہ سب منسوخ ہو گیا ہے نہ قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيكُمْ نَادَا کے امر و وجوب نہ راعی درعیت کی مسئولیت نہ تغیر بالید و غیرہ کا اس سے زیادہ کوئی مطلب رہ گیا کہ اہل و عیال تک کفر و معصیت فسق و فجور جس منکر کا بھی ارتکاب کرتے رہیں اور خواہ ترغیب و تنہیم، نرمی یا خوشامد کی ساری تدبیریں بیکار ثابت ہو چکی ہوں مگر کسی حال میں ان سے نہ کسی قسم کی نفرت و بیزاری ظاہر کی جائے نہ ان کے ساتھ تعلقات اور بشاشت و شگفتگی میں کوئی فرق آئے نہ ان کو کوئی تحریف و تنبیہ ہو۔

صاحبو! اس بلا میں ہم لوگ بہت گرفتار ہیں کہ ہمارے ملنے والوں میں بعضے مبتلائے معاصی ہیں اور ہم ان سے نہیں نفیس کر باقی کرتے اور ملتے ملا تے ہیں ہاں ایک صورت میں اس کی اجازت ہے کہ کسی پر تشدد یا قطع تعلق کرنے میں مفسدہ یا اس کی طرف سے اضرا کا اندیشہ ہو اور اپنے اندر تحمل کی طاقت نہ ہو اس میں سکوت کی اجازت ہے باقی جس کی بہت ہو اس کو سکوت کی اجازت نہیں بلکہ اس کے لئے دہی حکم ہے یا بنی اقم الصلوٰۃ و امر بالمعروف و انہ عَنِ الْمُنْكَرِ و اصبر علی ما اصابک ان ذلک

من عزم الاموی اس کو چاہئے کہ صاف صاف امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کرے اور جو خطرہ پیش آئے اس کا تحمل کرے والبتہ
یہ شرط ہے کہ نفس و نفسانیت کی آمیزش اس میں نہ ہو
(وعظ اصلاح ذات البین ص ۲۵)

اصل میں یہ ایسے حضرات کی رائے ہے جنہوں نے نہ صرف اس امر سے قطع نظر
فرمایا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز اصول و فروع سب میں افراط و تفریط سے بچا کر
صراطِ مستقیم کی تعلیم ہے بلکہ انہوں نے اس عام فطرتِ بشری سے بھی غفلت فرمایا ہے
کہ انسان جس طرح محض بات بات میں ٹھٹھا مٹھانے سے راہِ راست پر نہیں آتا اسی طرح
فری، دلجوئی یا خوشامد سے بھی درست نہیں ہوتا بلکہ وہ تو تحریف و تہریب کا جتنا اثر
قبول کرتا ہے رجا و رغبت کا نہیں کرتا اور کیا عجب ہے کہ اگر استقصاء کیا جائے تو
قرآن مجید میں ترمیمی مضامین کا پلہ تر غیبی سے جھلکتا ہی ثابت ہو۔ ورنہ ثواب و عذاب
جنت و جہنم دونوں کا غیر منطک سا تھ تو سارے کلامِ مجید میں ملے گا اور ایمان اپنے
صحیح مقام پر تو خوف و رجاء کے کانٹے ہی پر رہ سکتا ہے۔

اسلام کی حدود اور اعتدال پسندی کی اس خاص شان کا اہتمام ہر چھوٹی بڑی
چیز کی طرح طالبین اور مریدین کی اصلاح و تربیت میں بھی اس زمانہ میں حضرت مجدد
وقت ہی کے ہاں دیکھا کہ ہر مجلس و حفظ و تادیب دونوں کے رنگ میں سموئی ہوتی،
بعض مثالیں ایسی بھی دیکھیں کہ تعلیم و تربیت کی ابتداء سے لے کر انتہا تک، بیعت سے
لے کر اجازت کے سالہا سال کی مدت تک زبان و قلم پر ایک کلمہ بھی تغیر طبع کا نہیں
آیا اور قرأتِ ایمانی نے اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں جانی لیکن یہ استثنائی
فطرتوں کے ساتھ استثنائی صورت ہی ہو سکتی تھی۔ باقی عام طرزِ عام فطرتِ شامی
کے مناسب تر غیب و تربیت دونوں کا تھا اور تہریب و تادیب کے معاملہ میں یہاں

ہوتا کہ ہمارا لوگوں کو مجلس اٹھا دیتے، مکاتبت و مخاطبت کی ممانعت فرمادیتے،
 اکیس آدھ بار ضرب بھی علاج فرمایا کہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ میں تو اب عیسائی ہو جاؤں گا
 تو ایک دھول رسید فرمایا اس سے اللہ تعالیٰ نے فوراً ہی دماغ سے شیطان کو نکال دیا
 غرض تمام صفات و ملکات متقابلہ کی طرح ترغیب و ترہیب، انس و بہیت
 لطف و عتاب بھی حضرت جامع المجددین کی ذات میں نہایت اعتدال اور حسن سے
 استعمال کے ساتھ جمع تھے سہ

یارِ مآل دارد و ایں نیز ہم

انقلاب عام و تمام

آپ نے دیکھا کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے دین کے سارے احکام کی طرح ان احکام کی تعلیم و تبلیغ کی بھی کیسی جامع و حاوی عام و تمام از سر نو تجدید فرمادی ہے۔

عام تو اس معنی میں کہ اس کے قبول و عمل کے بعد نہ کوئی طبقہ انشاء اللہ محروم رہ سکتا ہے اور نہ کوئی فرد۔

اور تمام اس معنی میں کہ دین کی اس تجدید یافتہ تعلیم و تبلیغ کا نظام احکام دین کے تمام الجواب، دیانات و معاملات، اخلاق و معاشرت سب کو شامل ہے اور اس لئے کہ اگر اس کے اجراء و اقامت کا حق ادا کیا جائے تو دس سال میں ساری امت کے اللہ عام و تمام دینی انقلاب برپا ہو جاسکتا ہے و ما ذلک علی اللہ بعزیز

قرآن مجید صرف کتاب ہدایت ہی نہیں نظام ہدایت بھی ہے

بات یہ ہے کہ جامع و کامل دین کی ذلک الکتاب محض کتاب ہدایت ہی نہیں بلکہ نظام ہدایت بھی ہے یعنی راہ یابی و راہنمائی کے اصول و ضوابط کے اعتبار سے بھی جامع و کامل ہے اور وقت کے مجدد نے انہیں اصول و ضوابط کے تحت دینی تبلیغ و تعلیم کی جامع تجدید و اصلاح فرمائی ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے اُن حضرات کو خصوصاً جو خدمت تعلیم و تبلیغ کی کوئی صلاحیت و ہمت رکھتے ہیں

خود حضرت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا اور ان کو بار بار مسلسل مطالعہ میں رکھنا ان اصول کے فہم و عمل میں رسوخ پیدا کرنے کا اور ایک بڑی حد تک ان کی نوعیت و اہمیت اور جامعیت کا اندازہ اور ارقِ بالا سے بھی ہو گیا ہوگا بلکہ انفرادی حد تک بقدر ضرورت فہم و عمل کے لئے انشاء اللہ یہی اوراق کافی و شافی ہوں گے۔

لیکن ثمراتِ خالی باغبانی کے قواعد و ضوابط پر کسی بہتر سے بہتر کتاب پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ تو ان قواعد کے موافق عمل اور باغ لگانے ہی سے حاصل ہوں گے اس عمل میں مزید سہولت کی خاطر حضرت ہی کی مفصلہً بالا تعلیمی و تبلیغی اصلاحات و تجدیدات کے پیش نظر انفرادی و اجتماعی صلاح و اصلاح کا ایک عملی خاکہ بھی پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دینی تعلیم کا مدعا

جب یہ معلوم ہو گیا کہ کائنات نہ کوئی خود درجہ تکمیل ہے اور نہ انسان اس تکمیل کا محض بڑھیا جانور۔ بلکہ انسان و کائنات دونوں کی تخلیق کسی خاص علم و ارادہ کے تحت عمل میں آئی ہے تو پھر لازماً اس تخلیق کا کوئی خاص معلوم و مراد و مقصد بھی ضرور ہے۔ دینی تعلیم اس مراد و مقصد کے احکام کی تعلیم و تکمیل کا نام ہے۔ اور حضرت کا اصل مقصد تجدیدی زور دین کے تمام شعبوں کے احکام یا ادا و امر و نواہی کے سکھانے اور پھیلانے ہی پر ہے کہ انہیں کا علم و عمل مقصود بالذات ہے باقی رائج و عرفی دینی مدارس و ادارات کتابی تالیفات و تصنیفات وغیرہ کی حیثیت مقاصد کی نہیں بلکہ مقدمات کی ہے ورنہ نفسِ احکام دین جاننے اور پورا کرنے کے لئے عربی یا عربی کے ذریعہ کسی مقررہ مروج نصابِ درسیات کی سالہا سال میں تکمیل کیا معنی؟ عربی اُردو کسی زبان کا ایجاد خواں ہونا یا سرے سے خواندہ ہونا تک ضروری نہیں لیکن لوگوں نے

دینی تعلیم کے تصور میں نفس کتابی تعلیم کو نہیں بلکہ اور خدا جانے کتنی غیر ضروری چیزوں کو ضروری اور بہت سی مؤخر چیزوں کو مقدم قرار دے رکھا ہے کہیں منطق و معقولات پر زور دنا ہے کہیں اسرار و کلامیات پر اور کہیں ادب و انشاء تقرر و تحریر پر، ان غیر ضروری یا مؤخر چیزوں کو مقدم بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نفس احکام کی حد تک ان درسگاہوں کے نام کے علماء دیانات تک کے پورے پورے ادا و نواہی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ آگے معاملات اور اس سے بڑھ کر اخلاق و معاشرت کا ذکر ہی کیا اس لئے حضرت علیہ الرحمۃ کی تجدیدات کا ایک بڑا اکیلی اصول مقصود و غیر مقصود کا فرق و امتیاز ہے جس کے بغیر اکثر لوگ غیر مقصود کے پیچھے بڑھ کر مقصود کو کھوٹے رہتے ہیں

فرہنگی و باء

مغربی و فرہنگی دجل کی راہ سے جو مفاسد و با کی طرح ساری دنیا میں پھوٹ پڑے ہیں ان ہی میں سے ایک بڑی دبا صالح ہونے کے بغیر مصلح (رفارمر) یا اپنی اصلاح سے بے فکر وہ کہ ساری قوم سارے ملک بلکہ ساری دنیا کی اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جانا ہے، ہر کس و ناکس اہل و نا اہل جو ذرا زبان چلا سکتا یا کوئی اخبار و رسالہ نکال سکتا یا جماعت سازی و انجمن سازی کا کچھ ڈھنگ رکھتا ہے پس وہ بے تکلف لیڈر اور رہبر بن جاسکتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ وکالت یا پلیڈری کی سند حاصل کر لینا تو گویا لیڈری کی مسلمہ سند ہے، حدیہ کہ ایسی لیڈری مستقل معاشی پیشہ بن گئی ہے۔ اگر کوئی ادا دھندا نہ چل رہا ہو یا پلیڈری سے پیٹ نہ بھر رہا ہو تو بقول بڑے عارف زمانہ شاعر حضرت اکبر کے یہ

”خیر بالفعل لیڈری ہی سہی“

اس مغربی و فرنگی طریق اصلاح کے برخلاف انبیائی طریق یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت و ہدایت کا خود مکمل اسوہ و نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں یہی اسوہ و نمونہ طبعاً و فطرۃً دوسروں کو حسب استعداد ان کے رنگ میں رنگتا ہے ، تقریر و خطابت برائے نام اور بالکل بقدر ضرورت ہوتی ہے حضرت بنی الانبیاء علیہم السلام الیٰ التبتہ جو ساری دنیا کی اصلاح و ہدایت ہی کے لئے بھیجے گئے تھے ان تلک باوجود مسلمہ عصمت کے احکام یا اوامر و نواہی کی بہت سی آیات میں صیغہ واحد سے خطاب فرمانے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ خود حضور کے اسوہ و نمونہ ہونے اور ویسا بننے کی طرف لوگوں کو توجہ ہو ، اس انبیائی راہ کے حضرات رحبروں اور مربیوں کی جائز و ناجائز خانہ پری اور بھرتی سے مصنوعی جماعت سازی یا انجن سازی کے قریب بھی نہیں جاتے۔ بس اسوہ حسنہ و نمونہ کے اثر و اتباع کی فطری و طبعی راہ سے جو لوگ ان کے رنگ میں رنگتے جاتے ہیں وہ از خود قدرتی و حقیقی جماعت کے شیرازہ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور جس نظام کے اعضا یا جس مشین کے پرزے اپنی اپنی جگہ کارگر ہوں وہ نظام یا مشین صرف دستہ بھرانے سے اپنا کام آپسے آپ پورا کرے گی۔ اگر کسی عذار شہر میں آگ لگی ہو اور لوگ خود اپنے گھر اور محلہ کو چھوڑ کر دور دور کے گھروں اور محلوں کی آگ بجھانے دوڑ رہے ہوں تو بجز اس کے ہو ہی کیا سکتا ہے کہ پورا شہر آگ کے شعلوں میں لپٹ کر خاک ہو جائے۔

اصلاح کا خاص تجدیدی پہلو

غرض اس طرح اصلاح کے معاملہ میں حضرت کا خاص تجدیدی پہلو یہ ہے کہ دوسروں سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر یا جماعت سازی سے مقدم افراد سازی ہے بس یہی افراد سازی زندگی بھر حضرت کا خاص طریقہ و مشغلہ رہا ، غیروں کی ہدایت

و قیادت کی نیت تک بتدیوں کو یانامی کی حالت میں جائز نہ رکھتے، قیادت و امامت دراصل انبیائی منصب کی نیابت ہے اور اس لئے قدرتِ نبوت و رسالت ہی کی طرح فی الجملہ اصطفاۃ ہے کہ تم خود اپنی اصلاح و تکمیل میں لگے رہو، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو ایسے اسباب خود پیدا فرمادیں گے کہ دوسروں کی اصلاح کی خدمت بھی حسبِ حیثیت نصیب ہو جائے، یا جب کوئی طبیب حاذق تم کو نسخہ نویسی کی اجازت دیدے تب دوسروں کے معالجہ کا مطب کھولو۔

توابع کی اصلاحی ذمہ داری

خود اپنی صلاح و فلاح کی فکر کے بعد بلکہ اس کے ساتھ طبعی و فطری ذمہ داری اہل و عیال یا اپنے ہی توابع کی اصلاح و غیر خواہی کہے جو کسی نہ کسی درجہ میں کم و بیش ہر فرد بشر پر عائد ہوتی ہے اسی لئے دونوں کو ایک ساتھ مامور فرمایا کہ خود اپنے کو اور اپنے گھروالوں کو آگے بجاؤ و رقا انفسکم و اہلیکم دائراً، ساری بنی نوع انسان یا كافة الناس کے ”بشیر و نذیر“، (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی حکم تھا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، (وَأْمُوا هَلِكُ بِالصَّلَاةِ) اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈھراؤ (وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْآقِبِينَ)

لہذا اپنے ساتھ ساتھ جن دوسروں کی صلاح و فلاح کی نگرانی عقلاً و نقلاً ہر طرح ہم پر عائد ہوتی ہے وہ اپنے ایسے ہی متعلقین یا ایسے توابع ہی ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے تابع و ماتحت یا زیر نگرانی ہیں اور جن پر کسی نہ کسی درجہ میں ہم کو اثر و اقتدار حاصل ہے اسی بناء پر ان کے بارے میں ہم سے مواخذہ و باز پرس بھی بالکل حق و بجا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کا راہی یا نگران ہوتا ہے اور اس سے اپنی رعایا یا زیر نگرانوں کے بارے میں باز پرس ہوگی (کلکم راعٍ

و کلامہ مسئلہ عن رعیت ۵) ظاہر ہے کہ جو کسی طرح کسی کے زیر اثر ہے وہ لازماً اس کے اثر کے موافق اس کی بات کو زیادہ ماننے اور قبول کرنے پر بھی مائل و مجبور ہوگا اور قدرتِ اس کی زیادہ سہولت کے ساتھ زیادہ اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے نیز خود اپنی ذات کے بعد جن کی صلاح و اصلاح سب سے زیادہ اپنے اختیار و قدرت میں ہوتی ہے وہ یہی اپنے زیر اقتدار تابع ہو سکتے ہیں اور تکلیف چومکا امور اختیار یہی کی بقدر اختیار و وسعت ہے لہذا اپنے ساتھ ساتھ بالذات و براہ راست اپنے تابع کی اصلاح کے بھی ہم مکلف و مسئول ٹھہرانے گئے ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب بھی بدرجہ اولیٰ اور خصوصاً بالید یعنی حسب اثر و اقتدار اور حسب موقع و محل استعمال قوت کے ساتھ یہ بھی تو تابع یا خاص اپنے زیر نگرانی و رعیت ہی کے لئے ہے دوسروں کے لئے باللسان یا زبان سے مامور ہیں وہ بھی بعض صورتوں میں صرف مستحب اور بعض میں سرے سے ممنوع، باقی ایمان کی آخری سرحد بالقلب ہے یعنی جہاں ہاتھ اور زبان سے کام نہ لیا جاسکتا ہو وہاں کم از کم دل سے برائی کو مبرا جاننا اور تباہ امکان اس سے دور و فقور ہونا ایمان کا کم سے کم یا آخری درجہ ہے۔

خلاصہ

یہ کہ مجددِ وقت کے تجدید فرمودہ کتاب و سنت کے اسلامی نظامِ ہدایت کے موافق ہر فردِ مسلم کا پہلا اصلاحی فریضہ یہ ہے کہ خود اپنی اور اپنے تابع کی اختیاری و جوبی اصلاح کے کام کو لے بیٹھے، جب افراد کی اس آسان و اختیاری طریق سے اصلاح ہو گئی تو ایسے صالح افراد کو جس جماعتی کام میں لگایا جائے گا وہ بھی آپ سے آپ صلاح و صحت کے ساتھ انجام پائے گا۔ اس آسان و اختیاری طریق کو چھوڑ کر مشکل و غیر اختیاری

کے پیچھے پڑنا گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتا ہے

اب جو افراد اتنے سعادتمند ہوں کہ ان سطور اور ان کی ضروری تفصیل اور پر کتاب میں پڑھنے ہی سے چونک کر خود اپنی اور اپنے تابع کی اصلاح کے لئے کمر لیں اور کم از کم اردو اچھی طرح جانتے ہوں ان کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ پہلے حضرت کے کچھ ملفوظات و مواظظ پڑھنا اور گھروالوں کو پڑھانا یا سنا شروع کر دیں انشاء اللہ اس سے سب کو اپنی اپنی اصلاح و آخرت کا خیال پیدا ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے حضرت کی چیزوں کو کھلے دل و دماغ سے دوچار سو منے بھی پڑھ لیا راقم ہذا کا بلا استثناء تجربہ ہے کہ ان کو اپنی اصلاح کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور پیدا ہو گیا۔ پھر اگر قصد اچھوڑ نہیں دیا تو راستہ پر پڑ گئے۔

اس کے بعد روزمرہ کی ضروریات کے بقدر احکام دین کے جاننے کے لئے حضرت نے اردو ہی کی چند کتابوں (بہشتی زیور، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم، حیات المسلمین، حقوق الاسلام، آداب المعاشرت، تبلیغ دین، فروع الایمان، جزاء الاعمال، صفاتی معاملات وغیرہ) کا ایک مختصر سا نصاب مقرر فرما دیا ہے جس کو پورا وقت دینے والا ایک چل میں ورنہ پھر جو جتنا وقت دے سکے اس کے اعتبار سے دوچار مہینوں میں پورا کر لے سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے عام لوگوں کو حضرت کی خاص ہدایت یہ ہے کہ وہ اس نصاب کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھیں ورنہ پھر جہاں جہاں شبہات واقع ہوں نشان نکالیں، اور کسی عالم سے ان کو حل کر لیں، دوسرے کسی اچھے دیندار عالم سے وقتاً فوقتاً ملاقات یا کم از کم مکاتبت کا تعلق ضرور رکھیں اور حسب ضرورت ان سے مل کر یا لکھ کر معلوم کر کے عمل کرتے رہیں۔

چونکہ حضرت کی کتابوں خصوصاً مواظظ و ملفوظات سے لوگوں میں بالعموم اپنی بد حالی کا احساس اور اصلاح حال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اس لئے ابتدائی

طلب دین و اصلاح کا خیال پیدا کرنے کے لئے اس کتابی عہد میں حضرت کی کتابوں کو مختلف موثر و مقبول اسالیب و عنوانات سے ہزار ہا ہزار کی تعداد میں شائع کرنا کہ لاکھوں ہاتھوں تک پہنچیں اور کروڑوں میں پڑھی پڑھائی سنی سنائی جائیں بجائے خود انشاء اللہ ایک عام دینی بیداری اور عمومی انقلاب و اصلاح کا ذریعہ ہو گا۔

متعدی اصلاح و تبلیغ

دینی زندگی کے دو کلیدی اصول

باقی جو حضرات کچھ اس کی صلاحیت و ہمت رکھتے ہیں کہ خود اپنی اور اپنے اہل عیال یا تواضع کی اصلاح کے علاوہ عام مسلمانوں یا غیر مسلموں کی بھی اصلاحی یا تبلیغی خدمت کی کوئی سعادت حاصل کر سکیں، ان کو لازم و متعدی انفرادی و اجتماعی ہر طرح اور ہر موقع کی دینی زندگی کے دو کلیدی اصول حضرت مجدد کی تعلیم و تجدید کے پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ ایک مقصود و غیر مقصود کا امتیاز دوسرے اختیاری و غیر اختیاری کا فرق۔

۱) مومن کا اصل مقصود کامیاب لقائے رب، اور (۲) اس کامیابی کا ذریعہ رخصتے رب ہے، اس دنیا کی زندگی اسی رضا طلبی کے امتحان کے لئے عطا فرمائی گئی ہے اس امتحان کا دروازہ فرد و جماعت، غنی و فقیر، عالم و عامی، مستعد و حشی، حاکم و محکوم سب کے لئے اپنے اپنے محل و مقام کے لحاظ سے یکساں کھلا ہوا ہے لہذا مقصود بالذات نہ انفرادی و اجتماعی یا شخصی و قومی غنا و ثروت ہے، نہ علم و تمدن

لے رائج الوقت مہینے میں معاذ اللہ حضرات صحابہ تک سے زیادہ کون بے علم و غیر مستعد ہو گا لیکن دوسری طرف رخصتے رب کے امتحان میں ان سے بڑھ کر تاریخ کی آنکھوں نے کامیاب انسان کب دیکھے ہیں۔

نہ حکومت و سلطنت، جیسا کہ آج کل ان ہی چیزوں کو افراد و اقوام سبب مقصود ہی نہیں
معبود بنا رکھا ہے البتہ ان چیزوں کی حیثیت کچھ ضمنی و ذیلی مقاصد یا مؤیدات کی ہے
وہ بھی اس شرط سے کہ ان سے کام رضائے حق کا لیا جائے اور احکام ہی کے ماتحت
ان کو رکھا جائے ورنہ پھر دولت و حکومت تو فرعون و قارون کے پاس بھی تھی یہی
نہیں بلکہ ان خارجی مؤیدات کی کمی یا فقدان کی صورت میں امتحان میں کامیابی کا درجہ
بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے، السابقون الاولون کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور کون
کہہ سکتا ہے کہ مکی دور کی بیکی و مظلومیت میں رضا جوئی کے امتحان کا موقع و مقام
مدنی دور یا خلافت راشدہ کے غلبہ و قوت کے ایام امتحان سے فروتر تھا۔

مطلب یہ کہ لازم و انفرادی اصلاح کی طرح متعدی و اجتماعی اصلاح میں بھی
اصل مقصد و پیش نہاد رضا طلبی ہو نہ کہ غیروں کی دیکھا دیکھی، جاہی و مالی یا سیاسی
و معاشی غلبہ و ترقی ہی کو مقصود بالذات بنالینا اور اس کے بغیر فرد و قوم سب کو پسماندہ
یا تنزل کا مارا خیال کرنا، مقصود و غیر مقصود کے اس فرق و امتیاز کی انتہا یہ ہے کہ
جو دینی خدمات مقصود ہیں ان میں بھی مقصود بالذات کامیابی نہیں بلکہ کامیابی
کی اپنی والی صرف سعی وہ بھی رضائے حق کے لئے اس کے بعد بھی ظاہری ناکامی ہو تو
وہ عین کامیابی ہے۔

اگر انسان نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان کو اپنے اصل انسانی مقصود
و مدعا کی تکمیل و تحقق کے لئے ایسی چیزوں کی تکلیف میں ڈالا گیا ہے جو ہر وقت ہر انسان
کے اختیار میں نہیں۔ وہ دین عام و عالمگیر کیسے ہو سکتا ہے جو انسان و انسانیت
کی تکمیل و ترقی کے مواقع ہر فرد انسان کو ہر صورت اور ہر حالت میں یکساں نہ عطا
کرتا ہو یا اس کی تکمیل و ترقی کو ایسی شرائط و قیود کے تابع قرار دیتا ہو جن کا حصول ہر
ہر فرد کے انفرادی اختیار میں ہی نہیں بلکہ سہولت سے اختیار میں نہ ہو۔ اسلام کا تو

بنیادی و قرآنی منصوبوں اولین اصول یہی ہے کہ وہ کسی فرد پر بھی اس کی انفرادی وسعت و طاقت سے زیادہ قطعاً کوئی بوجھ نہیں ڈالتا اور ہر فرد کے لئے اس کی انفرادی قوت و وسعت کے اندر ہی اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ تکمیل و ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔

ایک اور عام عارضہ

اس عہد کا ایک اور عام عارضہ یہ بھی ہے کہ لوگ قومی و اجتماعی خدمات میں نہ خود اپنی اختیاری اہلیت و صلاحیت کا لحاظ رکھتے ہیں نہ دوسرے کی۔ اگر کوئی شخص مثلاً جا و مال کا مالک ہے تو وہ اور دوسرے سب سمجھتے ہیں کہ وہ دین و دنیا کے ہر معاملہ میں ملے و ملاخلت کا مجاز ہے۔ اگر کوئی رائج الوقت سیاسی تجربہ و بصیرت رکھتا ہے تو وہ دینی مسائل و احکام میں بھی رائے زنی و اجتہاد کا حقدار بنتا اور بنایا جاتا ہے اگر کوئی صرف تقریری و تحریری لیاقت و شہرت رکھتا ہے تو لوگ عملی و انتظامی کاموں کا بھی اس کو لائق سمجھنے لگتے ہیں اور وہ بے تکلف ان کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

پھر وقت، فرصت، لیاقت و صلاحیت کے لحاظ کے بغیر کئی کئی قومی و اصلاحی کاموں کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے، تو گویا سیاسیات و قومیات کا ضلع خاص نمیشن ہے، ایک کے صدر دوسرے کے نائب صدر کسی کے معتمد کسی کے رکن بلکہ رکن یا ممبر تو دس بیس اداروں کا بن جانا بھی کوئی بات نہیں لیکن ایسے ارکان کی احساس ذمہ داری و فرض شناسی کا حال رفقاء نہ کیا دیکھا جاتا ہے کہ جن بتجاذیز و معاملات پر رائے فیئے مجلس میں تشریف لاتے ہیں شاید ہی کوئی ہوتا ہو جو رائے زنی اور رائے دہی کے وقت سے پہلے دوچار گھنٹے بھی سکون و اطمینان کے ساتھ ان تجاذیز کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کر کے مجلس میں آتا ہو اور بار بار تو اس مجلس اور اس کے معاملات سے ان ارکان کی دلچسپی کا یہ حال دیکھا جاتا ہے

کہ حاضری کا نصاب دو کورم تک پورا نہیں ہوتا۔ کسی معاملہ میں خطوط لکھے جاتے ہیں یا دودھانی پر یاد دہانی ہوتی ہے مگر رسید تک ندارد

اور بالفرض شاذ و نادر کوئی شخص ایک سے زائد خدمات کی لیاقت و اہلیت رکھتا بھی ہو اور سب کی طرف بقدر گنجائش و فرصت ذمہ داری کے ساتھ توجہ بھی کرنا چاہتا ہو تو بھی وقت و فرصت میں اتنی وسعت کتنوں کے ہو سکتی ہے کہ اس منقسم توجہ کے ساتھ سب کی طرف توجہ کا حق پوری طرح ادا ہو سکے، خصوصاً جو لوگ اپنے ذاتی و انفرادی ادا اپنے اہل و عیال و توالیج کی صلاح و اصلاح اور اپنے دیگر خانگی مشاغل کے مقدم فرائض و واجبات کا بھی حق ادا کرتے ہوں، وہ تو اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹے کام بھی حقوق شناسی کے ساتھ انجام دے سکیں تو بڑا پالا مارا۔

مقصود کام نہیں نام

بات وہی ہے کہ رمنائے حق کا ذکر ہی کیا مقصود اصل میں کام نہیں زیادہ تر نام ہے۔ مال سے بھی زیادہ انسان نام و جاہ کا بھوکا ہے اس لئے اگر اس کے اندر سے آخرت طلبی اور رمنائوئی کی روح نکل گئی ہو تو کیا وجہ ہے کہ نام کے مواقع نظر انداز کر کے کام میں وقت برباد کرے۔

کام کے بجائے نام کی اس فکر و طلب کی بدولت ہر چھوٹے بڑے اصلاحی و اجتماعی کام میں ایک بڑی خرابی یہ پیدا ہے کہ وقت و قوت کو کیف سے زیادہ ”کم“ کے حصول میں ملوث اور گہرائی سے زیادہ کام کے طول و عرض اور پھیلاؤ پر صرف کیا جاتا ہے، اجتماعی و متعدی خدمات میں یہ زبردانستہ و نادانستہ اتنا سرائیت کر گیا ہے کہ بعض خالص دینی جماعتیں اور ان کے مخلص ترین کارکن تک اس کے

قدیہ سے محفوظ نہیں۔ ایک طرف تو ایک گھر ایک محلہ یا ایک بستی کا اصلاحی کام پورا نہیں ہوتا اور دوسری طرف سارے ملک کے طول و عرض میں دوڑ اور دوروں پر زور ہوتا ہے۔ ابھی ان سطروں کے لکھنے سے پہلے ایک بڑے ہی صادق و غلط صاحب علم و قلم جوان صالح کا واقعی بڑی حسرت و عبرت کا مضمون اتفاقاً نظر پڑا جس میں انہوں نے ہمارے حال و حاضر کا ہمارے ماضی و آغاز (حضرات صحابہؓ) سے اس طرح مقابلہ فرمایا ہے کہ :-

۱۔ صحابہؓ گنتی کے تھے اور تمام دنیا ۱۔ ہم لا تعداد ہیں اور زمین پر بھاری پر بھاری تھے۔
ہوئے ہیں۔

۲۔ صحابہؓ بادشاہوں پر سلطنت ۲۔ ہمیں غلامی اور غلاموں کی غلامی کرتے تھے۔
بھی بہ نراہ وقت نصیب ہوتی ہے

۳۔ صحابہؓ کچھ نہ تھے اور سب کچھ ۳۔ ہم سب کچھ تھے اور کچھ نہ رہ گئے ہو گئے۔

۴۔ صحابہؓ کی دنیا میں بھی عزت و آرام ۴۔ ہماری زندگی سخت ذلت اور پریشانی سے بسر ہوتی تھی اور آخرت اس سے گذرتی ہے اور آخرت کی بھی ظاہر بہت بہتر
امید ابھی نہیں۔

کم و کیف کافرق

ظاہر ہے کہ اس حسرتناک و عبرتناک فرق یا بعد المشیقین کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ وہاں کیف و عبق یا دین و ایمان کی گہرائی پر زور زیادہ تھا اور کم یا تعداد یعنی طول و عرض اور پھیلاؤ پر توجہ کم تھی خود صاحب مضمون ہی نے بخاری شریف سے نقل فرمایا ہے کہ :- مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تین مرتبہ

مسلمانوں کو شمار کیا گیا پہلی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد ۵۰۰ دوسری میں ۶۰۰ اور ۷۰۰ کے درمیان اور تیسری میں مسلمان ۱۵۰۰ تھے، اس تعداد پر مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اب ہمیں کیا ڈر ہے ہم نے تو وہ زمانہ دیکھا ہے جب ہم اکیلے نماز پڑھتے تھے اور پھر بھی ہر طرف سے دشمنوں کا خوف لگا رہتا تھا،

فرق یہی ہے کہ ان کے اندر ایمان کی کیفیت و کمال اتنا رچ گیا تھا کہ ہر طرف سے دشمنوں کے خوف کے باوجود اپنے انفرادی فرائض نماز وغیرہ کو اکیلے چھپ کر بھی کسی نہ کسی طرح اختیار بھرا دیا ضرور کرتے تھے اور ہم میں کہتے ہیں جو کھلے خزانے بنیخون و خطر نماز اور دیگر فرائض دین کی قدرت رکھ کر بھی ان کو ادا کرتے ہیں! ایسے لاتعداد افراد کی قوم کی حالت ظاہری و زبانی شان و شوکت و شور و غل کے باوجود صاحب مضمون ہی کے الفاظ میں اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ایسے ”وجہ پر چرے، شاندار و باوقار صورتیں، بارعب جسم، دشمن و دوست سب کی نظر میں سب سے زیادہ حقیر و بے وقار ہیں و اذا سرايتهم تعجبك اجسامهم وان يقولوا تسبح لقولهم كانوا تسبح لقولهم كانوا خشب مسندة يحسبون كل صيحة عليهم

اور جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کے جسم بھلے معلوم ہوں گے اور یہ جب کچھ کہنے لگیں تو تم کان لگا کر سننے لگو گے (یعنی باتیں خوب بناتے تقریریں خوب کرتے ہیں لیکن حقیقت کیا ہے) گویا ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں،

کہ خود اپنے بل بوتے پر نہیں کھڑی ہیں جہاں سہارا ہٹا اور گریں اس اندرونی ضعف کی بدولت بزدلی کا یہ حال ہے کہ ہر آواز کو اپنے

خلاف ہی سمجھتے ہیں،

بظاہر تم ان کو ایک جماعت یا قوم سمجھتے ہو لیکن ان کے دل آپس
میں پھٹے ہوئے ہیں تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ

اتفاق کا گر

حضرت علیہ الرحمۃ نے حُسن معاشرت کی اہمیت کے سلسلے میں کہیں تحریر فرمایا
ہے کہ آج کل اتفاق اتفاق کا شور ہے لیکن جب تک آپس کا برتاؤ یا معاشرت درست
نہ ہو کہ ایک کا دوسرے سے دل نہ دکھے اس وقت تک دل کیسے مل سکتے ہیں اور
اتفاق کیسے پیدا ہو سکتا ہے

حضرت رحمتی تجدید دین کا حاصل

حضرت کی تجدید دین کا حاصل یہی ہے کہ قلب و قالب، ظاہر و باطن،
عقائد و عبادات، معاملات معاشرت، سب کی کیفیات و تائماً اصلاح ہو اور
مسلمان زندگی کی ہر راہ میں اور ہر اتار چڑھاؤ میں اول و آخر مسلمان یعنی ادھر سے
نہیں پورے پورے مسلمان بنیں اور بنائیں۔ یہی راز تھا کہ قلت تعداد کے باوجود
صحابہ کچھ نہ تھے سب کچھ ہو گئے۔ ادرہم سب کچھ تھے کچھ نہ ہے، وہ مٹھی بھر تھے تو
بحر و بر چھاتے ہوئے تھے اور ہم مور و بلخ کی طرح ہیں، تو کہیں نہیں۔

سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات

اب آخر میں لیکن اول و آخر جو بات متعدی یا اصلاحی خدمات کی اہلیت
وہمہت رکھنے والے حضرات کو ہمہ وقت اور سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے وہ یہ
کہ ان خدمات کے بدلے میں کسی مالی و جہائی، جانی و جسمانی اجر کے ذرہ بھر بھی کسی

سے طالب نہ ہوں۔ یہ کام نبوت و رسالت کی نیابت ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام سے ایک جگہ نہیں جا سجا اور بار بار اس کا اقرار و اعلان لیا اور کرایا گیا ہے کہ اس دعوت و اصلاح کی خدمت کا کوئی اجر میں تم سے قطعاً نہیں چاہتا میل اجر صرف الشکر ہے۔ ما اسئلكم علیہ من اجر ان اجری الا علی اللہ رب العالمین، یَقْوَمُ لا اسئلكم علیہ اجرًا ان اجری الا علی اللہ اسی بناء پر حضرت علیہ الرحمۃ نے واعظین و مبلغین یا دینی مدارس کے اساتذہ و مدرسین سے چندہ وغیرہ کی خدمت لینے کو سختی سے منع فرمایا۔ دعوت و ہدایہ تک قبول کرنے کی اجازت عام طور سے نہیں دی ہے۔

جو اہل مال کوئی بڑی سے بڑی مالی خدمت کی سعادت بھی اس راہ اور اس کے خادموں کی حاصل کریں وہ ان خادموں کو اپنا مخدوم ہی جانیں اور ان کی طرف سے کسی طرح کی تعظیم و تکریم تک کے اجر کے متوقع نہ ہوں بلکہ خود احسان مند ہوں کہ مال جیسی حقیر چیز قبول کر کے ان کی طرف سے وہ دین جیسی عظیم خدمت کو انجام دے رہے ہیں ساتھ ہی ان دینی خادموں کو بھی چاہئے کہ دین کے ان مالی خادموں کو دین کی خدمت کا شریک و سهمیہ اور اپنا معین و محسن جان کر ان کی عزت و توقیر کریں اور ان کے مشورہ سے کام کریں، اسی طرح دینی خدمات کے انتظامی عہدہ داروں یا خدمت گذاروں کو چاہئے کہ وہ اپنے کو ان دینی خادموں کا خدمت گار ہی تصور کریں اور یہ ان کو اپنا مددگار، افسری و ماتحتی کی مروج تعظیم و تحقیر کا معاملہ نہ کرزنہ ہو، بھائیوں بھائیوں کے باہمی افتراک و تعاون کی صورت ہو، بڑے چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت اور چھوٹے بڑوں کے ساتھ ادب و عظمت کا برتاؤ رکھیں۔ یہی تعلق اساتذہ و طلباء، معلمین و متعلمین، ائمہ و مؤذنین عوام و مبلغین سب میں ہو کہ کوئی کسی کی زبان و عمل سے تحقیر یا بیجا دل آزاری کے درپے نہ ہو، اگر بھول چوک سے ایسا ہو جائے

توجہ از جلد صفائی و عند خواہی سے تلافی و تدارک کرے۔

ایک اور تقاضا

و مطالبہ نبوت و رسالت کی نیابت کا یہ ہے کہ تعلیم و تربیت تبلیغ و دعوت اصلاح و احیاء کی خدمات میں جو حضرات بھی بواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ضابطہ و ذمہ داری کا عہدہ یا خدمت قبول کریں وہ صورت و سیرت وضع قطع اعمال و اخلاق خصوصاً تمام مرئی و محسوس چیزوں میں اپنے ادارہ و عوام سب کے لئے خود ابتداء احکام کا اسوہ یا قابل تقلید نمونہ ہوں۔ دینی اداروں، مدارس و مکاتب کے بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمین و منتقلین کے باب میں اس کا پورا لحاظ ہے کہ وہ فرائض و واجبات کی پابندی اور وضع و لباس میں خاصے دینہ پر معلوم ہوں ان کی ایک حیثیت رعایا یا زیر نگرانی توابع کی بھی ہے اس لئے یوں بھی ان کے دین کی نگرانی لازم ہے۔

اصول بالا کی مزید تفصیل تو اوپر اصل کتاب میں ملے گی یہاں ان کا اجمالی ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ ان کی روشنی میں عام و تمام دینی انقلاب کا ذیل میں ایک نظام عمل پیش کرنا ہے۔ عام کے یہ معنی نہیں کہ ایک ساتھ کل دنیا، کل ہندوستان یا کل پاکستان میں کام شروع کر دیا جائے، دین کی اصلاحی خدمات یا نبوت کی دنیا کا حق ادا کرنے کے لئے ایمان و اخلاص، صلاح و تقویٰ، علم و عمل، ایثار و فطانت حوصلہ و ہمت، فہم و فراست کے جیسے جامع صفات رجال کی ضرورت ہے ان کی جیسی ہمیشہ کی رہی اور ہمیشہ سے بڑھ کر آج جیسا قحط ہے اس کے لحاظ سے ان صفات کے کاملین ہی نہیں اوسط درجہ کے کاملین بھی اگر کسی ایک سستی و شہر میں کیا سارے ملک میں دس پانچ بھی مل جائیں تو ان کو جمع کر کے مذکورہ بالا اصول کے مطابق کسی گوشہ سے اس نظام کا آغاز کر دیا جائے، پھر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو اس معنی میں

بھی عام ہو جائے گا کہ سائے ملک یا ساری دنیا میں مقبول درجہ ہو جائے
وہو علیٰ کل شئ قدیں

اجزائے نظام کا خاکہ

ایک درس گاہ

کایام جس میں دین کی عمرانی کے ذریعہ ابتدائی اوسط اور اعلیٰ درجہ تک تعلیم
کا تربیت کے ساتھ اس طرح اہتمام ہو کہ دینی تربیت یا افراد سازی پر تعلیم سے کم
نہیں زیادہ دود و توجہ ہو کہ یہی افراد آگے چل کر صحت و قوت کے ساتھ اس نظام
کی توسیع و تعمیم کا ذریعہ ہوں گے، اس درس گاہ میں ایسے خاندانی و خوشحال ذہین بچوں
کے لینے کا خاص خیال رکھا جائے جن کے والدین یا سرپرست اپنی اولاد کی خیر خواہی
صرف دنیا ہی تک نہیں محدود جانتے بلکہ آخرت کی خیر خواہی کو مقدم رکھتے ہیں۔ ایسے
والدین کم ہیں لیکن ہیں اور جو نہیں ہیں ان کو بتلایا جائے کہ تمہاری کسی نادانی کی خیر خواہی
بلکہ کھلی بدخواہی ہے کہ چند روزہ زندگی وہ بھی ایسی کہ یقیناً ایک روز کا بھی نہیں اس کی
راحت و عزت کے لئے تو مال و دولت و قوت و قوت کا سارا سرمایہ لگا دیتے ہیں لیکن
آخرت کی ابدی یقینی زندگی کی کامیابی و کامرانی سے یہ غفلت کہ گو باتم کو کبھی مرنا
ہے نہ اولاد کو۔ اگر اتنا بھی یقین نہیں تو پھر مسلمان کس منہ سے اپنے کو کہتے ہو۔

ایسے طلباء بعد فراغ دینی خدمات کے لئے زیادہ موزوں ہوں گے کہ دنیا
کی حاجات سے بقدر حاجت الحمد للہ گھر سے فارغ ہوں گے اور خاندانی اثرات کی
بدولت جو صلگی سیر چشمی وغیرہ بہت سے اچھے صفات کے موروثی طور پر حامل ہوں
غریب شرفاء اور عام مسلمانوں کے بچوں میں بھی نظر انتخاب سے ایسوں ہی کو چنا جائے

جو قبول تربیت کی استعداد رکھتے ہوں، اور تجربہ کے بعد جس طالب العلم کی معتد بہ تربیت پذیری کی استعداد سے مایوسی ہو تو اس کے دہریے اثر سے دوسروں کو بچایا اور اس کو قطعاً علیحدہ کر دیا جائے خواہ ذہنی و علمی اعتبار سے وہ کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو دوسری درسگاہوں کے ایسے فارغ و نیم فارغ طلباء کو بھی لیا جائے جو دینی خدمت اور قبول تربیت کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

نصابِ تعلیم

۱، ابتدائی و بنیادی نصاب وہی حضرت علیہ الرحمۃ کا مجوزہ مختلف سالہ ہوگا جو اس درسگاہ کے متوسط اور اعلیٰ سب درجوں کی بنیاد اور سب کے لئے لازم ہوگا۔ حسب ضرورت کچھ ضروری جزئی ترمیمات کر لی جاسکتی ہیں مدتِ تعلیم تین سال ناکافی ہو تو چار سال تک بڑھا لی جائے۔ اس سے زائد نہ ہو۔

۲، متوسط درجوں میں خالص علوم دینِ تفسیر و حدیث اور فقہ کا حصہ زیادہ ہو، متنِ کلام مجید کامل، باقی انہیں سے تعلق رکھنے والے دیگر علوم کا حسب ضرورت و گنجائش الاقدم فالاقدم کے لحاظ سے جن کا بقنا حصہ شریک رکھا جاسکے، ایک کتاب علمِ کلام کی بھی ہو، مدتِ تین سال سے زائد نہ ہو۔

۳، اعلیٰ درجہ (یا درجہ تکمیل) کی مدتِ تعلیم دو سال ہوگی، اس میں تفسیر و حدیث و فقہ میں سے کسی ایک کی تکمیل ہوگی

۴، اس درجہ اعلیٰ کے دو شعبے اور ہوں گے جن میں درجہ متوسط کے ایسے فارغ التحصیل لئے جائیں جو خود اپنے ایمان و عمل میں راسخ ہونے کے ساتھ تحریر یا تقریر کی کچھ خاص صلاحیت رکھتے ہوں کہ غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کی یا ان کے پیداویش

کردہ شکوک و شبہات کے ازالہ کی خدمت کر سکیں۔

(الف) جن کو علوم عقلیہ و حاضرہ سے کچھ ذوق و مناسبت ہو ان کو ان علوم کے ایسے مسائل و نظریات کی خصوصی تعلیم دی جائے جن کا اسلامی تعلیمات پر نفیاً یا اثباتاً کوئی اثر پڑتا ہو۔ انگریزی زبان ان کے لئے لازم ہوگی تاکہ ایسے نئے نئے مسائل و نظریات سے واقف ہوتے رہیں، مدت تعلیم دو تین سال ہو، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آخر کتاب میں منیمہ)

(ب) جو خود ہم وطن غیر مسلموں میں دعوت و اشاعت کا کچھ ذوق و شوق رکھتے ہوں وہ ان کی زبان میں تحریر و تقریر کا ایک اچھا ملکہ پیدا کرنے کے علاوہ خود ان کے مذہب کی مستند معلومات بھی جس ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہوں کریں، مثلاً ہندوستان میں تحریر یا تقریر کا ملکہ تو ہندی میں پیدا کریں۔ اور مذہب ہندو کی جو کچھ معلومات اردو میں مل سکیں ان پر قناعت نہ کریں خود سنسکرت پڑھیں اور دو سال اس کے لئے ناکافی ہوں تو دور ان خدمت میں ساتھ ساتھ مطالعہ کے ذریعہ استعداد بڑھاتے رہ سکتے ہیں

کہفی رنگ

اس درس گاہ میں خانقاہی یا کہفی رنگ کے کم از کم ایک شیخ کے قیام کی بڑی ضرورت ہے جس کی صحبت سے اساتذہ و طلباء و دیگر متعلقین مدرسہ کے اندر باطن میں دین کا رنگ و کیف تھوڑا بہت پیدا ہو۔ دیگر اساتذہ جہاں تک ہو سکے شیخ یا نیم شیخ (حضرت کی اصطلاح میں مجاز صحبت) ہوں یا کم از کم طالب کے رنگ کے ضرور ہوں جن کو اپنی ظاہری و باطنی اصلاح و علاج کا مریض کی طرح اہتمام و فکر ہو، مطلب یہ کہ درس گاہ کے طلبہ کی تعلیم و تربیت، ماحول و فضا سب میں اس کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ہو کہ طلباء میں نرے طالب علم، نہیں طالب خدا ہونے کا بھی کچھ ذوق و شوق پیدا

ہو، جب تک خدا یا اس کی رضا کی طلب انسان کے اندر گھرنہ کرے سچ یہ ہے کہ وہ انسان نہیں ہوتا۔ اور دین تو دین دنیا کے حق میں بھی یہ نام کا انسان صفات انسانی سے نکلا ہوتا ہے۔

آج ساری دنیا میں جو انفرادی و اجتماعی فتنے اور سیاسی و معاشی شر و فساد آئے دن برپا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان اور سب کچھ اور جو کچھ بھی ہو مگر انسان نہیں رہا۔ اس انسان سازی میں حضرت کے ملفوظات کا زیادہ سے زیادہ پڑھنا پڑھنا خصوصیت سے کارگر ہوگا۔

مساجدی نظام

اس درس گاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ مساجد و مکاتب کے درج ذیل نظام کی صورت میں خود اپنے مصلح کی حسب اجازت اصلاحی و تبلیغی خدمات انجام دیں گے بالفعل جہاں اور جس درس گاہ سے جتنے بھی ان خدمات کی صلاحیت رکھنے والے دستیاب ہوں ان کو کم و بیش ۶ ماہ اس درس گاہ میں رکھ کر اور ان کے علم و عمل سے اطمینان حاصل کر کے کام میں لگایا جاسکتا ہے۔

۱، مساجد کے امام و مؤذن اگر مذکورہ بالا ابتدائی متوسط یا اعلیٰ درجہ کے عربی دان عالم ہوں تو کیا کہنا۔ ورنہ کم از کم مادری زبان اچھی طرح جانتے ہوں اور اس کے ذریعہ دیانات، معاملات، اخلاق و معاشرت کے تمام بوزمرہ کے ضروری دینی احکام سے خوب واقف ہوں اور ان کی تعلیم و تفہیم کر سکیں، ان میں سے کم از کم ایک حافظ بھی ہو تو بہت اچھا ہے ورنہ ناظرہ دونوں کا پورا اور ایسا اچھا ہو کہ صحت مخارج کے ساتھ دوسروں کو پڑھا سکیں

دین کے اعتبار سے ظاہری و باطنی حالت ایسے متوفین کی اقلہ اوسط درجہ کی ہوتا

ضروری ہے۔ خالی عقائد و عبادات ہی نہیں معاملات و معاشرت سب میں۔ یا اگر طلب و استعداد ہو تو تعلیم کے ساتھ ۶ مہینے کی تربیت انشاء اللہ اس کے لئے بھی کافی ہوگی۔

(۲) ہر مسجد کے ساتھ بچوں کی تعلیم کا ایک مکتب ہوگا جس میں حافظہ و ناظرہ دونوں یا کم از کم ناظرہ کی صحت و خارج کے ساتھ تعلیم کے علاوہ مادری زبان اور اس کے ذریعہ ایسے رسائل کی تعلیم جو دین کے تمام ابواب کے روزمرہ کام آنے والے احکام پر مشتمل ہوں ساتھ حساب کی بھی بقدر ضرورت تعلیم ہو۔

ان مکاتب میں بھی تربیت کا لحاظ مقدم ہوگا اور یہ صرف مسجد کے حلقہ یا محلہ کے بچوں کے لئے خاص ہوں گے، بچوں کا سن کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ دس سال کا ہو اور مدت تعلیم ۵ سے ۶ سال تک۔ اور روزانہ تعلیم تین، چار، اور پانچ گھنٹے ہوگی، دو اور تین گھنٹے صبح اور ایک اور دو گھنٹے تیسرے پہر کو، چار پانچ سال کے کم سن بچوں کی صبح دو اور تیسرے پہر کو صرف ایک گھنٹہ۔ ۶ سے ۱۰ سال تک کے بچوں کی صبح دو، تیسرے پہر کو دو، یا صبح ڈھائی گھنٹہ اور تیسرے پہر کو ڈیڑھ۔ باقی اس کے اوپر کے بچوں کی صبح تین اور تیسرے پہر کو دو گھنٹہ۔

۳۔ ایک ایک گھنٹہ روزانہ امام و مؤذن دونوں کے ذمہ اپنے حلقہ کے ہر گھر کے ایسے خواندہ یا ناخواندہ صاحب خانہ کو منظور و مقرر کردہ کتابوں کے ذریعہ جملہ ابواب دین کے احکام سنانا ہوں گے جو اپنے گھر کے بازرگانی یا کسے ان کی حیثیت رکھتے ہوں ساتھ

۴۔ اوپر صفحہ ۵ کے تحتانی حاشیہ پر حضرت کی تجویز فرمودہ جو کتابیں درج کی گئی ہیں ان کے مضامین کی ضرورتی تلخیص و تسہیل کے ساتھ ان رسائل کو مرتب کیا جائے جس میں بچوں کی تدریجی ترقی و استعداد کا لحاظ ہو۔

ہی اس کی تفہیم و ترغیب ہو کہ وہ جس طرح اپنے گھروالوں یا زیر مگرافوں کی جسمانی و دنیوی صلاح و فلاح کے فیصل ہیں اس سے بڑھ کر ان کی دینی و اخروی اصلاح کے جواب دہ ہیں اس لئے ان احکام پر خود بھی آگاہ و کار بند ہوں اور گھروالوں کو بھی کہی۔

یہ بڑا اہم و مقدم اصلاحی کام ہے جو دراصل ایک شخص کی نہیں، پورے ایک گھر بلکہ پوری ایک نسل کی اصلاح کی صحیح و طبعی راہ ہے

(۴)، جمعرات کے دن مکتب صرف ایک وقت صبح کا ہو گا۔ دوسرے وقت یا رات کو جو حلقہ کے لوگوں کے ملنے کا مناسب وقت ہو امام و مؤذن دو چار اپنے اور ہم خیالوں کو لے کر ایسے لوگوں کے گھروں پر باری باری جاتیں یا جب تک ضرورت ہے جاتے رہیں جو مسجد میں جمعہ کو بھی نہیں آتے اور ان کو مسجد میں اد پر نمبر ۲ کے موافق آنے اور احکام دین سیکھنے پر تفہیم و ترغیب کے ساتھ آمادہ کریں، بحث و مناظرہ کی صورت بالکل اختیار نہ کریں نرمی سے اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات اور موت و آخرت کی تذکیر کے ساتھ تفہیم و ترغیب سے کام لیں

(۵)، جمعہ کے بعد نماز، احکام دین کی تحصیل اور ان پر عمل کی ترغیب کے ساتھ حسب ضرورت و موقع خاص خاص احکام ادا کرواؤ یا ہی سے متعلق کم و بیش ایک گھنٹہ وعظ کا کرین، امام صاحب اگر خود اچھے واعظ ہوں تو زبانی وعظ ہو ورنہ حضرت کے مواعظ مناسب انتخاب اور ترتیب و سلسلہ کے ساتھ سناتے رہیں۔ زبانی وعظ میں بھی حضرت کے مواعظ کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری و مفید ہو گا۔

(۶)، کم عمر بچہوں کے لئے یہ انتظام ہو کہ پاس پاس کے دو چار دس گھروں میں

لے ضرورت و اہمیت کے اعتبار سے ان مواعظ کو مرکزی درس گاہ کی طرف سے مضمون دار ترتیب کر کے شائع کیا جائے تسہیل کے ساتھ۔

اگر کوئی بی بی پڑھی لکھی ہوں تو ان کو ترغیب دی جائے کہ لوحہ الشدان گھروں کی بچیوں کو کم بیش تین گھنٹے دن میں پڑھا دیا کریں۔ ان کا نصاب کلام مجید، مادی زبان اور اس کے بعد مکمل بہشتی زیور اور کچھ حساب ہوگا۔

اگر محلہ میں ایسی معلمہ دستیاب نہ ہو تو باہر سے حاصل کیجائے یا کوئی سن رسیدہ معلم رکھا جائے ان معلم و معلمہ کا بھی خود نیک اور دیندار ہونا مقدم ہے۔

۷۔ جو نہ زیادہ سن کی لڑکیاں یا منکوحہ عورتیں ناخواندہ ہوں ان کے گھر کے راعی یا سرپرست کو آمادہ کیا جائے کہ کسی فرصت کے وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ دے کہ اگر نماز نہ آتی ہو تو پہلے نماز سکھلا دیں پھر تھوڑے تھوڑے روزانہ بہشتی زیور سے احکام و مسائل سنتے رہیں۔ اگر گھر میں کوئی بڑھا لکھا مرد سرے سے نہ ہو تو کسی سن رسیدہ معلم کا انتظام ہو کہ وہ پردہ سے سنا دیا کرے، ایک معلم اگر پاس پاس کے دس پانچ گھروں کی مستورات کو بھی ایک جگہ جمع کر کے روزانہ ایک گھنٹہ وقت دے تو اس طرح دن بھر میں محلہ بھر کی مستورات کی تعلیم ہو جا سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے میں وہ روزمرہ کے فردی احکام سے واقف ہو جا سکتی ہیں۔

۸۔ اس قسم کے معلم و معلمات کی نگرانی کا اور انتظامی تعلق حلقہ کی مسجد ہوگا

۹۔ مسجد کے حلقہ میں معمولاً وہ گھر داخل ہوں گے جن تک اذان کی آواز جاتی ہو

۱۰۔ ایسی مسجد جہاں نہ ہو وہاں بنانے کی کوشش کریں۔ جب تک نہ بنے زمین ہی لے کر اس کو خس پوشش کر لیا جائے، مستقل زمین بھی جب تک نہ حاصل ہو کوئی زمین مکان یا کمرہ مستعار بھی۔ غرض کام کے آغاز میں اس کی وجہ سے تاخیر نہ ہو اور اذان کے ساتھ باجماعت نماز بھی اس عارضی جگہ ہوتی ہے۔

۱۱۔ ہر مسجد میں اس کے حلقہ کی مردم شماری کا ایک رجسٹر ہو جس میں ہر گھر کے مرد و عورت بوڑھوں بچوں خواندوں ناخواندوں کی تعداد بقید سن درج ہو، خود اندگی

کی نوعیت و مقدار بھی، دینی و اخلاقی حالت، معاشی صورت، خانہ کیفیت میں ہر ایک کی دینی و اخلاقی و تعلیمی ترقی کی ماہ بہ ماہ مختصر کیفیت درج ہو۔

۱۱۔ ائمہ و متوذنین یا معلمین و معلمات کسی کے خانگی قصوں قصیوں اور ان کے چھکاتے میں ہرگز نہ پڑیں نہ کسی گھر یا فرقے سے کوئی خصوصی یا طرہ دارانہ تعلق رکھیں، سب مسلمانوں سے یکساں اور ایسا تعلق ہو کہ سب ان پر اعتماد کریں۔ اور اپنا یکساں خیر خواہ جائیں۔

مریضوں اور عاجز جمندوں کی عبادت اور بقدر فرصت خدمت سے دریغ نہ کریں

البتہ پابندی احکام کے سلسلہ میں اس کی بھی ترغیب دیتے رہیں کہ اپنے بھگڑنے کا فیصلہ خیریت کے احکام کے موافق کیا کریں۔ اگر کوئی صاف و معمولی بات ہو تو اس کا شرعی حکم بھی زبانی نہیں کسی مستند کتاب سے فریقین کو ایک ساتھ سنا دیں ورنہ استفتاء کی شکل میں لکھ کر مرکزی مدرسہ کو بھیجیں اور وہاں سے جو جواب آئے وہ فریقین کو جمع کر کے سنادیں

۱۲۔ حلقہ کے غیر مسلموں کے ساتھ بھی خصوصاً ایسا طرز عمل رکھیں کہ ان کی خیر خواہی امانت داری اور وفاتے عہد پر ان کو اعتماد ہو

۱۳۔ امام و متوذن کو باری باری سال میں کم سے کم دو دفعہ ایک ایک ہفتہ کے لئے مرکزی مدرسہ سگاہ کے لیے بزرگ کی خدمت میں رکھا جائے کہ جو شیخ و مرشد کی حیثیت رکھتے ہوں اور مکاتب تہذیبی و اخلاقی اصلاح کے لئے ایسے بزرگ سے برابر رکھیں کہ پیچھے میں دو دفعہ اپنے دینی و اخلاقی امراض کا حال لکھ کر ان کی تفسیر و علاج معلوم کر کے عمل کرتے رہیں۔

نئی تعلیم والوں کی اصلاح

ان کی حالت

سب سے دشوار و پیچیدہ معاملہ تو تعلیم یافتہوں کا یا جدید طرز کے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کی دینی حفاظت و اصلاح کا ہے موجودہ نظام تعلیم کے ماحول میں ان کی حالت کچھ ایسی قابلِ رحم ہو گئی ہے کہ سہ درمیانِ قہر و ریختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامنِ ترسکن ہوشیار باش کا معاملہ ہے ان کی کتابیں ان کے اساتذہ ان کے مکران ان کے رفقاء ان کے امتحان ان کے کھیل کوڈ ان کا طرزِ بود و ماند اور سب سے بڑھ کر ان کا وہی مذکورہ صدرِ اعلیٰ حیوانی زندگی کا نصب العین اور دانستہ یا نادانستہ ان غریبوں کا (الہام اشارت) خود اپنے یا انسان کے متعلق یہ تصورات کہ بس وہ حیوانی ارتقاء (ایولوشن) کے سلسلہ کا ایک نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ حیوان یا اعلیٰ درجہ کا جانور ہے اس لئے لازماً اعلیٰ درجہ کے کھانے پینے پہننے پہننے کی سعی و تدبیر کرتے کرتے مرجانے کے سوا ہماری زندگی کے اندر اور کوئی مقصد و معنویت نہیں!

اس لئے حضرت علیہ الرحمۃ کی تحقیق کا ماحصل تو اس جدید تعلیم کے بارے میں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا۔ یہ ہے کہ سرے سے اس گمندے تالاب میں کسی کو گوناوار گوناوی نہ چاہئے ورنہ پھر دامنِ بچانے کی فکر و فہمائش دہشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکتہ خود باید زد“ ہے کہ اپنا ہی سر بیٹھا چاہئے، یہ بھی اوپر ہی واضح ہو چکا کہ اس نظام تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا پیوند جہاں بھی لگایا گیا وہ پیوند خود اسی رنگ میں ڈوب گیا۔

نئی تعلیم تعلیم ہی نہیں

اصل یہ ہے کہ یہ تعلیم دراصل تعلیم ہی نہیں ہے، نہ اسکول و کالج اور یونیورسٹی تعلیم گاہیں ہیں زیادہ سے زیادہ کتاب خوانی یا بڑے لکھنے پڑھنے اور امتحان دینے کے اڈے ہیں۔ لہذا ان کارخانوں کا کتاب خوں جتنا زیادہ پڑھا لکھا علم حاصل ہوتا ہے اتنا ہی کم تعلیم یافتہ (illiterate) ہوتا ہے یہ فتویٰ راقمِ حق پر یا کسی مولوی ملا کا نہیں، بلکہ اسی تعلیم جدید کی برادری کے ایک بڑے نامور مہو وطن فرد فرید سہری دی راسن کا ہے جو نامور بھی سائنسدانی کے کمال میں ہیں جس کا رعب و سہیت ہمارے دل و دماغ پر تمام جدید علم سے بڑھ کر ہے یہ فتویٰ ابھی عین سطورِ نذر کی تحریر کے وقت بنگلور کی آنکس کے افتتاحی خطبہ میں صادر فرمایا۔ (پانیریکم جنوری ۱۹۵۷ء)

پڑھے لکھے جاہل

اس سے بڑھ کر کمال یافتوں کو حقیقی معنی میں ہے جو ہمارے حضرت پامال شو، یعنی خالہ کی بات یہ ہے کہ ان پڑھے لکھے "نا تعلیم" کی تدبیر بھی موصوف نے اسی رنگ کی بتائی ہے اور بار بار فرمایا کرتے تھے کہ "پیش مرد کامل بن کی کتابوں کی کافی نہیں جب تک کسی انسانِ کامل

جس کا

اس حدیث کی ترجمانی ہے کہ بعض علم یقیناً جاہل ہوتا ہے ان یا قرآن مجید کی تعبیر میں گدھے پر کتابوں کا بوجھ کم مثل الحمار

رہائے برو کتابیہ چند۔

سے موصوف کی

ترجمہ پڑھے لکھے

من الع

یحمل

کی صحبت میر نہ ہو، انسان تو انسان بننا ہے۔ اور حضرت نے کیا فرمایا۔ اسلامی تعلیم کا نصب العین تو اس کے اولین معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اولین متعلمین (صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے یہی ملتا ہے کہ اس کا مطلب کتاب خوانی یا لکھا پڑھا ہونا ہرگز نہ تھا بلکہ وہی کسی مردِ کامل کے سامنے پامال ہو کر کامل بننا۔ کتاب جو اعتبار سے تو خود حضورؐ اور اکثر صحابہؓ سرے سے امی یا ان پڑھ تھے۔

اسی کو سرِ راسخ نے ہمارے نا تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتوں کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ تعلیم نام ہے کسی اعلیٰ انسان سے تعلق کا۔ انفرادی زندگیوں تک میں سب سے زیادہ طاقتور تعلیمی اثر کسی طاقتور انسان سے تعلق ہی ہوتا ہے جو محض ذہنی اعتبار سے طاقتور نہیں بلکہ عظیم سیرت کا مالک ہوتا ہے اور زندگی کی سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

زندہ کتابوں کا مطالعہ

راقم ہذا صحبت و صحابیت کے اس اسلامی و مثالی اصولِ تعلیم کی رو سے ہمیشہ نئی و پرانی دینی و دنیوی تعلیم کے عزیز و دوست معلمین و متعلمین و منتظمین سب کی خدمت میں عرض کیا کرتا ہے کہ جب تک کاغذی کتابوں کے ساتھ اور ان سے زیادہ ایمان و عمل کی زندہ انسانی کتابوں کے مطالعہ کا انتظام نہ ہو گا۔ اس وقت تک نہ انسانیت پیدا ہو سکتی ہے نہ دین ہے۔

نہ کتابوں کے کالج سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا ایک کالج جس کے پرنسپل آج کل ایک پرانے دوست ہیں جو عمر بھر تعلیم اور تعلیمات ہی کے محکمہ کے مختلف تعلیمی و انتظامی خدمات میں رہے۔ انہوں نے طلباء کے ”کیریکیئر کی تعمیر“ کی تدبیر یہ نکالی ہے کہ مختلف اماموں کے نام سے کالج

کو مختلف ٹیوٹوریل ہاؤسز (تربیتی بیوت) میں تقسیم کر دیا ہے، مثلاً بیت علوی بیت حسنی، بیت حسینی وغیرہ اور ہر بیت کو کالج کے مختلف اساتذہ کی نگرانی میں دے کر یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ان حضرات ائمہ کی سیرت کو پیش نظر رکھ کر طلباء کی سیرت سازی فرمائیں گے، مگر ان بیوت کے قیام کے بعد بھی طلباء کی سیرت ملاحظہ ہو کہ قریب کے باغ میں گھس جاتے ہیں اور زبردستی امر و نہی توڑ کر کھا لیتے ہیں، دوکانداروں سے کھانے پینے کی چیزیں قرض لیتے ہیں اور ادا نہیں کرتے، راستہ گلی میں عورتوں کی تاک جھانک چھڑچھاڑ فقرے بازی تو گویا تعلیم جدید کے نوجوانوں کا لغز بھی جی ہے۔

ایک دن پرنسپل صاحب سے عرض کیا گیا کہ حضرت کتابی تعلیم کی طرح کتابی بیوت سازی یا حضرات ائمہ کی سیرت خالی پڑھنے پڑھانے سننے سنانے سے سیرت سازی نہیں ہوتی اس کی توقع ایک ہی تدمیر ہے کہ خود آپ اور آپ کے اساتذہ کی زندگی میں حضرات ائمہ کی پاک سیرت جلوہ گر ہو۔ اور آپ کی زبان سے زیادہ آپ کی زندگی اس سیرت کی ترجمان ہو۔

ورنہ پھر یہی ”پڑھے کھے جاہل“ جب ملک و سماج کی زندگی میں داخل ہوتے اور زندگی کی ذمہ داریاں ان کے سپرد ہوتی ہیں تو سب سے بڑی مصیبت اس دنیا کی زندگی اور ملک و سماج میں ان ہی کا وجود ہوتا ہے جس کا تماشا آج ہندوستان و پاکستان ہر جگہ دیکھا جا رہا ہے کہ حکومت کا کوئی انتظام کوئی تجویز کوئی قانون اس تعلیم جدید کے عمال و حکام سے لے کر وزرا تک کی بددیانتی، رشوت ستانی خود غرضی و پاسداری کی بدولت کامیاب نہیں ہونے پاتا۔

بددیانتی و رشوت ستانی کی روک تھام کے لئے مستقل محکمے قائم ہوتے ہیں لیکن بے نتیجہ اور کیوں نہ بے نتیجہ ہوں اس لئے کہ رشوت ستانی سے روکنے والے

غیر شوت ستاں کہاں سے آئیں۔ یہ تو حکومت کے اندر کا علاج روک ہے حکومت سے باہر جو شرفِ نسا ہے وہ انہیں ”نا تعلیم یافتہ پڑھے لکھے“ چھوٹے بڑے لیڈروں کی ذات سے برابر ہے، وہ کیا ان کے باہمی نفاق و شقاق اور عوام کو مال و جاہ کی ذاتی خود غرضیوں کا آلہ کار بنانے کے سوا کسی اور شے کا خمیازہ ہے۔ ہندوستان و پاکستان کا ذکر ہی کیا ساری دنیا جو جنگ و جدل کا اکھاڑ بن گئی ہے اور امن و سلامتی کی مجلس (سیکورٹی کونسل) تنگ میں اپنی خود غرضیوں اور پاسداروں کی راہ سے امن سوزی کی آگ کو جو بھڑکاتے اور پھیلاتے رہتے ہیں کیا وہ یہی اعلیٰ درجہ کے پڑھے لکھے جاہل نہیں ہیں۔

غرض گریبان میں سر ڈال کر ذرا سوچا اور دیکھا جائے تو پڑھی لکھی جاہلیتِ بدیدہ نے ساری دنیا کے حق میں ایسے قہر و عذاب کی شکل اختیار کر لی ہے کہ غریب ان پڑھ جاہلیتِ قدیمہ بھی اس کے آگے مارتا ہے!

خود نہ ان کی کتاب جس کا سر شجرہ علم و حکمت کامل و مطلق نامزد و دبے خطاب ہے اور جس کے اندر کسی کج و کج راہی یا گندہی نہیں جب مردِ کامل کے بغیر اس کی بھی نری کتابی تعلیم کافی نہیں تو ایسی کتابوں کا ذکر ہی کیا جو ناقص و محدود، پر خطا و پر نسیان علم کی سپیدار اور کجیوں اور کجراہیوں سے پُر ہیں۔ ان کی تعلیم تو اگر کسی درجہ اضطراب میں اختیار بھی کی جائے تو مردِ کامل کے ساتھ علمِ کامل کی کتابوں کی تعلیم اور بھی اہم و اقدم ہو جاتی ہے

بحالتِ موجودہ ان کی اصلاح کی ممکن صورت

یعنی جدید تعلیم کے ان ناقص اثرات کو دور کرنے کے لئے جن کی بناء پر اس کے پڑھے لکھوں کو خود اسی کے اکابر کی زبان سے ابھی نا تعلیم یافتہ سُن چکے ہو، ادا تو یہ ضروری ہے کہ اس کے اساتذہ و معلمین خود ان اثراتِ پاک اور تلامذہ و متعلمین کے لئے پاک

دپاکیزہ زندگی کا نمونہ ہوں، ثنائیاً ان مادی و معاشی علوم کے ساتھ روحانی و معادٰی یا
 دینی علوم کی تحصیل لازم اور بقدر ضرورت ان پر مقدم ہو، پہلی دونوں چیزیں یعنی اساتذہ
 و معلمین میں مطلوبہ بالا انقلاب و تبدیلی اور اس دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا لزوم
 یہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے ہاتھ میں یہ جدید نظام ہے اور جو خود اس کے اثرات
 سے ابھی اتنے مرعوب و مغلوب ہیں کہ ان سے کسی فوری انقلاب کے قبول کی امید نہیں
 البتہ عام مسلمانوں کو اس لادینی نظام تعلیم کے مضر اثرات اور ذریعہ ثمرات پر متنبہ
 کر کے آگے کے فتنہ کا بند باندھ دینا زیادہ دشوار نہ ہوگا اور اد پر جو دینی تعلیم کا نظام
 پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بھی کام لیا جائے کہ

۱۔ جب لوگ اپنی اس راعیانہ جوابدہی کو سمجھنے لگیں کہ جس طرح ان کے ذمہ اپنے
 اہل دعیال یا توابع کی دنیوی خبر گیری و خیر خواہی ہے اس سے بدرجہا بڑھ کر عقلاً و نقلاً
 دینی خبر گیری و خیر خواہی واجب ہے کیونکہ ایک طرف زیادہ سے زیادہ دنیا کا فانی و غیر
 یقینی بلکہ وہی ضرر ہے اور دوسری طرف آخرت کی ابدی و یقینی زندگی کا یقینی ضرر
 اس لئے اپنی اور اپنی اولاد اور توابع کی پوری پوری خیر خواہی تو یہ ہے کہ ایسے لادینی
 نظام تعلیم کی طرف قطعاً ان کو جانے ہی نہ دیں، انشاء اللہ بہت سے باہمت مومن اس
 ایانی ہمت پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔ اور حضرت علیہ الرحمۃ کی اصل رائے بھی ہے کہ
 جیسا کہ اد پر تعلیم انگریزی کی تحقیقی میں معلوم ہو چکا۔

۲۔ درنہ ایمان کا اقل قلیل تقاضا یہ ہے کہ لادینی اسکولوں اور کالجوں کے دروازہ
 میں قدم رکھنے سے پہلے دیندار معلمین کی نگرانی میں بقدر واجب دینی تعلیم پوری کرادی جائے
 یعنی وہی مذکورہ بالا مسجدی مکاتب کی بلکہ عربی کے کم از کم ابتدائی درجہ تک کی، اس کے
 علاوہ گھر پران کی پوری پوری دینی و عملی و اخلاقی نگرانی ہے۔ اور جدید تعلیم کے جدید
 اقامت خانوں میں تو ہرگز نہ ہرگز نہ سکھنے پائیں۔ نیز اپنے مکتب یا مدرسہ کے یا کسی اور

دیندار عالم سے ملاقات یا مکاتبت کا تعلق ان سے ضرور قائم رکھایا جائے۔

۲۔ ایک اور کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسے اقامت خانے زیادہ سے زیادہ قائم کئے جائیں جن کے مصارف قیام و طعام کم سے کم ہوں اور جن میں اچھے صالح دیندار نگرانوں کی نگرانی میں دینی تربیت کے ساتھ بقدر واجب و ضرورت دینی احکام کی تعلیم و تفہیم کا انتظام ہو جس کے لئے روزانہ آدھ گھنٹہ یا ہفتہ میں دو تین دن ایک ایک گھنٹہ کافی ہوگا اور ہر کے دن ایک گھنٹہ حضرت کے مواعظ میں سے مناسب و غلطوں کا سنتے رہنا۔ نیز بعض ایسی چیزیں بھی کبھی کبھی سنتے رہنا جن سے جدید عقلیت و عقلیات، سیاسیات و معاشیات کا وہی رعب و ہیبت رفع ہو مثلاً مولانا دریا بادی کے سچ اور صدق وغیرہ کے پرانے پرچوں کے مناسب مضامین و اقتباسات، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے مضامین سیرت خصوصاً خطبات مدراس، مولانا گیلانی رح کی خاتم النبیین۔ اور کاش کہ مولانا جو درس قرآن مجید حیدر آباد میں دیتے رہے ہیں اس کے کچھ ہی خاص خاص درس مرتب و شائع فرمادیتے تو وہ مولانا مودودی کے رسائل و مضامین، مولانا علی میاں کی تحریرات اور راقم الحرف کا رسالہ مذہب و عقلیات، اور سیرۃ النبیؐ (مطبوعہ دار المصنفین) میں شائع شدہ باب معجزات و فلسفہ جدیدہ، اور حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلہ تجدیدیات یعنی تجدید تعلیم و تبلیغ کے پیش نظر رسالہ کے علاوہ۔ تجدید تصوف و سلوک اور جامع المجددین اور تجدید قومیات و سیاسیات لے

۴۔ حضرت علیہ الرحمۃ اور مذکورہ بالا دیگر حضرات مصنفین کی کتابوں اور تحریرات کو یوں بھی جدید تعلیم کے اسکول و کالج کے طلباء اور تعلیم یافتہ مختلف طبقات میں جن جن طریقوں سے زیادہ سے زیادہ پڑھے پڑھائے جانے کی سعی ہو سکے انشاء اللہ کچھ نہ کچھ لادینی کے رہبر کا

لے جو کتابی صورت میں انشاء اللہ جلد شائع ہو جائے گی قومیات و سیاسیات حاضرہ، کے عنوان سے معارفِ شمسہ میں بصورتِ مضمون شائع بھی ہو چکا ہے۔

ضرور تریاق ہوگا۔ مثلاً جہاں جہاں خود ان اسکولوں کالجوں اور ان کے اقامت خانوں کے مطالعہ گھروں (ریڈنگ روم) میں ان کتابوں کو رکھایا جاسکے رکھایا جائے، اضلاع اور شہروں کے عام مطالعہ گھروں اور کلبوں میں رکھایا جائے۔ ضلعوں، شہروں، قصبوں میں ایسے مستقل مطالعہ گھر کھولے جائیں جن میں ان کتابوں کے علاوہ بعض اچھے رسائل صدق معارف، الفرقان، تعمیر الکھنؤ، ترجمان القرآن، فادان، کراچی، جاری ہوں اور محض ترقی بیچارہ کے طور پر دو ایک روزانہ اخبارات بھی جو کچھ غنیمت ہوں۔ گو اخبارات میں خیر و صدق پر شر و کذب اتنا غالب ہوتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ نسبتاً غنیمت بھی کس کو کہا جائے۔

۵۔ اگر جدید ذہنیت کے مسائل و مطالبات سے آگاہ و مانوس اور ان کے مفاسد کی فہم و اصلاح کی صلاحیت کے ساتھ ان کو مخاطب کرنے والے کچھ مقرر یا داغظ میسر ہوں تو گشت امد دوروں کے ذریعہ اسکولوں اور کالجوں کے اندر یا باہر بلا بحث و مناظرہ کے محض خطاب و اسماع کا کچھ موقع ان کو مل سکے تو اس سے کام لینا بھی انشاء اللہ نافع ہوگا لیکن خود ان حضرات مقررین کا ایمان و عمل اخلاق و اخلاص کے اعتبار سے صالح ہونا اور کسی طرح کی باہ و مال کی طلب سے محتاط ہونا مقدم ہے۔

نظام اصلاح کی رُوح

اور ان پر کیا موقوف اس سارے نظام اصلاح کی جان و روح یہی ہے کہ اس کے سارے خدام و کارکن (اساتذہ و معلمین، ائمہ و موزنین، مبلغین و واعظین، خود ایمان سے و عمل ظاہر و باطن، صورت و سیرت تو واضح و خدمت، اخلاص و ایثار کا نمونہ ہوں اس لئے ضروری ہے کہ جو حضرات تعلیم و تبلیغ کسی قسم کی اصلاحی خدمت کے براہ راست خادم ہوں ان سے نظام کی مالی ذمہ داریوں کے آمد و خرچ دونوں کا قطعاً کوئی تعلق نہ ہو نہ اپنے طلقہ تعلیم و اصلاح کے لوگوں سے کسی طرح کے لین دین کے مالی معاملات رکھیں اس طرح کے

عام دیا اور دعوتوں تک کو قبول نہ کری جیسی کہ بالعموم ائمہ متوذنین یا علماء دوا عظیمین کی رسمًا لوگ کیا کرتے ہیں۔ جب تک کسی کے خاص خلوص و تعلق کا اطمینان نہ ہو۔

اس نظام کی مالی ذمہ داری تمام تر براہ راست اہل مال پر یا ایسے عام چندوں پر جن میں حضرت کے ہدایت فرمودہ اصول کے موافق دینے والوں کی رضائے حق و طیب خاطر کا پورا التزام ہو۔ یعنی کسی طرح کے بواسطہ یا بلاواسطہ دباؤ یا اثر سے وصول نہ کئے جائیں لہٰذا ایسے فوری پوش اور جذبات کے تحت جس میں دینے والوں کو عاقبت اندیشی کا ہوش نہیں رہتا۔ اور دینے کے بعد پچھتاتے ہیں یا اس کی بدولت حقوقِ داہرہ کی ادائی میں قصور کو تا ہی واقع ہوتی ہے۔ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ خطاب عام پہلے تحریری یا تقریری اشتہار و اعلان کے ذریعہ ضرورت کی اطلاع کر دیجائے، مقدار کی کمی زیادتی سے زیادہ نظر معطی کے اخلاص و ولایت پر ہو، مخلص غریب کے دچار پیسوں کو بھی امراء کے ہزاروں سے کم قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے

مسجد و مکتب کے مصارف زیادہ تر اس کے حلقہ و محلہ ہی سے پورے

لے خود حضرت علیہ الرحمۃ کو اس کا میں درجہ لحاظ تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کرو جو حضرت کے ایک ملفوظ میں منقول ہے کہ ایک شخص پانی پت کے علاقہ کے یہاں دھنا بھون، آئے، پندرہ روپیہ دینے مدرسہ میں۔ مجھ کو شبہ ہوا کہ قریب کا مدرسہ چھوڑ کر دھنا بھون روپیہ کیوں لائے۔ باوجود اس کے کہ وہ مرید تھے مگر مجھ کو شبہ ہو گیا وجہ دریافت کی تو کچھ لگے کوئی وجہ نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ تم اس لئے یہاں لائے ہو کہ میری خوش ہوں گے اور مدرسہ کا بھی نفع ہو جائے گا۔ کچھ لگے واقعی بالکل صحیح ہے، تب میں نے روپیہ واپس کیا۔ اور کہا کہ یہ تو ایک قسم کا شرک ہے کہ دین کا کام رضائے خلق کے لئے کیا جاتے۔

(الانفاضات الیومیہ حصہ چہارم ص ۷۷)

ہو سکیں تو بہتر ہے لیکن انتظام اس کی بھی آمد و صرف کا مساجد کے ائمہ و موزنین سے بالکل نہ ہو بلکہ مرکزی ادارہ سے یا اسی محلہ کے کسی دیندار امین و معتمد شخص یا جماعت سے ائمہ و موزنین، معلمین و مبلغین ظاہر یا باطن کے ایسے اغنیاء یا متوکلین تو کم ہی ملیں گے جو بالکل لبرال و بے انتہا اپنی خدمات ادا کریں۔ تاہم جہاں کہیں دو ایک جو کچھ میسر آجائیں ان کو خصوصیت سے اس نظام کے لئے خیر و برکت کا باعث جانا چاہئے باقی معمولاً اس نظام کے خادمان دین میں انہیں کو قبول کیا جائے جو معاوضہ یا تنخواہ کی بجائے نفقات کی صورت کو قبول فرمائیں، جو ان کی خدمت کی نہ ہو گی بلکہ ان کے جس وقت کی بناء پر ان کی ذاتی و خانگی ضروریات کی ان کی ضرورت اور ادارہ کی وسعت کے بقدر کفالت ہو گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی حیثیت و استطاعت کے موافق اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا کفیل ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر کبھی کسی وجہ سے آمدنی میں کمی ہو تو ان خدام کو اپنے نفقات میں بھی اسی طرح کمی کے لئے تیار رہنا چاہئے جس طرح باپ کی آمدنی کی کمی کی صورت میں اس کے بال بچے تیار رہتے ہیں۔ نیز محض

۱۔ ایک بڑی آسان صورت اس مضمون کو ملاحظہ فرما کر ہمارے اشرف المدارس (جس کا ذکر خیر پہلے بھی گذر چکا ہے) کے حضرت مولانا ابراہیم صاحب نے اپنے تازہ تجربہ کی یہ بتلائی کہ بعض جگہ تبرہ دلانے پر لوگوں نے مقامی مکتب قائم کرنا چاہا تو چندہ کے لئے چٹکی کا ایک چھلا مولانا نے یہ تجویز فرمادیا کہ دروازہ کھانا پکاتے وقت محلہ کا ہر شخص ایک چٹکی اٹا اس کے لئے نکال دیا کرے۔ چنانچہ پہلے ہی مہینہ میں اس بستی یا محلہ سے ۳۵ ہزار چٹکی کے چھلے جمع ہو گئے۔

دو۔ اسی گھر میں رعزائے جو جس کہنی ہے اس میں سے ایک چٹکی یا جو روپہ بھنایا جائے اس میں سے ایک دو پیسے نکال دینا کتنا آسان ہے اور اس سے کتنا بڑا کام نکل سکتا ہے بس خطرہ ارادہ کرنا ہے پھر حق تعالیٰ خود ہی کام آسان فرمائیے ہیں۔

اس نفقہ میں قابل تحمل کمی و تنگی کی وجہ سے اس خدمت کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پسند نہ کریں۔ نفقہ کی مقدار کا تعین بھی خادم کے مرتبہ فضل و کمال کی بنا پر نہ ہوگا کیونکہ یہ اس کے فضل و کمال کی قیمت نہیں بلکہ خادم کی ضرورت و حیثیت کی بناء پر ہو۔ مثلاً کوئی مدرس مجبور یا اتنا خوشحال ہے کہ اہل و عیال کے مصارف اس کی حیثیت کے موافق گھر سے پورے ہو جاتے ہیں اور صرف اپنے ذاتی مصارف کا محاسبہ ہی تو خواہ علم و فضل میں زیادہ ہو لیکن اس کا نفقہ اس کم علم و فضل سے کم ہوگا جو مجبور نہیں یا صاحب اہل و عیال ہو کر گھر کا اتنا خوشحال نہیں جس قدر علیٰ ہذا

ضمیمہ

ایک بڑا فرض کفایہ

دوہری ذمہ داری

یہ بات بار بار یاد دلانے اور یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں پر اپنی ہی نہیں ساری دین کی صلاح و فلاح کی دھری ذمہ داری ہے البتہ دوسری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی پہلی شرط خود مسلمانوں کا قومی و اجتماعی اعتبار سے من حیث الامت "خیر امت" یعنی بہترین قوم بنانا اور ہونا ہے کہ تم خیر امت اخذت للناس کم و بیش ساری برائیاں اور گمراہیاں افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں سے پیدا ہوتی ہیں اسی لئے دوسری جگہ "خیر امت" کے مفہوم کو امت و سطا کے عنوان سے واضح فرمایا گیا کہ "ہم نے تم کو ایک با اعتدال امت بنایا ہے، تاکہ تم (اسلام کی) با اعتدال زندگی یا صراط مستقیم کے حق میں، سارے انسانوں پر گواہ (یا ان کے لئے نمونہ بنو اور رسول تمہارے اور گواہ ہوں" یعنی تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدم بقدم جلوہ اور ساری دنیا تمہارے قدم بقدم ہو۔

غرض اس قرآنی تعلیم و منطق کی رو سے نہ فقط مسلمانوں بلکہ سارے انسانوں کی غیر دہتری اسی میں منحصر ہے کہ مسلمان انفرادی ہی نہیں اجتماعی حیثیت سے بہترین

لہذا کذا لك جعلنا كما ملة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا ۱ (پہلے البقرة)

قوم و امت اور اپنی فکری و عقلی زندگی میں اسلام کے ایمان و عمل صالح کی زندہ دوسرا پگاڑا ہی (شہادۃ علی الناس) ہوں۔

اور اقبالا میں مسلمانوں کی اجتماعی تعلیم و تبلیغ کے اصول و فروع سے متعلق خالص اسلامی نظر سے جو تبدیلیات و اصلاحات اور ان کے تحت نظام کار کا خاکہ جو انقلاب علم و نام کے نام سے پیش کیا گیا ہے وہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی دیگر ابواب دین میں تجدیدی و اصلاحی جامعیت ہی کی طرح ایسا جامع و ہمہ گیر ہے کہ اگر وقتی و مقامی تقاضوں کے پیش نظر تھوڑے بہت تغیر و ترمیم کے ساتھ اس کو عمل میں لایا جائے تو انشاء اللہ امت مسلمہ کے کسی طبقہ کی اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ رہ جائے گا کہ مسلمان قرآنی معیار کے مطابق خیر و امۃ و دامت و سط، اور شہدائے علی الناس، کے مقام پر از سر نو کھڑے ہو کر گم کردہ راہ دنیا کے لئے نشان راہ نہ بن سکیں۔

اسلام پر شبہات کا ازالہ

شہادۃ علی الناس کے اس حال کے بعد نہرے قال کا صرف ایک فرض زیادہ توجہ کا محتاج رہ جاتا ہے، دوسری قوموں کی طرف سے عقلی و فکری، سیاسی و معاشی اخلاقی و معاشرتی، تہذیبی و تمدنی کسی پہلو سے اسلامی تعلیمات پر جو خلوک و شبہات ظاہر کئے جائیں ان کو تحریر و تقریر سے دور کیا جائے اس سے معاذین پر حجت قائم ہوگی اور حق پسندوں کو یہ خلوک قبول حق میں مانع نہ رہیں گے۔ اس خدمت کے لئے فرض کفایہ کے درجہ میں ایک ایسی جماعت کا مسلمانوں میں موجود رہنا ضروری ہے جو غیر مسلموں کے ایسے علوم و فنون، افکار و نظریات سے اچھی طرح واقف ہوں، جن کا اسلامی عقائد

داعمال، اصول و فروع پر نفیاً یا اثباتاً کسی طرح اثر پڑتا ہو، تاکہ ان کی تردید یا ان سے تائید کا کام لے۔ ہمارے قدیم متکلمین بھی خدمت انجام دیتے تھے۔

عہد حاضر میں بھی اس خدمت کے لئے حضرت مجدد کار شاد ہے کہ کچھ وہ لوگ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر کچھ شبہ ہو یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو (جیسے نو تعلیم یافتہ یا انگریزی دان مسلمان) یا سرے سے غیر مسلم ہو۔ اس طرح دوسری قوموں کے شبہات سے اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے اس سے بچانے کو حضرت نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

آج یہ فرض اس میں شک نہیں کہ بہت بڑا فرض کفایہ ہے، فرنگی سائنس و فلسفہ علوم و فنون، تہذیب و تمدن و سیاسیات و معاشیات کی راہ سے جو شکوک و اعتراضات راہ پا گئے ہیں اور پاتے رہتے ہیں، یورپ کے حاکمانہ و سیاسی غلبہ کی معروبیت اور نئی سائنسی ایجادات و اکتشافات کی ہیبت نے ان کے ذہن کو خصوصاً بہت تیز کر دیا ہے، جدید تعلیم کے اثر سے یہ ذہن تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کرتا ہے پھر سیاسی و ہتھیاری قیادت چونکہ ساری دنیا میں اسی طبقہ کے ہاتھ میں آگئی ہے اس لئے قدرۃ دیگر طبقات حتیٰ کہ خاندانی علماء و مشائخ اور خالص دینی درگاہوں کے طلباء و اساتذہ تک اس تعدیہ سے محفوظ نہیں۔

کفر از کعبہ

دنیا پر یورپ کی براہ راست سیاسی گرفت تو خود یورپ ہی کی آموختہ سیاسی تعلیمات کی بدولت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کی سیاسیات و معاشیات

تہذیب و تمدن، علوم و فنون کے لادینی تصورات و افکار کا زور وہاں بھی روز افزوں ہے جہاں براہِ راست حاکمانہ و سیاسی اقتدار ایک دن بھی نہیں رہا۔ کم و بیش سارے عربی ممالک اس مغرب زدگی میں ہم عجیبوں سے بھی بازی رہے گئے۔ خصوصاً ان کے حکمران و سربراہانِ طبقہ، زبان پر لاتے دل کا نیتا ہے کہ یہ سیلاب اب بلد الحرام کی دیواروں تک سے ٹکرا رہا ہے، حدیث کہ بدہ و طائف میں انگریزی تعلیم کے مدرسے کھول کر آنے والی نسلوں کے عوام و خواص سب کے لئے کفر و الحاد کے دروازے کعبۃ اللہ کی اس حکومت کے اندر کھول دیئے گئے ہیں جو ادنیٰ ادنیٰ بدعات کی بھی رد و ادھر نہیں سمجھی جاتی۔ ”چو کفر از کعبہ بر خیزد“ کی شاعری و مجاز نے اس سے بڑھ کر واقعہ و حقیقت کا لباس کیوں کبھی پہنا ہوگا!

یونانی اور فرنگی شبہات میں فرق

کچھ ایسی ہی صورت ہے جیسی کہ یونانی فلسفہ و حکمت سے مرعوبیت نے مسلمانوں کی سیاسی و اقتداری قوت و سطوت کے عین شباب میں ایک تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر قبضہ پالیا تھا لیکن اس وقت اول تو اس طبقہ کے ہاتھ میں عام مسلمانوں کی قیادت و حکومت نہ تھی۔ دوسرے یونانی فلسفیات سے پیدا ہونے والے ٹھکوک و شبہات زیادہ تر عقائد کے دقیق مسائل تک محدود تھے، سیاسیات و معاشیات، تہذیب و تمدن جن کا اثر عوام و خواص کے سارے طبقات پر پڑتا ہے ان کے بھیس میں لادینی نظریات و تصورات کی دعوت و اشاعت نہ ہوتی تھی۔

آج ذہن پہلے انہیں راستوں سے مسموم ہوتا اور بالآخر غیر شعوری طور پر ایمان و عمل سب کو لے ڈوبتا ہے، یونانیات کے مقابلہ میں اگر ہمارے علماء و متکلمین کو زیادہ تر صرف ایمانیات کے ایک محاذ کا سامنا تھا تو آج انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی

تدنی و ثقافتی غرض زندگی کے ہر پہ محاذ پر مسلح ہونے اور پہننے کی ضرورت ہے

ندوہ کا فضل تقدم

اس ضرورت کا احساس پہلے پہل اکابر ندوہ نے فرمایا اور ایک مستقل درگاہ دارالعلوم کا قیام زیادہ تر اسی غرض سے عمل میں آیا۔ لیکن ایک طرف تو جدید علوم و فنون کی باقاعدہ تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوا۔ سارا سرمایہ سنی سنائی اخباری بائیس یا جدید معلومات کی کچھ معمولی مصری کتابیں رہیں۔ باضابطہ درس میں فرسودہ یونانیات ہی کا پرخرچہ چلتا رہا۔ دوسری طرف نری زبان کی مذہب کچھ انگریزی لازم کر دی گئی جس کے حال و حال دونوں میں اٹھے فرنگی رجحانات کو مدد ملی نیز دنیا طلبی کا ایک ارزاں راستہ اس دینی درگاہ سے ہو کر بھی نکل گیا۔ یعنی ندوہ کے طلباء بلکہ فارغ التحصیل علماء تک طلب دنیا میں انگریزی اسکولوں، کالجوں کے طالب علم بننے لگے۔

ان کو تالیفوں اور تحریکوں کے بلوجود فرنگی تعلیم کے آوردہ شبہات اور ان سے متاثرہ طبقات کو مخاطب و متاثر کرنے کی سب سے زیادہ سعادت مدارس دینیہ میں ندویوں ہی کے حصہ میں آئی۔ ان کے قلم نے خصوصاً نئی تعلیم کے مختلف طبقات میں خاص قبول و اعتماد حاصل کیا۔ دارالمصنفین کا سارا کارنامہ ندوی برادری ہی کا سرچونہ قلم ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ندوہ کی زمین اس مقصد کے لئے صالح یقیناً بہت ہے لیکن استاد محترم علامہ شبلی نعمانی ح کے بعد پیر توڑ کر، پھر کوئی نہ بیٹھا کہ یکسوئی کے ساتھ اس صلاحیت کو ترقی دینے کی فکر و تدبیر کرتا رہا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کی بجائے بظاہر ندوہ کی اس خصوصیت کا بھی اب خاتمہ ہے اور حضرت سید صاحب مولانا

لے اب تو کس پہر ہی کی نوبت یہاں تک ہے کہ مہتمم پورے وقت کا میر نہیں مہینہ میں صرف ۵ دن کے لئے مستقل مہتمم کا اہتمام رہتا ہے۔

سید سلیمان کی عملی علیحدگی نے دار المصنفین کو بھی بے جان کر دیا ہے۔

لادینی روگ دینی ادارات میں

قومی و سیاسی رنگ کی لادینی رائج الوقت خدمات کا ایک بڑا روگ دینی خدمات و ادارات میں بھی یہ پھیل گیا ہے کہ اپنی قوت فرصت اور صلاحیت کا لحاظ فرمائے بغیر اکثر حضرات کئی کئی ذمہ داریوں کو قبول فرما لیتے ہیں، لادینی کاموں میں مقصود اولاً تو کام سے زیادہ نام ہوتا ہے اور کام جو کچھ ہوتا بھی ہے زیادہ تر دنیوی اغراض سے بخلاف دینی کاموں کے کہ ان کی اصل غرض اخروی اجر اور رضائے حق ہے۔ اگر کسی ایک ہی کام کے حقوق کی کما حقہ ادائیگی میں ساری زندگی لگ اور ختم ہو جائے تو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا اور اجر آخرت کی اس سے زیادہ امید کی جاسکتی ہے جتنی کئی کئی ذمہ داریوں کے ناقص طور پر ادا کرنے سے، بلکہ الٹے مواخذہ کا اندیشہ ہے ہمارے اجتماعی کاموں میں ناکامیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ تن من و جن کی لگن کے ساتھ لگ جانے والا کوئی ایک فرد بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

دو ضروری باتوں کا انتظام

ندوہ یا اور جو ادارہ بھی اس فرض کفایہ کا حق کما حقہ ادا کرنے کی طرف متوجہ ہو دو باتوں کا انتظام از بس ضروری ہے۔ اول و اقدم تعلیم کے ساتھ ایسی دینی تربیت کا اہتمام ہے کہ ایمان و عمل، صورت و سیرت، ظاہر و باطن ہر اعتبار سے اس خدمت کے خدام اسلامیت کی نمائندگی یا شہادت علی الناس کا جاذب و معیاری نمونہ ہوں۔ عمل میں خالق کے ساتھ مخلوق کے حقوق یا اسلامی معاملات و معاشرت کی نگہداشت اسلام کو سب سے زیادہ پرکشش بناتی ہے سیرت کے

ساتھ وضع و صورت کا معاملہ بھی حقیقہ و خفیف ہرگز نہیں خاص کر اس جماعت کے لئے جو غیروں یا مخالفوں کے دل و دماغ سے اسلام کے متعلق ایمانی و عملی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو نکالنے کا فرض پورا کرنا چاہتی ہے، اپنے پرانے سب کا سابقہ عقائد و عبادات سے پہلے معاشرت و معاملات ہی سے پڑتا ہے اور سب کی نظر باطن و سیرت سے پہلے ظاہر صورت کو دیکھتی ہے آدمی سن کر کم اور دیکھ کر زیادہ قبول کرتا ہے۔

دوسرا کام جدید چیزوں کی مستند و منضبط تعلیم ہے، جامعہ عثمانیہ کی بدولت جدید علوم و فنون کی ضروری و مقبر کتابیں خود اردو میں منتقل ہو گئی ہیں ان میں سے پیش نظر مقصد کے مناسب چیزوں کو قدیم معقولات کی جگہ باقاعدہ نصاب میں شریک کر دینا کافی ہو گا۔

سائنس کی عملی تعلیم درکار نہیں البتہ سائنس کا فلسفہ و مذہب سے فرق و تعلق اس کی تحقیق و رسائی کی تجدید، طبیعیات، حیاتیات، فلکیات وغیرہ کے خاص خاص ایسے نظریات و معلومات جن کا مذہب پر سلبی و ایجابی کوئی اثر پڑتا ہو، مثلاً مادہ کی ساخت و نوعیت، حیات کی حقیقت و ماہیت، ارتقاء و اضافیت وغیرہ کی محض نظری تفہیم و تشریح جدید فلسفہ خصوصاً تصورات (ایڈیلزم) اور علمیات (ایسٹمالوجی) کے

سے ندوی طلباء و علماء میں تو بعض اثرات و ردایات کی بدولت اعمال ہی نہیں عقائد تک میں ایسی سستی آگئی تھی کہ دوسروں کو کیا جیتی بچتے؟ الحمد للہ کہ اب اس آزادی و روشن خیالی کا دور دورہ نہیں رہا۔ عمل کی آزادی میں بھی کمی ہے مگر بس کی کمی ہی۔ درجہ صورت و سیرت اخلاق و عادات معاملات و معاشرت میں خمیوامة اور شہداء اعلیٰ اناس کی شان و کشش کا کوسوں اب بھی پتہ نہیں حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی بالکل اختیاری اور موٹی موٹی باتوں تک کی طرف اعتنا نہیں۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مباحث سے پوری واقفیت ضروری ہے مقدمہ فلسفہ (انٹراڈکشن ٹو فلاسفی) مسائل فلسفہ (پرابلس آف فلاسفی) اور تاریخ فلسفہ کی ایک ایک کتاب کافی ہوگی۔ اخلاقیات و نفسیات کی بھی ایک ہی ایک کتاب یہ چیزیں تو مذہب کے زیادہ تر اصول و قریبی مسائل کے لئے کارآمد ہونگی خود مذہبی مسائل کے لئے فلسفہ مذہب و نفسیات مذہب وغیرہ کے عنوان کی چیزوں کا مطالعہ۔

مادیانہ سطحیت

کے اندر نے دور حاضر کے انسان کو ایسا خود راہِ اموش بنا دیا ہے کہ اپنی انسانی فطرت کے سائے اعلیٰ و عمیق باطنی مسائل و مطالبات کو بھلا کر (نَسُوا اللہَ فَانْسَاهُمْ اَنَّهُمْ اَنْفُسُهُمْ) معاشیات و سیاسیات کے بالکل باطنی مقاصد و مطلوبات میں کھو گیا ہے اپنی عمیق فطرت کی تشنگی کو زیادہ سے زیادہ بس بے معنی دے مقصد تہذیب و تمدن یا ثقافت کے سراب پہلا تا رہتا ہے۔ اس سطحیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مذہب جس کی بنیاد ہی تمام تر باطنی فطرت کے عمیق و اعلیٰ عقائد و ایمانیات پر تھی اس کو بھی اب

(بقیہ ادھر گزشتہ)

سے WALTER GRIEYSON اور N.W. SULLIVAN کا مرتبہ مجموعہ

OUTLINE OF MODERN BALIAF خاکہ فکر جدید ہمارے مطلب کے لئے بڑی حد تک تازہ ترین

دلیٹ، اور نسبتاً سہل ترین ہے ہر علم کے مستند اربابِ قلم کے نوشتہ ۷۲ سالوں پر مشتمل ہے اگر اس کے

مزدوری حصوں کا ترجمہ ہو جائے تو کیا کہنا۔ اصل بھی دیتا ہو سکے تو استاد کے پیش نظر ہے

سے راقم احقر کی نظر میں پاکستان کی مقدمہ فلسفہ و مسائل فلسفہ اور دیگر کی تاریخ فلسفہ زیادہ

موزوں ہوگی۔ یہ جامعہ عثمانیہ سے شائع ہو چکی ہیں۔

معاشی و سیاسی لطئیات و سطحیات ہی کی میزان پر تولایا نام نہاد ثقافتی فیتہ سے ناپا جاتا ہے اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ان بطنی و سطحی علوم کے اہم و اصولی مباحث کی بھی کچھ نہ کچھ کتابیں درس و مطالعہ میں شریک رہیں۔

ذرا اچھے ذہن و فہم کے طلباء ان چیزوں کو خود اپنے ذاتی مطالعہ سے بھی بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں۔ یا استاد کی معمولی رہنمائی کافی ہوگی بہت اچھے استاد کی سب سے زیادہ تاخت سائنسی نظریات کی فہم و تفہیم کے لئے ہوگی۔ خصوصاً جس کی نظر ان نظریات پر ذرا فلسفیانہ ہو اور خود بھی کچھ صاحب فکر ہو۔

قدیم محقولات

منطق، فلسفہ و کلام کا صرف اس قدر جز شریک نصاب رہنا مناسب ہو گا کہ ان کے مسائل اور اصطلاحات و تعبیرات سے ذہن مالوس ہو جائے۔ اولاً تو خود ہمارے دینی علوم تفسیر، حدیث و فقہ میں ان تعبیرات و اصطلاحات سے تقاضائے وقت کی بناء پر اسی طرح کام لیا گیا تھا جس طرح آج رائج الوقت اصطلاحات و تعبیرات سے دینی مضامین میں بے تکلف لایا جاتا ہے۔ اور جن سے بالکل نا آشنا رہ کر اسلاف کے ان خاص و خالص دینی کارناموں سے بھی پوری طرح استفادہ دشوار ہے، دوسرے راقم ہذا کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان سے ذہن کی تشحیذ و تربیت کا نفع خاصا ہوتا ہے ایسا نفع کہ خود جدید خیالات و عقلیات کی فہم و تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے بالخصوص قدیم علم کلام کے اصول و مبادی سے تو آج جدید کلام کی تدوین کا بڑا کام لیا جاسکتا ہے جس کا اندازہ خود حضرت حکیم الامت رحمہ کے مختصر رسالہ الا نشاہات المفیدۃ عن الا شتباہات الجدیدۃ پر اس گفتگو سے کیا جاسکتا ہے جو جامع المجددین (مؤلفہ احقر) ص ۱۱۳ تا ۱۱۴ میں ملے گی لے

لے دارالعلوم ندوۃ کی عمارت نو ساخت میں تو غضب ہوا کیا گیا کہ فلسفہ قدیم تو غیر علم کلام تک کو بالکل نصاب بدر کر دیا گیا

انگریزی کا لزوم

سائے طلباء کے لئے غیر ضروری بھی ہے اور مقررہ سال بھی التبتجہ طلباء کی طبیعت و تربیت سے خود اپنے ایمان و عمل میں رسوخ اور صدق و صلاح کے آثار نمایاں ہوں ساتھ ہی مذکورہ بالا جدید علوم میں سے کسی بھی ذوق و مناسبت معلوم ہو اور اس کے ذریعہ دین کی تحریری یا تقریری خدمت کی توقع ہو ان کے لئے ضروری علوم دین سے فراغت کے بعد مستقلاً بقدر ضرورت انگریزی کی تحصیل کا انتظام ضرور ہوتا کہ ان کا سرمایہ معلومات ترجموں کی حد تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ خصوصاً آج کل علوم و فنون میں تازہ بہ تازہ نوبہ نو (لیسٹ) کا عارضہ ایسا لاحق ہو گیا ہے کہ فیشن کی طرح نظریات و معلومات بھی جلد طبع بدلتے اور فرسودہ (آؤٹ آف ڈیٹ) ہوتے پڑتے ہیں علوم جدیدہ اور انگریزی کی تعلیم کا جوڑ علوم دین کے ساتھ خوب سوچ سمجھ کر اس حساب سے لگانا چاہئے کہ ان کا اضافہ دینی علوم فقہ و حدیث و تفسیر میں کمی و خامی کا باعث ہو کر نہ ہونے پائے بلکہ زیادہ بہتر صورت یہی ہوگی کہ علوم جدیدہ اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام صرف خاص خاص طلباء کے لئے علوم دینیہ سے فراغ کے بعد بالکل علیحدہ اور مستقلاً دو تین سال کے لئے ہو۔

خالص عربی ادب

پر بھی ضرورت سے زیادہ زور دینا غلو سے خالی نہیں جب تک عام عربی لغت کی گوناگوں چھوٹی بڑی کثیر کتابیں اور خاص قرآن و حدیث کی لغات تفسیروں اور تشریحوں کے عظیم الشان ذخیرے موجود نہ تھے اس وقت تک بیشک قرآن و حدیث کے معانی و مطالب کی فہم و تحقیق کے لئے خود عربی نظم و نثر خصوصاً کلام جاہلیت پر اطلاع و عبور

کی حاجت تھی۔ لیکن آج ایک لسان العرب ہی کی موجودگی میں کون بڑا سے بڑا ادیب بھی قرآن و حدیث کو سب سے متعلقہ و محاسن سے سمجھنے کا محتاج ہے یا کسی لفظ و لغت کے لئے ایک نظر میں لسان العرب کے لسانی و لغوی تحقیق کا جتنا مواد ہاتھ آتا ہے وہ کسی حماسہ و ہمدانی خواں کے دماغ میں محفوظ رہ سکتا ہے اسلاف کے ان کارناموں کے طفیل میں اب تو الحمد للہ بس اتنی قابلیت درکار ہے کہ طالب العلم لغت کی کتابوں اور قرآن شریف و حدیث شریف کی تفسیروں اور شروح کی عبارت بے تکلف سمجھ لے جس کے لئے خود ان کتابوں اور ان کی شروح کا زیادہ سے زیادہ پڑھنا پڑھانا ہی زیادہ نافع ہوتا ہے

ہاں تحریر و تقریر کے لئے نفس ادب کی ضرورت بڑی حد تک مسلم ہے وہ بھی قدیم سے زیادہ جدید کی۔ اور اس کا مدار کتابی تعلیم و تعلیم سے عملی مشق و تمرین پر ہے۔ پھر عربی تحریر و تقریر خاص عربی ممالک سے باہر کام ہی کہاں اور کس دینی خدمت کے لئے آسکتی ہے سو اس کے کہ خود عربی ممالک میں جا کر وہیں کے لئے کوئی خاص تقریری و تحریری خدمت مقصود ہو تو ایسی استثنائی ضرورت کے لئے انتظام بھی استثنائی ہی مناسب ہوگا تاکہ عام نصاب تعلیم میں اس کے زیادہ وقت گھیر لینے سے مستقل و مقدم دینی علوم میں خلل و کوتاہی واقع نہ ہو۔ غرض "ادب برائے ادب" بھی عہد حاضر کی عبت کاریوں میں سے ایک عبت کام ہے جو نہ دین میں مقصود بالذات اور نہ مقدمہ مقصود ہونے کی حیثیت سے نفس دینی علوم یا ایسے عصری علوم کی تعلیم پر مقدم جن سے مقصود جدید و عصری علوم و افکار کے مقابلہ میں دینی عقائد و احکام کی تائید و توثیق یا ان سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا ازالہ و استیصال ہے

تقریر و تحریر کی قوت و قدرت بھی ہمارے علمائے دین کو جس زبان میں حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت و اہمیت ہے وہ انگریزی ہی ہے اس کے واسطے سے خود ان دلوں و دماغوں تک پہنچا جاسکتا ہے جو دشمن دین و سادس و افکار کا رستہ حشر اور

فساد کی بڑہیں مگر بھولنا نہ چاہئے کہ نری چرب زبانی اور انشاپردازی کا نہ انہوں پر زیادہ جادو چلتا ہے نہ غیروں پر، اصلاح و تبلیغ کے خادموں کا خود معتد بہ درجہ تک ایمان و عمل، ظاہر و باطن سے اسلام کی فکری و عملی برتری کا گواہ ہونا بہر صورت اہم و اقدم ہے۔ سدوہ کا نام، ذاتی و قلبی تعلق کے ماسوا ان معروضات کے ضمن میں بالخصوص زبان پر اس لئے آگیا کہ دین کے اس ایک بڑے فرض کی طیف کی طرف توجہ کا فضل و تقدم اسی کو حاصل ہے اور ناقص و نامتہم انتظام کے باوجود کچھ نہ کچھ کام اس راہ کا ہوا بھی جس کے تجربات و روایات کی موجودگی میں آسانی کے ساتھ از سر نو بہتر انتظام و اہتمام سے بہتر نتائج و ثمرات کی توقع بیجا نہ ہوگی۔

دفعت اللہ لما یحب ویرضی

اے گو اس وقت زام کارجن ہاتھوں میں ہے ان کی قوت و خدمت کی اصل بلکہ تمام تر مصروفیت خود عام مسلمانوں میں ایمان و یقین کو قوی و بیدار کرنے کی ایک مستقل جامعہ تحریک ہے یہ خدمت خصوصاً اس پر آشوب مہم میں جس اہمیت و وسعت کی متقاضی ہے اس کی بنا پر اس کے خادموں کو کسی دوسری طرف نظر اٹھانے کی بھی قطعاً مہلت نہ ملنی چاہئے چہ جائیکہ کسی دوسری مستقل خدمت کی مستقل ذمہ داری کہیں یہ کام اہم و اقدم ہونے کے باوجود دارالعلوم ندوہ کے ربرکت مقصد قیام کا بدل یا قائم مقام بہتر حال نہیں۔ نہ ایک فرض میں اہٹاک دوسرے فرض سے سبکدوش کر دیتا ہے۔